زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
اشفاق احمد
اعزاز احمد آذر

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا

اشفاق احمد

تحقیق و ترتیب

اعزاز احمد آذر

خالد بک ڈپو

40- اُردو بازار لاہور، فون 7229740-7223881

انتساب

بانو آپا کے نام

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

A

فہرست

صفحہ نمبر

B

تاریخ محفوظ کرنے کی کوشش

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تاریخ کسی شخص کے حوالے سے فیصلہ دینے میں دہائیاں اور بعض اوقات تو صدیاں بھی لگا دیتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اشفاق صاحب کے حوالے سے تاریخ (History) نے اپنا روائتی انداز یکسر فراموش کر دیا۔ ان کی زندگی میں غیر رسمی طور پر اور اب ان کی وفات کے بعد رسمی انداز میں تاریخ نے اپنا فیصلہ دینے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کی ہے۔

اشفاق احمد صاحب سے لوگوں ___ عوام الناس ___ کی محبت کے ان گنت حوالے ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی شخصیت، انداز واطوار، گفتگو کا طریقہ، اس گفتگو کے موضوعات اور پھر ان موضوعات کے بیان پر ان کی دسترس، ہر شخص، ہر سننے والے کے لیے بھی توجہ اور دلچسپی کا باعث ہوتی تھی۔ وہ بلاشبہ دلوں کو مسخر کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ سو انہوں نے سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں دلوں کو مسخر کیا اور ان میں اپنا گھر بسایا۔ وہ ایک ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔

اشفاق صاحب کے انتقال کی خبر یوں تھی گویا کسی نے پرسکون جھیل کی سطح پر ایک بھاری پتھر پھینک دیا ہو۔ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ایک بے سکونی سی پھیل گئی۔ ہر سننے والے نے اس خبر کو یوں سُنا جیسے خدانخواستہ یہ اس کے اپنے گھر کے کسی فرد کے بارے میں خبر ہو۔ ایک دل گرفتگی تھی کہ جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ سینکڑوں لوگ جو اشفاق صاحب کے آخری دیدار، ان کے سفر آخرت کے دوران کندھا دینے کی سعادت اور رسم قُل خوانی میں ایصال ثواب کے لیے ماڈل ٹاؤن (لاہور) پہنچے تھے ان میں سے ہر ایک چہرہ اس دکھ کو اپنا ذاتی دکھ بتا رہا تھا۔ ہر اشک بار آنکھ سے ٹپکتا قطرہ اشفاق صاحب کی محبتوں کے بحر بے کنار سے فیض یاب دکھائی دیتا تھا۔ مگر میری چشم تصور آج بھی ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کو غم سے نڈھال اور دکھ سے بوجھل دیکھ رہی ہے جو زندگی میں کبھی اشفاق صاحب سے نہیں ملے۔ جن میں سے اکثریت ان پڑھ،

ناخواندہ، جاہل، اور پسماندہ دیہاتیوں کی ہے جو محض ٹیلی ویژن کے ذریعے انہیں دیکھ کر یا ریڈیو پر ان کی آواز سن کر اشفاق صاحب سے بے پناہ محبت کرنے لگے تھے۔ اشفاق صاحب کے انتقال کی خبر ان لوگوں کے لیے ایک ایسے صدمے کا سبب ہے جسے وہ خود بھی کوئی نام نہیں دے سکتے۔

اشفاق صاحب کا انتقال علمی ،فکری ،تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک ایسے خلاء کا باعث ہوا ہے جو کسی طور پُر نہیں ہو سکتا۔ وہ خود ایک عہد تھے، وہ اپنے عہد کی پہچان بھی تھے اور اس کا مان بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہی تہذیبی زندگی کا ایک عہد ختم ہو گیا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ اشفاق صاحب کے انتقال کی خبر پر سکون، ٹھہرے پانی کی جھیل میں پتھر بن کر گری۔ بے چینی، بے اطمینانی، پریشانی اور دکھ کی ان گنت لہروں نے پُرسکون جھیل میں ہلچل مچا دی۔ جو، جس طرح اس دکھ کا اظہار کر سکتا تھا اس نے کیا۔ جس نے جو انداز چاہا، جو وسیلہ ہاتھ لگا اسے غنیمت جانا۔ پورا معاشرہ ایک ہیجانی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ پھر یوں بھی ہُوا کہ فوری صدمے کی کیفیت جوں جوں کم ہوتی گئی، آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کے خشک ہونے سے منظر جوں جوں واضح ہوتا گیا۔ لوگ اپنی محبتوں کے پھولوں کو احتیاط سے اکٹھا کر کے انہیں گوندھنے لگے۔ دلوں کے آنگن میں جھاڑو دے کر کونوں کھدروں میں پڑی چاہتوں کی، عقیدتوں کی ایک ایک پتی اکٹھی کی، یادوں اور رفاقتوں اور سعادتوں کی کتاب میں رکھے سوکھے پھول بھی جمع کر لیے ....اور پھر جس کو .... جو اخبار، جو رسالہ، جو وسیلہ ملا اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے اسے غنیمت جانا۔ یہ زیرِنظر کتاب اشفاق احمد صاحب کے انتقال کے بعد 8 ستمبر 2004ء سے 30 ستمبر 2004ء تک منظرِ عام پر آنے والی محبتوں اور عقیدتوں کا اظہار ہے۔

زیرِنظر کتاب مرتب کرتے ہوئے میرے ذہن میں دو پہلو بہت نمایاں رہے اور یہی دو پہلو دراصل اس کتاب کی تشکیل کا محرک بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اشفاق صاحب کے حوالے سے

تاریخ نے جو فیصلہ سنایا۔ اس کی شہادت محفوظ کر لی جائے۔ دوسرا یہ کہ آنے والے زمانوں میں اگر کوئی محقق، ادب وثقافت کا کوئی طالب علم ہمارے آج کے عہد یا اشفاق صاحب کے حوالے سے ریسرچ کرنا چاہے تو اسے واقعاتی سچائیوں کے ساتھ معلومات میسر آ سکیں کہ 7 ستمبر 2004ء کو انتقال کرنے والی اس شخصیت کے حوالے سے اخبارات نے کس کس انداز سے اس خبر کو نمایاں جگہ دی اور اشفاق صاحب کے شخصی، فنی، فکری، خاندانی اور علمی، سماجی مقام ومرتبہ کو کتنے زاویوں سے بھرپور کوریج دی گئی۔ میرے نزدیک یہ معدودے چند، بہت منفرد اور بہت نویکلے واقعات میں سے ایک ہے کہ کسی شخص کی موت پر پورا معاشرہ اور معاشرے کے تمام تر اجزائے ترکیبی اور اس پر اثر انداز ہونے یا اس سے اثر پذیر ہونے والے بھی عوامل ایک ایسا ردعمل ظاہر کریں جو نسل در نسل انسانوں کے لیے قابل رشک اور تاریخ کے اوراق کے لیے وجہ افتخار ہو۔ یہ کتاب کل کے مورخ کو ستمبر 2004ء کے آئینہ میں واقعات کی ایک مستند جھلک دکھا سکے۔ یہ ایک کیمرہ عکس ہے کسی مصور کے موقلم کا شاہکار نہیں ہے۔ محض تاریخ محفوظ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جس میں معاونت کے لیے میں جناب خالد پرویز اور ان کے رفقاء کا شکر گزار ہوں۔

اعزاز احمد آذر

(30 ستمبر 2004ء)

اشفاق احمد کی زندگی ۔ ایک نظر میں

(مرتب: رؤف ظفر)

تاریخ پیدائش ــــ 22 اگست 1925ء ۔ تاریخ وفات ــــ 7 ستمبر 2004ء

تعلیمی کارکردگی:

☆ ...... گورنمنٹ کالج لاہور سے (ایم اے اردو)

☆ ...... روم یونیورسٹی سے اطالوی زبان میں ڈپلومہ

☆ ...... گرینوبل یونیورسٹی فرانس سے فرنچ میں ڈپلومہ

☆ ...... نیویارک یونیورسٹی (امریکہ) سے براڈ کاسٹنگ میں خصوصی تربیت

☆ ...... بریڈلوف رائٹرز ورکشاپ ورمانٹ (امریکہ) میں شرکت

مختلف عہدے:

☆ ...... دیال سنگھ کالج لاہور میں لیکچرار (دو سال کے لئے)

☆ ...... روم یونیورسٹی (اٹلی) میں اردو میں لیکچرار (دو سال کے لئے)

☆ ...... پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پنجابی میں لیکچرار (ایک سال کے لئے)

☆ ...... ایڈیٹر/ پبلشر ماہنامہ ''داستان گو'' لاہور (تین سال کے لئے)

☆ ...... ایڈیٹر ہفت روزہ ''لیل و نہار'' لاہور (دو سال کے لئے)

☆ ...... ڈائریکٹر آر سی ڈی ریجنل کلچرل انسٹیٹیوٹ پاکستان برانچ (4 سال)

☆ ...... ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ لاہور (25 سال)

مختلف اداروں کی رکنیت:

☆ ...... سابق ممبر انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز (اسلام آباد یونیورسٹی)

☆ ...... سابق ممبر کمیٹی آف کورسز ان پاکستانی کلچر (ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور)

☆ ...... سابق رکن انجمن ترقی اردو بورڈ کراچی

☆ ...... سابق رکن پاک ایڈوائزری کمیٹی برکلے اردو پروگرام برکلے یونیورسٹی (امریکہ)

☆ ...... سابق ممبر نیشنل کونسل آف آرٹس اسلام آباد

☆ ...... اعزازی چیف ایڈیٹر ماہنامہ "سکھی گھر" لاہور (8 سال)

ایوارڈز:

...... اردو میں حسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ 1979ء

...... گریجوایٹ ایوارڈ (چار مرتبہ)

...... پی ٹی وی ایوارڈ (دو مرتبہ)

...... مجید الملک ایوارڈ

...... فروغ ادب کا عالمی ایوارڈ (قطر) 1997ء

کتابیات:

...... افسانے ...... اگ محبت سو افسانے

...... اُجلے پھول ...... سفرینا

...... چاکاری

رپورتاژ: ...... سفر در سفر

ناول: ...... مہمان بہار

شاعری: ...... خطائے وطائے

ترجمہ: ...... وداع جنگ ارنسٹ ہینگوے کا ناول

(A Farewell to Arms)

ٹیلی ویژن ڈرامے:

......	ایک محبت سو افسانے	(ٹی وی سیریل)
......	اور ڈرامے	(ٹی وی سیریل)
......	طوطا کہانی	(ٹی وی سیریل)
......	منچلے کا سودا	(ٹی وی سیریل)
......	ننگے پاؤں	(لانگ پلے)
......	اچے برج لاہور دے	(ٹی وی سیریل)
......	قلعہ کہانی	(ٹی وی سیریل)
......	حیرت کدہ	(ٹی وی سیریل)
......	ٹاہلی تھلے	

ریڈیو پروگرام:

...... 48 مکمل ریڈیو ڈرامے اور 329 فیچرز اور منی پلے

...... تلقین شاہ کے رائٹر' پروڈیوسر اور مرکزی کردار: یہ ہفتہ وار پروگرام گزشتہ 39 سال سے ریڈیو پاکستان کے تمام بڑے سٹیشنوں سے براڈ کاسٹ ہو رہا ہے۔

جن ممالک کا دورہ کیا:

امریکہ' برطانیہ' فرانس' سپین' اٹلی' جرمنی' آسٹریا' بلجیم' ہالینڈ' لبنان' مصر' ایران' چین' ترکی' سعودی عرب' کینیڈا' ناروے' ڈنمارک اور قطر

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

تلقین شاہ کے خالق ممتاز ادیب اور دانشور اشفاق احمد انتقال کر گئے۔ لاہور میں سپرد خاک۔

1925ء کو فیروز پور کے گاؤں مکتسر میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو اطالوی اور فرانسیسی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔
دیال سنگھ کالج میں لیکچرار رہے، فلم بھی بنائی، رزارت تعلیم کے مشیر رہے جنازے میں گورنر پنجاب، میاں عامر، رفیق تارڑ سمیت مختلف دانشوروں، ادیبوں کی شرکت:

لاہور (خاتون رپورٹر + کلچرل رپورٹر + مانیٹرنگ ڈیسک) عالمی شہرت یافتہ ریڈیو پروگرام تلقین شاہ کے خالق معروف افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور ممتاز دانشور اشفاق احمد 6ماہ کی علالت کے بعد گزشتہ روز صبح 9 بجے 79 برس کی عمر میں انتقال کر گئے انہیں ماڈل ٹاؤن جی بلاک کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا ان کے جنازے میں گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول، ضلعی ناظم میاں عامر محمود، سابق صدر رفیق تارڑ، فاروق امجد میر، ادیبوں، شاعروں، سیاستدانوں اور صحافیوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ افسانہ گڈریا اور ریڈیو پر 24 سال تک چلنے والے پروگرام تلقین شاہ کے خالق اور اردو کے صاحب اسلوب طرز نثر نگار اشفاق احمد 1925ء میں ضلع فیروز پور کے گاؤں مکتسر میں پیدا ہوئے انہوں نے فیروز پور شہر سے بی اے کا امتحان پاس کیا تقسیم ہندوستان کے وقت 1947ء میں لاہور آ گئے اور مہاجرین کے کیمپ والٹن میں قیام کیا جہاں پر اطلاعات اور اعلانات کا شعبہ ان کے سپرد تھا۔ انہوں نے گورنمنٹ لاہور سے اردو میں ایم اے کیا بعد ازاں اٹلی کی روم یونیورسٹی اور گرے نوبلے یونیورسٹی فرانس سے اطالوی اور فرانسیسی زبان میں ڈپلومے کئے اور نیویارک یونیورسٹی سے براڈ کاسٹنگ کی خصوصی تربیت حاصل کی انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں دو سال تک اردو کے لیکچرر کے طور پر کام کیا اور بعد میں روم یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے وطن واپس آ کر انہوں نے ادبی مجلہ داستان گو جاری کیا۔ انہوں

نے دو سال ہفت روزہ لیل ونہار کی ادارت بھی کی وہ انیس سو ستر سٹھ میں مرکزی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے جو بعد میں اردو سائنس بورڈ میں تبدیل ہو گیا وہ انیس سونو اسی تک اس ادارے سے وابستہ رہے وہ صدر جنرل ضیاء الحق کی دور میں وفاقی وزارت تعلیم کے مشیر بھی مقرر کئے گئے۔ 1953ء میں ان کا افسانہ گڈریا ان کی شہرت کا باعث بنا انہوں نے اردو میں پنجابی الفاظ کا تخلیقی طور پر استعمال کیا اور ایک خوبصورت شگفتہ نثر ایجاد کی' ایک محبت سو افسانے اور اجلے پھول ان کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے ہیں بعد میں سفر در سفر (سفر نامہ) کھیل کہانی (ناول) ایک محبت سو ڈارے اور تو تا کہانی (ڈارے) ان کی نمایاں تصانیف ہیں۔ انیس سو پینسٹھ سے انہوں نے ریڈیو پاکستان پر ایک ہفتہ وار فیچر پروگرام تلقین شاہ کے نام سے کرنا شروع کیا جو اپنی مخصوص طرز مزاح اور ذو معنی گفتگو کے باعث مقبول عام ہوا۔ ساٹھ کی دہائی میں اشفاق احمد نے دھوپ اور سائے کے نام سے ایک نئی طرح کی فیچر فلم بنائی جس کے گیت مشہور شاعر منیر نیازی نے لکھے اور طفیل نیازی نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی ستر کی دہائی کے شروع میں اشفاق احمد نے معاشرتی رومانی موضوعات پر ایک محبت سو افسانے کے نام سے ایک ڈرامہ سیریز لکھی اور اسی کی دہائی میں ان کی سیریز تو تا کہانی اور من چلے کا سودا نشر ہوئی تو تا کہانی اور من چلے کا سودا میں وہ تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ کچھ عرصے سے وہ پاکستان ٹیلی ویژن پر" زاویہ" کے نام سے ایک پروگرام کرتے تھے جس میں وہ اپنے مخصوص انداز میں قصے اور کہانیاں سناتے تھے اشفاق احمد تقریباً ایک سال سے جگر کے کینسر میں مبتلا تھے اور 6 ماہ قبل ڈاکٹروں نے ان کے جگر کی رسولی کو نکالنے کے بجائے بائی پاس کر کے متبادل خون کا رستہ بنا دیا تھا انہوں نے اپنے پس ماندگان میں ایک بیوہ بانو قدسیہ اور تین بیٹے چھوڑے ہیں راجہ گدھ ناول کی خالق بانو قدسیہ اردو کی معروف ادیبہ ہیں۔

روزنامہ "دن" لاہور

8 ستمبر 2004ء

اور داستان ختم ہوگئی

کولون (مانیٹرنگ ڈیسک) دانشور اشفاق احمد نے ایک استاد ادیب اور اردو سائنس بورڈ کے سربراہ کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ گڈریا نامی اپنے ابتدائی افسانے سے انہیں بہت شہرت ملی بعد ازاں قصہ گوئی کہانی نویسی، ڈرامہ نگاری اور اپنے صوفیانہ خیالات کے باعث بھی وہ بہت مقبول ہوئے۔ وائس آف جرمنی کا کہنا ہے کہ داستان سرائے کے نام سے ماڈل ٹاؤن میں معروف گھر اشفاق احمد کا مسکن تھا جو ان کی باتوں کی خوشبو سے مہکار رہتا تھا اشفاق احمد کی رحلت سے لگتا ہے یوں ہے کہ سرائے تو اب بھی باقی ہے مگر شائد داستان ختم ہوگئی ہے۔

روزنامہ دن لاہور

8 ستمبر 2004ء

ایک نہ ایک دن تو ساتھ چھوٹنا ہی تھا اشفاق بہترین ہمسفر تھے، خدا کا شکر ہے کہ ان کے ساتھ 50 سال بسر کیے۔ بانو قدسیہ

لاہور (خاتون رپورٹر) معروف ادیب دانشور اشفاق احمد کی اہلیہ معروف ادیبہ بانو قدسیہ نے اپنے شوہر کی وفات پر کہا کہ ایک نہ ایک دن تو یہ ساتھ چھوٹنا ہی تھا پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ میں نے ان کے ساتھ 50 سال کی رفاقت بسر کی۔ وہ ایک بہترین ہمسفر تھے ان کی حوصلہ افزائی ان کے ساتھ اور ان کے دیئے ہوئے اعتماد نے مجھے ادیبہ بنایا۔ ایک نہ ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہے لیکن وہ اپنے علم اپنے لفظوں میں زندہ رہیں گے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

صدر، وزیراعظم، وزیراعلیٰ اور گورنر کی تعزیت، خدمات کو سراہا

قومی نقصان ہے۔ شجاعت

قوم کا عظیم سرمایہ تھے۔ پرویز الٰہی

ادبی افق کا مینار تھے۔ میاں عامر

وفات سے پیدا ہونے والا خلا کبھی پورا نہیں ہوگا۔ پگاڑا

انکی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ امیر حسین اور عبدالعلیم کا

تعزیتی پیغام

مرحوم اتنے بڑے انسان تھے کہ ہمارے لئے کچھ کہنا بہت

مشکل ہے۔ عطاء الحق قاسمی، منیر نیازی اور دیگر کی تعزیت:

لاہور (خاتون رپورٹر + مانیٹرنگ ڈیسک + خصوصی خبر نگار) صدر جنرل پرویز مشرف وزیراعظم شوکت عزیز، وزیراعلیٰ پرویز الٰہی گورنر پنجاب خالد مقبول، ضلعی ناظم لاہور میاں عامر محمود، سپیکر قومی اسمبلی، صوبائی وزیر عبدالعلیم خان اور مختلف شخصیات نے اشفاق احمد کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور سابق وزیراعظم چودھری شجاعت حسین نے ممتاز ادیب اور دانشور اشفاق احمد کے انتقال کو ناقابل تلافی قومی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ملک ایک عظیم صوفی دانشور سے محروم ہو گیا ہے۔ مرحوم کی بیوہ بانو قدسیہ کے نام ایک تعزیتی پیغام میں چودھری شجاعت حسین نے کہا کہ اشفاق احمد انسان دوستی، سادگی اور محبت وشفقت کی علامت تھے۔ وزیراعلیٰ چودھری پرویز الٰہی نے کہا کہ ان کی نگارشات نے میری ذاتی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ پوری قوم کیلئے عظیم سرمایہ تھے۔ گورنر پنجاب خالد مقبول نے کہا کہ اشفاق احمد پاکستان کا اصلی اثاثہ تھے انہوں نے علم وادب کی دنیا میں ایک بڑا خلاء پیدا کر دیا ہے۔ علمی وادبی شخصیات شاعر منیر نیازی، ندیم قاسمی، عطاالحق قاسمی، اظہر جاوید اعزاز

آ ذر اختر شمار ڈاکٹر تحسین فراقی خواتین ادبا سیما پیروز بشریٰ اعجاز شہناز مزمل سلمٰی اعوان اور دیگر ادیبوں نے کہا کہ وہ اتنے بڑے انسان تھے کہ ان کیلئے کچھ کہنا ہمارے بس کی بات نہیں وہ ایک صوفی ادیب تھے۔ ضلع ناظم لاہور میاں عامر محمود نے کہا ہے کہ مرحوم اشفاق احمد ادب کی دنیا کے ''لیجنڈ'' تھے وہ ادبی افق کا وہ مینارہ نور تھے جس سے علم کے متلاشیوں نے اپنے اذہان کو منور کیا۔ ان کے خیالات اور تحریریں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سپیکر قومی اسمبلی چودھری امیر حسین نے مرحوم کی اہلیہ بانو قدسیہ کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ اشفاق احمد نے ملک میں ادب کے فروغ کیلئے نمایاں خدمات انجام دیں جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ان کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی جس سے نوجوان نسل سمیت ہر عمر کے افراد نے استفادہ کیا۔ پاکستان مسلم لیگ فنکشنل کے سربراہ اور حروں کے روحانی پیشوا پیر پگاڑا نے نامور دانشور اشفاق احمد کی وفات پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا صدیوں پر نہیں ہو سکے گا۔ پیر پگاڑا اور مرکزی سیکرٹری جنرل شیخ محمد انور سعید نے ممتاز دانشور محقق اور صوفی بزرگ اشفاق احمد کی وفات پر مشترکہ تعزیتی بیان میں کہا کہ اشفاق احمد کے وصال سے قوم ایک ممتاز دانشور محقق اور صوفی بزرگ کی رہنمائی سے محروم ہوگئی ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئر مین افتخار عارف ڈائریکٹر جنرل گلزار اور ریذیڈنٹ ڈائریکٹر قاضی جاوید نے کہا کہ اشفاق احمد وطن عزیز کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے تھے۔ انہوں نے اردو افسانے اور ڈرامے کو پاکستانی سماج کے ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تخلیقات میں ہماری اعلیٰ اخلاق اور سماجی اقدار کی نمائندگی کی۔ سینئر وفاقی وزیر اور وزیر دفاع راؤ سکندر اقبال نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور سوگوار خاندان کو یہ ناقابل تلافی نقصان برداشت کرنے کی توفیق فرمائے۔ چیئر مین سینٹ محمد میاں سومرو نے بھی معروف دانشور اشفاق احمد کی وفات پر تعزیت کی ہے۔ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین چودھری رحمت الٰہی محمد اسلم سلیمی حافظ محمد ادریس لیاقت بلوچ نے ممتاز ادیب دانشور اور مصنف اشفاق احمد کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ اشفاق احمد اسلامی نظریات

کے حامی اور محب وطن پاکستانی تھے ان کی تحریر شگفتہ اور تعمیری انداز رکھتی ہے۔ تحریک منہاج القرآن کے سرپرست اور رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر محمد طاہر القادری' ناظم اعلیٰ ڈاکٹر رحیق عباسی 'دریاب یوسف ہاشمی' جی ایم ملک اور محسن کھوکھر نے اشفاق احمد کے انتقال کو قومی سانحہ قرار دیا ہے منہاج القرآن کے رہنماؤں نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ اشفاق احمد کے انتقال سے پاکستان اور عالم اسلام صوفی بزرگ دانشور سے محروم ہو گیا ہے۔ معروف ڈرامہ نگار اور شاعر امجد اسلام امجد نے کہا کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن سے پورا معاشرہ پہنچا تا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق احمد اس قبیل کے آدمی تھے بلکہ شائدان چند لوگوں میں سے ایک تھے جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

"میں اب تندرست ہوں تم چلے جاؤ"

اشفاق احمد نے اپنے بڑے بیٹے کو وفات سے
12 گھنٹے قبل امریکا رخصت کیا

لاہور (اے بی تبسم سے) معروف ادیب ڈرامہ نویس اور صوفی دانشو اشفاق احمد نے اپنے بڑے بیٹے انیق احمد کو اپنی وفات سے صرف 12 گھنٹے قبل خود یہ کہہ کر واپس امریکا بجھوادیا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ اشفاق احمد کے بڑے بیٹے انیق امریکا میں کاروبار کے سلسلے میں مقیم ہیں اور والد کی خرابی صحت کی خبر سن کر پاکستان آئے ہوئے تھے اور گزشتہ کئی دنوں سے یہاں لاہور میں ہی مقیم تھے۔ مرحوم اشفاق احمد نے اپنے بیٹے کو کہا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں لہذا تم واپس چلے جاؤ اس تسلی کے بعد انیق 6 ستمبر کی رات امریکا کیلئے روانہ ہوئے اگلے ہی روز صبح 9 بجے اشفاق احمد کا انتقال ہو گیا اور ان کی انتقال کی خبر بھی بیٹے کو سفر میں ہونے کی وجہ سے نہ مل سکی اشفاق احمد کے دوسرے دونوں بیٹے انیس اور ایثر لاہور میں ہی مقیم ہیں لہذا وہ انتقال کے وقت وہاں موجود تھے۔

روزنامہ "دن" لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کے انتقال پر شوبز سے وابستہ شخصیات کا گہرے دکھ کا اظہار

مرحوم فن ادب کا ستارہ تھے۔ سید نور
ان کے پروگرام سن کر لوگوں کو خوش کرنا سیکھا۔امان اللہ
وفات سے لگ رہا ہے جیسے میں یتیم ہو گیا۔ببو برال
ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ ابرار الحق

لاہور (شوبز رپورٹر) اشفاق احمد کے انتقال پر شوبز سے وابستہ شخصیات نے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ان کی موت کو فن و ادب کا عظیم نقصان قرار دیا ہے اس سلسلے میں گزشتہ روز ان کی رہائش گاہ 121/C ماڈل ٹاؤن میں شوبز سے وابستہ شخصیات نے ان کے جنازے میں کثیر تعداد میں شراکت کی ریڈیو لاہور کے اسٹیشن ڈائریکٹر خالد اصغر نے اس سلسلے میں کہا کہ اشفاق احمد نے پاکستان ریڈیو پر جو تاریخ رقم کی ہے اسے کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا ریڈیو پر ان کا تخلیق کردہ کردار ''تلقین شاہ'' آج بھی سامعین کے دلوں میں بسا ہوا ہے اور جب تک ریڈیو کا وجود ہے یہ کردار ہمیشہ قائم رہے گا۔ ٹی وی پروڈیوسر حفیظ طاہر نے کہا ہے کہ ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا کبھی پر نہیں ہوگا۔ ہدایتکار سید نور نے کہا کہ اشفاق احمد فن و ادب کا ایک ستارہ تھے جس کی روشنی ہمیشہ دنیا میں پھیلی رہے گی۔ سٹیج اداکار امان اللہ نے کہا کہ اشفاق احمد نے ادب اور فن دونوں کیلئے خدمات انجام دی ہیں اور میں نے ریڈیو پر ان کا کردار تلقین شاہ سن کر لوگوں کو خوش کرنا سیکھا۔ مستانہ نے کہا کہ وہ فن سے اور فنکاروں سے پیار کرنے والے انسان تھے ان کی موت کا سن کر دلی صدمہ پہنچا ہے۔ ببو برال نے کہا کہ گو کہ میرا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر اشفاق احمد فن ادب کا بہترین نمونہ تھے۔ انہیں دیکھ کر ان کا احترام کرنے کو جی چاہتا تھا وہ ہر اوہ فنکاروں سے بہت پیار کرتے تھے ان کی وفات کا سن کر لگا جیسے میں یتیم ہو گیا ہوں۔ سہارا فار لائف ٹرسٹ کے چیئرمین ابرار الحق نے کہا اشفاق احمد کی کمی آنے والے دنوں میں محسوس کی جاتی رہے گی۔ ابرار الحق نے کہا کہ ڈاکٹر اشفاق احمد کی سہارا کے نیک خیالات اور غریب عوام کے ساتھ محبت کی وجہ سے ہی انہوں میرا ساتھ دیا اور ہر موقع پر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

صوفی دانشور معروف ڈرامہ وافسانہ نگار اشفاق احمد انتقال کر گئے

عمر 79 برس تھی' کینسر میں مبتلا تھے' طبیعت بگڑنے پر ہسپتال لے جایا گیا۔

جہاں خالق حقیقی سے جا ملے' ماڈل ٹاؤن قبرستان میں سپرد خاک۔

جنازہ میں گورنر خالد' رفیق تارڑ' ایس ایم ظفر' منیر نیازی سمیت اہم شخصیات کی شرکت۔ پسماندگان میں بیوہ بانو قدسیہ کے علاوہ تین بیٹے ہیں۔

1925ء میں فیروز پور انڈیا میں پیدا ہوئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کی ایم اے اردو کیا۔

بی بی سی اور وی او اے سے بھی منسلک رہے۔

ادبی خدمات پر ستارہ امتیاز ملا' "تلقین شاہ" 42 برس ریڈیو پاکستان پر چلا' پی ٹی وی کیلئے ایک محبت سو افسانے اور توتا کہانی سمیت کئی ڈرامے لکھے۔

لاہور (جنرل رپورٹر) نامور ادبی شخصیت' ڈرامہ وافسانہ نگار' صوفی دانشور اشفاق احمد گزشتہ روز طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے' انکی عمر 79 برس تھی' انہیں' کینسر تھا' منگل کی صبح حالت بگڑنے پر انہیں فوری طور پر ہسپتال لیجایا گیا لیکن وہ وہاں خالق حقیقی سے جا ملے' انہیں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ میں گورنر پنجاب خالد مقبول' سابق صدر رفیق تارڑ' پیپلز پارٹی کے رہنما مصباح الرحمٰن' سینیٹر ایس ایم ظفر' شعراء منیر نیازی' شہزاد' مستنصر حسین' تارڑ' فراز منو بھائی' انیس ناگی' خواجہ زکریا' ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنز شعیب بن عزیز' انتظار حسین اداکار فردوس جمال کے علاوہ تمام شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ مرحوم معروف خاتون ڈرامہ نگار بانو قدسیہ کے شوہر' گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر خالد آفتاب کے ماموں اور لاہور سٹاک ایکسچینج کے سابق چیئرمین گروپ کیپٹن (ر) نعیم اے خان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ پسماندگان میں بیوہ بانو قدسیہ کے علاوہ تین

بیٹے انیق انیس اور اثیر سوگوار چھوڑے ہیں۔ ان کی رسم قل کل شام پانچ بجے فٹ بال گراونڈ ڈی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور میں ادا کی جائے گی۔ مرحوم اردو سائنس بورڈ کے سربراہ بھی رہے۔ اشفاق احمد 1925ء میں فیروز پور انڈیا کے قصبہ مکسر میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کی اور بعدازاں ایم اے اردو کیا اس کے بعد وہ اٹلی چلے گئے جہاں سے انہوں نے اطالوی لٹریچر میں تعلیم حاصل کی اور اٹلی کی یونیورسٹی میں چار سال سے زائد عرصہ تک درس وتدریس میں مصروف رہے اس کے علاوہ وائس آف امریکہ اور بی بی سی سے بھی منسلک رہے ان کا پروگرام ''تلقین شاہ'' 42 سال تک ریڈیو پاکستان سے عوام کی توجہ کا مرکز بنا رہا جہاں سے انہیں ملک گیر شہرت ملی ۔ پی ٹی وی پر ان کا پروگرام ''زاویہ'' بھی ناظرین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اشفاق احمد آزاد کشمیر ریڈیو پر ''ڈھول کا پول'' پروگرام پیش کرتے رہے ان کے ٹی وی ڈراموں اور افسانوں میں توتا کہانی' ایک محبت سو افسانے' منچلے کا سودا' رنگ روپ' گڈریا کو بین الاقوامی شہرت ملی ۔مرحوم نے پنجابی کتب ''وِنیا کھنیا'' ٹالی تھلے بھی لکھیں ۔اشفاق احمد کو ان کے خاندان کے افراد ''شخو'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ انکے شاگردوں کی بڑی تعداد اس وقت کلیدی عہدوں پر فائز ہے' اشفاق احمد کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ستارہ امتیاز بھی دیا گیا تھا۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اک چراغ اور بجھا

اشفاق احمد انتقال کر گئے۔ بیٹے کو جانے کی اجازت دی چند گھنٹوں کے بعد سانسیں ساتھ چھوڑ گئیں:

کافی عرصے سے پتے کے کینسر کا عارضہ لاحق تھا ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں دم توڑا' عمر 79 برس تھی' پسماندہ گان میں بیوہ 3 بیٹے شامل ہیں۔ سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں ماڈل ٹاؤن میں سپرد خاک۔ قرآن خوانی کل سہ پہر 5 بجے۔ جنازہ میں گورنر' سابق صدر سمیت اہم شخصیات شریک ہوئیں۔

لاہور (شوبز رپورٹر' ادبی رپورٹر) معروف دانشور' ادیب' ڈرامہ نگار اشفاق احمد منگل کی صبح انتقال کر گئے۔ وہ کافی عرصے سے پتے کے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر 79 برس تھی۔ ان کے پسماندہ گان میں بیوہ ان کی ادبی زندگی کی ساتھی بانو قدسیہ اور 3 بیٹے شامل ہیں۔

روزنامہ خبریں لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کی اہلیہ بانو قدسیہ بھی مشہور ناول وافسانہ نگار ہیں۔

ناول ''راجہ گدھ'' کا کئی زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا۔

لاہور (ادبی رپورٹر) اشفاق احمد خان کی اہلیہ بانو آپا بھی ملک کی مشہور افسانہ نگار' ناول اور ڈرامہ نگار ہیں۔ 1950ء کے عشرہ کے آخر میں دونوں میاں بیوی نے مل کر ایک خوبصورت ادبی رسالہ داستان گو نکالا' اس میں بانو آپا میر شکاری کے طور پر شکاریات کے بارے میں بہت دلچسپ مضامین لکھا کرتی تھیں۔ بانو آپا کا ایک ناول'' راجہ گدھ'' بہت مشہور ہوا اس کے دوسری زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے عظیم شوہر کی تیمارداری کیلئے دن رات خود کو وقف کر دیا تھا۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد پنجابی کے اچھے شاعر بھی تھے۔

کلام نصاب میں شامل ہے: ڈاکٹر شہباز۔

پنجاب یونیورسٹی شعبہ پنجابی کے پہلے استاد تھے

ڈرامے "ٹاہلی دے تھلے" سی ایس ایس نصاب کا حصہ ہیں۔

نظریہ پاکستان کے بہترین داستان گو تھے۔ ایس ایم ظفر

ڈرامہ نگاروں کے استاد تھے۔ مستنصر حسین تارڑ

عظیم کمپیئر تھے۔ طارق عزیز

ہمیں لکھنا سکھایا۔ امجد اسلام

افسانہ نگاری میں کمال پیدا کیا۔ خواجہ محمد زکریا:

لاہور (ادبی رپورٹر شوبز) اشفاق احمد خان مرحوم کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں تاثرات بیان کرتے ہوئے معروف دانشور ایس ایم ظفر نے کہا کہ مرحوم پاکستان اور نظریہ پاکستان کے بہترین داستان گو تھے۔ انہوں نے نظریہ پاکستان کو داستان گوئی کے ذریعے جس طرح اجاگر کیا اسے اب کوئی بیان نہیں کر سکے گا۔ مستنصر حسین تارڑ نے کہا کہ اس زمانے کا سب سے بڑا داستان گو چلا گیا ہے وہ عصر حاضر کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار تھے وہ ہم ڈرامہ نگاروں کے استاد تھے، میں نے ان سے ڈرامہ نگاری سیکھی۔ امجد اسلام امجد نے کہا کہ اشفاق احمد جیسی ہمہ جہت شخصیت اور فن کو ایک دو سطروں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، وہ ہم تمام ڈرامہ نگاروں کیلئے رول ماڈل تھے۔ انہوں نے ہمیں لکھنا سکھایا۔ طارق عزیز نے کہا کہ اشفاق احمد عظیم کمپیئر تھے میں نے تقریباً 40 برسوں میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ اورنٹیل کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کہا ہے کہ اشفاق احمد کی بہت سی علمی وادبی جہتیں تھیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری میں کمال پیدا کیا اور افسانہ نگاروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ ممتاز شاعر شہزاد احمد نے کہا کہ ایک مثالی پاکستانی جس طرح کا اچھا ادیب اور شاعر ہو سکتا ہے

اشفاق احمد اس کی بہترین مثال تھے اورئیٹل کالج کے ہی ایک اور سابق پرنسپل ڈاکٹر سہیل احمد خان نے کہا کہ اشفاق احمد بیک وقت بہت اچھے افسانہ نگار، ناول نگار، سفرنامہ نگار اور ڈرامہ نگار تھے۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ڈرامہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا اظہر جاوید نے کہا کہ اشفاق احمد کے جانے کے ساتھ ایک بڑا عہد ختم ہو گیا ہے ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ اشفاق احمد ایک عہد ساز شخصیت تھے انہوں نے افسانہ نگاری بہت کی مگر اپنی بات کو ڈرامہ نگاری کے ذریعے بہت آگے بڑھایا۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پنجابی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر شہباز ملک نے کہا کہ اشفاق احمد پنجابی کے اچھے شاعر بھی تھے ان کا پنجابی شاعری کا مجموعہ ''کھٹیا وٹیا'' ایم اے کے نصاب میں شامل ہے جبکہ ان کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کئے جانے والے ''ٹاہلی دے تھلّے'' کے عنوان سے پیش کئے جانے والے ڈرامے سی ایس ایس کے امتحانی نصاب کا حصہ ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی شعبہ پنجابی کے پہلے استاد تھے۔ یہاں انہوں نے دو سال تک مکمل استاد کے طور پر پڑھایا جس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا میں ان کا شاگرد رہا ہوں۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

ذات فانی عمل باقی' اشفاق بھی ایک ذات تھے۔ کام باقی رہے گا'

بانو قدسیہ

وہ پانچ روز سے کسی سے بات بھی نہیں کر رہے تھے
لیکن پوتے پوتیوں کا ضرور پوچھتے تھے۔
آخری بار بیٹے انیق احمد کا پوچھا۔ پھر کوئی لفظ ادا نہ کیا۔
شدید بیماری میں کبھی واویلا نہ کیا۔

لاہور (روبی عارف' طارق حمید' فیصل درانی) ذات تو فانی ہے ہاں عمل باقی ہے اور وہ ذات برحق جو عمل کی توفیق بھی دیتی ہے اور خود ہی اسے قبول بھی کرتی ہے اشفاق احمد بھی ایک ذات کا نام تھا جو اب نہیں ہے ہاں ان کا کام باقی رہے گا۔ یہ باتیں غم واندوہ کے اس عالم میں بھی ہمت واستقلال کا پیکر بنی بیٹھی مرحوم اشفاق احمد کی اہلیہ بانو قدسیہ نے کیں' جنہیں اردو ادب میں ''بانو آپا'' کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ چھ بھائیوں اور دو بہنوں میں اشفاق احمد کا ساتواں نمبر تھا' دونوں بہنیں فرخندہ آپا اور فرحت آپا اشفاق احمد سے بڑی تھیں۔ بھائیوں میں آفتاب احمد خان' افتخار احمد خان' اقبال احمد خان' اسحاق احمد خان' اور اشتیاق احمد خان شامل تھے۔ اشتیاق احمد خان اشفاق احمد خان سے چھوٹے ہیں۔ ہمارے 3 بیٹے انیس احمد خان' انیق احمد خان' اور اثیر احمد خان ہیں' بانو قدسیہ نے بتایا کہ اشفاق احمد خان کے معدے کی سرجری ہوئی تھی اور وہ چار ماہ سے شدید بیمار تھے۔ پانچ چھ روز سے تو وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ہاں بچوں کا حال ضرور دریافت کرتے تھے اور سیاست پر بھی بات کر لیا کرتے تھے۔ ان کے 2 پوتے اور 5 پوتیاں ہیں جن سے انہیں بڑا لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ علالت میں بھی ان کا حال پوچھتے رہے۔ بانو قدسیہ نے بتایا کہ جب اشفاق احمد کے آخری لمحات تھے تو میں اور بیٹا اثیر احمد اشفاق احمد کے پاس تھے۔ آخری بات جو انہوں نے کی امریکہ میں مقیم بیٹے انیق کے بارے میں تھی کہ اس کا کیا حال ہے۔ بعد ازاں ان کے منہ سے اور کوئی لفظ ادا نہ ہو سکا۔ بانو قدسیہ نے بتایا

کہ بیماری کے دوران شدید کرب میں مبتلا ہونے کے باوجود اشفاق احمد نے کبھی شور واویلا نہیں کیا۔ یہ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی' ان میں صبر اور برداشت کا بہت مادہ تھا' یہ باتیں کرنے کے بعد بانو قدسیہ کا گلا خشک ہو گیا اور انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ باقی باتیں چند روز بعد کریں گی اس وقت وہ اس حالت میں نہیں کہ زیادہ باتوں کا جواب دے سکیں۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور
8 ستمبر 2004

’’خبریں‘‘ نے اشفاق احمد کے آپریشن کے دن پھول بھجوائے تو انہوں نے دعا کیلئے کہا۔

آخری دنوں میں مسلسل نیند کی دوائیں دی جاتی رہیں۔

لاہور (ادبی رپورٹر) اشفاق احمد طویل عرصہ سے علیل تھے۔ چند ماہ قبل ایک مقامی ہسپتال میں ان کا آپریشن ہوا تو انکشاف ہوا کہ انہیں لبلبے کا کینسر لاحق ہو چکا ہے۔ آپریشن کے روز روزنامہ خبریں کی طرف سے ہسپتال میں انہیں پھول پیش کیے گئے۔ انہوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری صحت کیلئے دعا کریں۔ پچھلے چند ہفتوں میں وہ بہت ضعیف اور لاغر ہو چکے تھے انہیں مسلسل دواؤں کے زیر اثر نیند کے عالم میں رکھا جاتا تھا۔

روزنامہ ’’خبریں‘‘ لاہور

8 ستمبر 2004ء

ریڈیو پروگرام تلقین شاہ سے شہرت حاصل کی۔
ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔

اشفاق احمد 22 اگست 1925ء کو مکسر فیروز پور بھارت میں پیدا ہوئے۔ والد ویٹرنری ڈاکٹر تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا، اٹلی اور فرانس میں پڑھے۔ امریکہ میں براڈ کاسٹنگ کی تربیت حاصل کی۔ مختلف ادبی مجلوں کی ادارت کی۔ اردو بورڈ کے ڈائریکٹر اور ضیاء دور میں وفاقی مشیر تعلیم بھی رہے۔

لاہور (ادبی رپورٹر) اشفاق احمد 22 اگست 1925ء کو مکسر فیروز پور بھارت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد خان تھا جو ایک ویٹرنری ڈاکٹر تھے۔ اشفاق احمد نے اپنی ابتدائی تعلیم مکسر سے ہی حاصل کی۔ 1947ء میں وہ پاکستان آ گئے 1950ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ اٹلی کی روم یونیورسٹی اور گرے نوبلے یونیورسٹی فرانس سے اطالوی اور فرانسیسی زبان میں ڈپلومے کئے اور نیویارک یونیورسٹی سے براڈ کاسٹنگ کی خصوصی تربیت حاصل کی۔ انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں دو سال تک اردو کے لیکچرار کے طور پر کام کیا اور بعد میں روم یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔ وہ اٹلی ریڈیو پر اردو پروگرام بھی کرتے رہے۔ وطن واپس آ کر انہوں نے ادبی مجلہ داستان گو جاری کیا جو اردو کے آفسٹ طباعت میں چھپنے والے ابتدائی رسالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے دو سال ہفت روزہ لیل ونہار کی ادارت کی۔ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اشفاق احمد پنجابی کے اچھے شاعر بھی تھے ان کا پنجابی شاعری کا مجموعہ ''کھیا وتیا'' ایم اے کے نصاب میں شامل ہے جبکہ ان کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ''ٹاہلی دے تھلے'' کے عنوان سے پیش کئے جانے والے ڈرامے سی ایس ایس کے امتحانی نصاب کا حصہ ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی شعبہ پنجابی کے پہلے استاد تھے۔ یہاں انہوں نے دو سال تک مکمل استاد کے طور پر پڑھایا جس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا میں ان کا شاگرد رہا ہوں۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد علم کا خزانہ تھے' بہو سویلا۔
دادا میرے سب سے اچھے دوست تھے۔ فاطمہ
بانو قدسیہ صدمہ کی باوجود تعزیت کرنے والوں سے
ہمت وحوصلہ کے ساتھ ملتی رہیں۔

لاہور (لیڈی رپورٹر) معروف ادیب اور دانشور اشفاق احمد کی بیوہ ادیبہ آپا بانو قدسیہ شوہر کی موت کے صدمہ سے نڈھال ہونے کے باوجود تعزیت کیلئے آنے والی خواتین کے ساتھ ہمت اور صبر کے ساتھ ملتیں رہیں۔ اس موقع پر نوائے وقت سے گفتگو کرتے ہوئے اشفاق احمد کی بہو سویلا انیس نے کہا کہ وہ سر نہیں باپ تھے۔ علم کا خزانہ تھے۔ ان سے زندگی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ چند ماہ قبل انکے آپریشن کے بعد پتہ چلا کہ انہیں معدے کا السر ہے۔ انہوں نے اپنی بیماری کا ہمت اور حوصلے کے ساتھ سامنا کیا اور آخری دم تک پر عزم رہے ان کی پوتی فاطمہ انیس نے کہا کہ ان کے دادا ان سے سلوک دوستوں کی طرح کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں کسی اور دوست کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اشفاق احمد کے تین بیٹے رفیق احمد انیق احمد اور ایثر احمد ہیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے انیق احمد والد کی وفات سے پانچ گھنٹے قبل امریکہ کیلئے روانہ ہوئے تھے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

نامور ادیب ڈرامہ نگار اشفاق احمد انتقال کر گئے۔
ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک۔

ریڈیو پاکستان سے ان کے پروگرام "تلقین شاہ" اور پی ٹی وی سے "ایک محبت سو افسانے" کی سیریز سمیت متعدد ڈراموں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

دیال سنگھ کالج' اور اورنیٹل کالج میں پڑھاتے رہے

لیل ونہار کے ایڈیٹر اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

جنازے میں گورنر رفیق تارڑ' احمد فراز' طارق حمید' اجمل نیازی و دیگر نے شرکت کی۔

انتقال ناقابل تلافی نقصان ہے شجاعت' نواز' شہباز شریف' قاضی' پگاڑو اور دیگر کا اظہار تعزیت

لاہور (ادبی رپورٹر + کلچرل رپورٹر) اردو کے عہد ساز افسانہ' ڈرامہ نگار' دانشور اور براڈ کاسٹر اشفاق احمد طویل علالت کے بعد منگل کی صبح انتقال کر گئے۔ وہ لبلبہ کے کینسر میں مبتلا تھے ان کی عمر 79 برس تھی۔ مرحوم اشفاق احمد کا جنازہ "داستان سرائے" ماڈل ٹاؤن سے اٹھایا گیا اور سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں مقامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں ادیبوں' شاعروں ریڈیو' ٹی وی سے متعلق ممتاز شخصیات اور مرحوم کے مداحوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اشفاق احمد 1925ء کو بھارت کے ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آزادی سے پہلے لاہور آ گئے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ بعد ازاں دیال سنگھ کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ اس وقت تک ان کے افسانے "ادبی دنیا" میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق میں افسانہ پڑھتے تو وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ انہوں نے روم یونیورسٹی (اٹلی) میں اردو زبان اور فرانسیسی زبانوں میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ براڈ کاسٹنگ کا ڈپلومہ کینیڈا سے لیا۔ وطن واپسی پر رسالہ "داستان گو" جاری کیا بعد میں "لیل ونہار" کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اورینٹل کالج لاہور میں پنجابی زبان کی تدریس کی۔ کئی سال اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت میں خدمات انجام دیں بورڈ کی موجودہ عمارت انہی کی کوششوں سے تعمیر ہوئی۔ ان کا ریڈیو پروگرام "تلقین شاہ" طویل عرصہ تک خواص و عوام میں

یکساں مقبول رہا۔ جنگ کشمیر کے دوران آزاد کشمیر ریڈیو سے ان کے پروگرام بہت دلچسپی سے سنے گئے 65ء کی جنگ میں بھی انہوں نے دفاع وطن کے حوالے سے ایک خصوصی ریڈیو پروگرام شروع کیا جس سے پاکستانی فوج کے جوانوں کو بڑی تقویت ملی۔ اشفاق احمد نے ٹی وی کیلئے ''لیکن'' اور ''ایک محبت سو افسانے'' کی سیریز کے علاوہ لاتعداد مقبول ڈرامے تخلیق کئے۔ ان کا افسانہ ''گڈریا'' اردو افسانہ نگاری میں کلاسیکی حیثیت رکھتا ہے ٹی وی ڈراموں میں یہی مقام و مرتبہ ''منچلے کا سودا'' کو حاصل ہوا۔ اشفاق احمد کو حکومت پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز جبکہ دوحہ کی عالمی تنظیم کی جانب سے فروغ اردو ادب ایوارڈ دیا گیا۔ اشفاق احمد کے افسانوں' ڈراموں اور سفرناموں پر مشتمل کتابوں میں سفر در سفر' گلدان' حسرت تعمیر' جنگ بجنگ' ڈراموں ایک ہی بولی' ایک محبت سو افسانے' من چلے کا سودا' شاہلا کوٹ' حیرت کدہ سفر مینا' طلسم ہوش افزا' دواج جنگ' گڈریا' اجلے پھول' ننگے پاؤں' بند گلی' کھیل تماشا' اچے برج لہور دے' بابا صاحبا' تلی تھلے توتا کہانی اور ڈارے مہمانسرائے' کھٹا وٹیا' زاویہ' دھینگا مشتی اور ذکر شہاب شامل ہیں۔

لاہور کلچرل رپورٹر / خبر نگار / لیڈی رپورٹر / خصوصی رپورٹر) معروف ادیب اور دانشور اشفاق احمد کو مقامی قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا ان کی نماز جنازہ میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم شخصیات نے شرکت کی جن میں گورنر پنجاب خالد مقبول' رفیق تارڑ' طارق حمید' احمد فراز' اے جی جوش' کنول فیروز' شہزاد احمد حمید اختر' فاروق امجد میر' طارق عزیز' جمیل ملک' ڈاکٹر اجمل نیازی' منور سعید' غیور اختر' شوکت زین العابدین' انتظار حسین' منو بھائی' جاوید شاہین' راجہ رسالو' قاضی اظہر جاوید' اعزاز احمد آذر' جمیل فخری' اسلام الدین شاہ' خواجہ زکریا' نیلما سرور' احمد عقیل روبی' ڈاکٹر خالد آفتاب' ڈاکٹر سلیم اختر' خالد اقبال یاسر' حمید اختر اور دیگر نے شرکت کی۔ اکادمی ادبیات کی طرف سے مرحوم کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ اشفاق احمد کی رسم قل 9 ستمبر بروز جمعرات شام پانچ بجے ان کی رہائش گاہ واقع 121 سی ماڈل ٹاؤن میں ادا کی جائے گی۔ دعا شام 6 بجے ہوگی۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور سابق وزیر اعظم چودھری شجاعت حسین نے اشفاق احمد کے انتقال کو ناقابل تلافی قومی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ملک ایک عظیم صوفی دانشور سے محروم ہو گیا ہے۔ سپیکر قومی اسمبلی چودھری امیر حسین نے اشفاق احمد کے انتقال پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے مرحوم کی اہلیہ کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ اشفاق احمد نے ملک میں ادب فروغ کیلئے نمایاں خدمات انجام دیں

جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ گورنر خالد مقبول نے اشفاق احمد کے انتقال پر گہرے رنج اور افسوس
کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کی اہلیہ محترمہ بانو قدسیہ اور دیگر اہلخانہ کے نام تعزیتی پیغام میں کہا کہ
اشفاق احمد کی وفات سے پاکستان ایک بلند مرتبہ علمی اور ادبی شخصیت سے محروم ہو گیا ہے۔ ضلع
ناظم لاہور عامر محمود نے کہا ہے کہ مرحوم ادب کی دنیا کے ''لیجنڈ'' تھے۔ وہ ادبی افق کا وہ مینار نور
تھے ان کے خیالات اور تحریریں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اے این این کے مطابق پاکستان
مسلم لیگ فنکشنل کے سربراہ پیر صاحب پگارو شیخ محمد انور سعید اور عزیز ظفر خان آزاد نے ممتاز
دانشور، محقق اور صوفی بزرگ اشفاق کی وفات پر مشترکہ تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ اشفاق احمد
کے وصال سے پوری قوم ایک ممتاز دانشور محقق اور صوفی بزرگ کی رہنمائی سے محروم ہو گئی ہے
پنجاب پبلک سروس کمیشن کی ڈاکٹر عارفہ سیدہ نے کہا کہ اشفاق کی طرح بامعنی شاداب اور خوشبودار
گفتگو کرنے والا دوسرا شخص اس ملک میں نہیں شہر کا کلام یتیم ہو گیا ہے اداکارہ ثمینہ احمد نے کہا کہ
ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ان کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا کوئی پر نہیں کر سکتا۔ گلوکارہ
ثریا خانم نے کہا کہ وہ جتنے خوبصورت انسان تھے باتیں اس سے زیادہ خوبصورت کرتے تھے۔
دانشور احمد بشیر کی صاحبزادی اسماء عباس نے کہا کہ والد کے بہتر دوست تھے ڈرامہ پروین عاطف
نے کہا کہ اشفاق احمد زوال اور انحطاط کا شکار قوم کیلئے روشنی کا مینار تھے ثمینہ آصف نے کہا ان کی
وطن سے محبت حب الوطنی ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر تھی وہ ملک کے موجودہ حالات پر دلبر
داشتہ تھے۔ اشفاق احمد کی وفات پر شوبز کے حلقوں نے بھی گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا ہے۔ پی
ٹی وی کے مینیجنگ ڈائریکٹر ارشد خان کنٹرولر پروگرامز سپیشل اسائنمنٹ طارق سعید شاہد محمود ندیم
کنٹرولر پبلک ریلیشنز علی اکبر عباس جی ایم لاہور مرکز اشرف عظیم پروگرام مینجر فرخ بشیر اور پی ٹی
وی کے تمام ملازمین نے اشفاق احمد کی وفات پر تعزیت کا اظہار کیا ہے اور ان کی موت کو نا قابل
تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈی جی طارق امام سٹیشن ڈائریکٹر لاہور خالد اصغر
اور ایف ایم 101 لاہور (ریڈیو پاکستان) کے ڈپٹی کنٹرولر گلزار عثمانی اور سٹاف نے معروف
ادیب ڈرامہ نگار اور دانشور اشفاق احمد کی وفات کو ادب کیلئے نا قابل تلافی نقصان قرار دیا ہے اور
گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے کشمیر سنٹر لاہور کے ڈائریکٹر مرزا محمد صادق اور ڈپٹی ڈائریکٹر مرزا عظمت
بیگ نے کہا کہ اشفاق احمد جیسے محب انسانیت اور محب پاکستان ادیب اور دانشور کا اٹھ جانا ایک
عظیم قومی نقصان ہے مووی آرٹسٹس ایسوسی ایشن کے چیئرمین یوسف خان نے کہا کہ اشفاق احمد
بہت بڑے آدمی تھے۔ اداکارہ ریما نے کہا کہ ان کی وفات پر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اداکار معمر رانا

نے کہا کہ اشفاق احمد بہت پیاری گفتگو کرتے تھے عیور اختر نے کہا ہے کہ انہوں نے بہت کچھ سیکھا ۔گلوکار ابرارالحق نے کہا کہ انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی گلوکارہ شاہدہ منی نے کہا کہ اشفاق احمد کی اس ملک کیلئے بہت خدمات ہیں۔اداکار فاروق ضمیر نے کہا کہ اشفاق احمد کی وفات ملک کیلئے تلافی نقصان ہے۔ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد' چودھری رحمت الٰہی' چودھری محمد اسلم' حافظ محمد ادریس' لیاقت بلوچ اور ڈپٹی سیکرٹری جنرل فرید احمد پراچہ نے ممتاز ادیب دانشور اور مصنف اشفاق احمد کی وفات پر گہرے رنج وافسوس کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور
8 ستمبر 2004ء

''اشفاق احمد عظیم ترین قلمکار تھے''
''اردو ادب کا سنہری دور ختم ہو گیا''
ان کی وفات قومی نقصان ہے' وہ پیارے دوست اور کھرے ساتھی تھے
منیر نیازی' سلیم اختر وزیر آغا' امجد اسلام امجد' وحید قریشی' انور سدید اور خواجہ زکریا کا ردعمل۔

لاہور (ادبی رپورٹر) اردو کے نامور ادیب اور دانشور اشفاق احمد کی وفات پر ملک بھر کے اہل قلم نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ منیر نیازی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم اشفاق احمد اردو کے بہت بڑے افسانہ نگار تھے وہ میرے بے حد عزیز دوست بھی تھے ان کا چلے جانا میرا ذاتی نقصان بھی ہے ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ یہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اشفاق احمد جیسے زندگی سے بھرپور شخص کو موت بھی آ سکتی ہے۔ انہوں نے افسانوی ادب میں اپنی اہمیت تسلیم کرائی وہ مجلسی انسان تھے اور بے حد خوش گفتار تھے انہوں نے ٹی وی ڈرامے کو معیار کی بلندی تک پہنچایا علالت کی خبریں تو کافی عرصہ سے سننے کو مل رہی تھیں لیکن اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ وہ یوں اچانک اپنے دوستوں اور مداحوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ان کے رخصت ہونے سے نہ صرف اردو افسانے کا ایک دور ختم ہو گیا بلکہ خرد افروزی کی اس تحریک کو بھی دھچکا لگا ہے جو ربع صدی سے جاری تھی اور جس کے فروغ میں وہ نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ امجد اسلام امجد نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس عہد کے عظیم ترین قلمکاروں میں سے تھے۔ ڈرامہ' افسانہ کے علاوہ انہوں نے جس صنف میں بھی لکھا وہ اس صنف کی خوبصورتی میں اضافے کا سبب بنا۔ ڈرامہ نگاری کے حوالے سے وہ میرے لئے رول ماڈل تھے ان کی صحبت مجھے ہمیشہ حاصل رہی ان کی وفات ہمارا قومی نقصان ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کے چلے جانے سے اردو ادب کا سنہری دور ختم ہو گیا ہے۔ وہ ایک پیارے دوست' ایک کھرے ساتھی اور ایک عظیم ادیب تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے کہا ''مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں'' ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا نے کہا کہ اشفاق احمد کثیر الجہات شخصیت تھے۔ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مسحور کن طرز گفتار کے حامل تھے۔ وہ عہد ساز شخصیت تھے اور ان کے خیالات و افکار نے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔

روزنامہ ''نوائے'' وقت لاہور

8 ستمبر 2004ء

آخری کتاب ''ڈھنڈورہ'' ہفتہ قبل شائع ہوئی

لاہور (ادبی رپورٹر) مرحوم اشفاق کی آخری کتاب ''ڈھنڈرا'' تھی
جو انتقال سے ایک ہفتہ قبل شائع ہوئی:

نصف صدی کا ساتھ
اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی جوڑی انتہائی منفرد تھی:

لاہور (ادبی رپورٹر) اردو میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی جوڑی انتہائی منفرد تھی۔
دونوں نے اپنی انفرادیت کا سکہ لوگوں کے دلوں اور ذہنوں پر بٹھایا۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ
گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اردو کے دوران ہم جماعت تھے۔ چند سال بعد رشتہ ازدواج
میں منسلک ہوئے اور تقریباً پچاس برس تک رفیق حیات رہے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی جوڑی اردو
دنیا میں احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اشفاق احمد کے انتقال سے یہ جوڑی ٹوٹ گئی ہے۔

ادبی مثلث کا آخری ستارہ بھی غروب ہو گیا:

لاہور (عمران نقوی) قدرت اللہ شہاب ممتاز مفتی اور اشفاق احمد قیام پاکستان کے
فوراً بعد اردو ادب کے افق پر شہاب ثاقب کی طرح طلوع ہوئے اور اہم ادبی مثلث کے تین ایسے
روشن ستارے بن گئے جن کے بغیر گذشتہ نصف صدی کے ادب کا منظر دھندلایا جاتا اس مثلث
نے روحانی واردات کو ادب میں معمول کی حیثیت دی اور ایسی دنیائے ادب تشکیل دی جو ترقی پسند
تحریک کے متوازی ایک نئی ادبی تحریک کے طور پر جانی پہچانی گئی ہے پہلے قدرت اللہ شہاب اور
پھر ممتاز مفتی کی انتقال سے اشفاق احمد مثلث کی واحد ستارے کی حیثیت سے جگمگا رہے تھے۔ اب
ان کے انتقال سے مثلث کا یہ تیسرا روشن ستارہ بھی غروب ہو گیا ہے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

8 ستمبر 2004ء

''اشفاق احمد کی وفات قومی نقصان ہے''
''پرویز الٰہی کا اظہار تعزیت''

لاہور (سپ ر) وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے نامور دانشور افسانہ نگار اور براڈ کاسٹر اشفاق احمد کی وفات کو قومی نقصان قرار دیا ہے انہوں نے کہا کہ اشفاق احمد جیسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ وہ پاکستان کا ایک ایسا قیمتی علمی اور ادبی اثاثہ تھے جس پر کوئی بھی معاشرہ فخر کر سکتا ہے چودھری پرویز الٰہی نے کہا کہ اشفاق احمد کی وفات سے مجھے دلی صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ان چند مصنفین میں سے تھے جن کی تحریروں نے مجھے ذاتی زندگی میں متاثر کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اشفاق احمد کی گفتگو اور نگارشات سے رہنمائی اور روشنی حاصل کیا کرتے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ بانو قدسیہ کو جو خود بھی اردو ادب کی بہت بڑی شخصیت ہیں۔ یہ صدمہ جرأت اور ہمت کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وزیر اعلیٰ نے مرحوم کے دیگر متعلقین کیلئے بھی صبر جمیل کی دعا کی

روزنامہ ''نوائے'' وقت لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد ادب کے لیجنڈ تھے

ہمیشہ برداشت کا درس دیتے رہے۔

قوم کا اثاثہ تھے انکی تحریروں سے استفادہ کیا جائے۔ صدر پرویز

شدید دلی صدمہ ہوا۔ چودھری پرویز الٰہی

بلند مرتبہ شخصیت سے محروم ہو گئے۔ خالد مقبول

تاریخ میں نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ چودھری شجاعت

ادبی افق کا مینارہ نور تھے۔ میاں عامر

قوم رہنما سے محروم ہو گئی۔ پیر پگاڑا کا اظہار تعزیت۔

لاہور (بزنس ایجنسیاں) اشفاق احمد کی وفات پر صدر مملکت پرویز مشرف نے گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے مرحوم کے خاندان کے نام اپنے تعزیتی پیغام صدر مملکت نے پاکستان اور ادب کیلئے مرحوم اشفاق احمد کی خدمات کا ذکر کیا انہوں نے کہا کہ ایسے لوگ قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں اور لوگ ان کی تحریروں اور تجربات سے استفادہ کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ ادبی دنیا ایک ممتاز شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی نے ناموردانشور افسانہ نگار اور براڈ کاسٹر اشفاق احمد خان کی وفات کو قومی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اشفاق احمد جیسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں وہ پاکستان کا ایک ایسا قیمتی علمی اور ادبی اثاثہ تھے جس پر کوئی بھی معاشرہ فخر کر سکتا ہے۔ اپنے تعزیتی پیغام میں چوہدری پرویز الٰہی نے کہا کہ اشفاق احمد کی وفات سے مجھے شدید دلی صدمہ پہنچا ہے۔ بانو قدسیہ اور دیگر اہل خانہ کے نام تعزیتی پیغام میں گورنر خالد مقبول نے کہا کہ اشفاق احمد کی وفات سے پاکستان ایک بلند مرتبہ علمی اور ادبی شخصیت سے محروم ہو گیا ہے جو انسان دوستی کے حوالے اپنے ہمعصروں میں منفرد مقام رکھتے تھے۔ سابق وزیر اعظم چوہدری شجاعت حسین نے کہا کہ اشفاق احمد انسان دوستی وسادگی اور محبت وشفقت کی علامت تھے ان کی تحریریں اور افکار اسلام کی حقیقی روح کی عکاس تھیں ان کی قومی اور ملی خدمات کو

کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ چوہدری شجاعت حسین نے کہا کہ اشفاق احمد نے تحمل برداشت اور انسان دوستی کا درس دیتے ہوئے صوفیائے کرام کے مشن کو جس طرح زندہ رکھا اس کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ ضلع ناظم لاہور عامر محمود نے کہا کہ مرحوم اشفاق احمد ادب کی دنیا کے "لیجنڈ" تھے انہوں نے ادبی افق کو منور کیا ان کے خیالات اور تحریریں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہیں وہ ایک درویش صفت انسان تھے زندگی کے بارے میں ان کا بڑا سیدھا سادا فلسفہ تھا۔ مسلم لیگ فنکشنل کے صدر پیر پگاڑا مرکزی سیکرٹری جنرل شیخ محمد انور سعید اور مرکزی جوائنٹ سیکرٹری عزیز ظفر خان آزاد نے مشترکہ تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ اشفاق احمد کے وصال سے پوری قوم ایک ممتاز دانشور محقق اور صوفی بزرگ کی راہنمائی سے محروم ہو گئی ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کے لواحقین کو صبر و جمیل عطا کرے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔

روزنامہ صحافت لاہور

8 ستمبر 2004ء

تلقین کرنیوالے شاہ جی دنیا چھوڑ گئے۔
ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک۔

اشفاق احمد 1925ء کو لاہور☆ میں پیدا ہوئے

گورنمنٹ کالج سے ایم اے کیا' روم اور گرے نوبل یونیورسٹی سے

فرانسیسی زبانوں میں ڈپلومے حاصل کیے۔

نیویارک یونیورسٹی سے براڈ کاسٹنگ کی تربیت حاصل کی۔

دیال سنگھ کالج اور روم یونیورسٹی میں لیکچرار ہے۔

وزات تعلیم کے مشیر اور اردو بورڈ کے ڈائریکٹر رہے۔

ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب قریبی دوستوں میں شامل تھے۔

ایک سال جگر کے عارضہ میں مبتلا رہے۔

پسماندگان میں بیوہ بانو قدسیہ اور 3 بیٹے چھوڑے۔

لاہور (نیوز ڈیسک + مانیٹر ڈیسک + ایجنسیاں) افسانہ گڈریا اور ریڈیو پروگرام تلقین شاہ کے خالق اردو کے صاحب طرز نثر نگار اشفاق احمد گزشتہ صبح لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر اناسی سال تھی اور وہ کچھ عرصہ سے علیل تھے۔ اشفاق احمد انیس سو پچیس میں لاہور☆ میں پیدا ہوئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ اٹلی کی روم یونیورسٹی اور گرے نوبلے یونیورسٹی فرانس سے اطالوی اور فرانسیسی زبان میں ڈپلومے کئے اور نیویارک یونیورسٹی سے براڈ کاسٹنگ کی خصوصی تربیت حاصل کی۔ انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں دو سال تک اردو کے لیکچرر کے طور پر کام کیا اور بعد میں روم یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔

وطن واپس آ کر انہوں نے ادبی مجلہ داستان کو جاری کیا جو اردو کے آفسٹ طباعت میں چھپنے والے ابتدائی رسالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے دو سال ہفت روزہ لیل ونہار کی

☆اخبار نے خبر کی سرخی اور متن میں لاہور ہی لکھا ہے

ادارت بھی کی ۔ وہ 1964ء میں مرکزی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے جو بعد میں اردو سائینس بورڈ میں تبدیل ہو گیا انیس سونواسی تک اس ادارے سے وابستہ رہے وہ صدر جنرل ضیاء الحق کے دور میں وفاقی وزارت تعلیم کے مشیر بھی مقرر کئے گئے اشفاق احمد ان نامور ادیبوں میں شامل ہیں جو قیام پاکستان کے فوراً بعد ادبی افق پر نمایاں ہوئے اور 1993ء میں ان کا افسانہ ''گڈریا'' ان کی شہرت کا باعث بنا انہوں نے اردو میں پنجابی الفاظ کا تخلیقی طور پر استعمال کیا اور ایک خوبصورت شگفتہ نثر ایجاد کی جو ان ہی کا وصف سمجھی جاتی ہے ایک محبت سو افسانے اور اجلے پھول ان کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے ہیں بعد میں سفر در سفر (سفر نامہ)، کھیل کہانی (ناول)، ایک محبت سو افسانے (ڈرامے) اور توتا کہانی (ڈرامے) ان کی نمایاں تصانیف ہیں۔ انیس سو پینسٹھ سے انہوں نے ریڈیو پاکستان لاہور پر ایک ہفتہ وار فیچر پروگرام تلقین شاہ کے نام سے کرنا شروع کیا جو اپنی مخصوص طرز، مزاح، اور ذومعنی گفتگو کے باعث مقبول عام ہوا اور تیس سال سے زیادہ چلتا رہا۔ ساٹھ کی دہائی میں اشفاق احمد نے دھوپ اور سائے کے نام سے ایک نئی طرح کی فیچر فلم بنائی۔ اشفاق احمد تقریباً ایک سال جگر کے عارضہ میں مبتلا تھے اور ڈاکٹروں نے ان کے جگر کی رسولی کو نکالنے کے بجائے بائی پاس کر کے خون کا متبادل راستہ بنا دیا تھا۔ اردو کے دو نامور ادیب ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب اشفاق احمد کے خاص دوستوں میں شامل تھے انہوں نے اپنے پس ماندگان میں ایک بیوہ بانو قدسیہ اور تین بیٹے چھوڑے ہیں۔ شاہ جی کی نماز جنازہ گذشتہ روز ہی بعد از نماز عصر ادا کی گئی جس میں سیاسی وسماجی شخصیات اور ہزاروں افراد نے شرکت کی ۔ ان کو مقامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ رسم قل آج ان کی رہائش گاہ C-70 ماڈل ٹاؤن پر بعد از نماز عصر ادا کی جائے گی۔

روزنامہ ''صحافت'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

☆ اخبار نے یہی لکھا ہے

اشفاق اپنی ذات میں یونیورسٹی تھے۔

اچھا وقت گزرا۔ بانو قدسیہ

علم کا خزانہ تھے۔ امجد اسلام

ادب میں خلا پیدا ہو گیا۔ طارق عزیز

بڑے داستان گو تھے۔ مستنصر تارڑ

نوجوانوں کو بہت کچھ سکھایا۔ فردوس جمال

خلا پر نہیں ہو سکتا۔ ارشد اشرف عظیم' فرخ بشیر' حیات سیف۔

لاہور (شوبز رپورٹر) معروف دانشور اور ادیب اشفاق احمد کی اہلیہ بانو قدسیہ نے کہا کہ وہ ذات میں ایک پوری یونیورسٹی تھے۔ ان کی رفاقت میں بہت اچھا وقت گزرا وہ ایک عظیم انسان تھے مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ معروف شاعر اور مصنف امجد اسلام امجد نے تعزیتی پیغام میں کہا کہ وہ اپنی ہستی میں علم کا خزانہ تھے وہ ہمیشہ روحانیت کا سبق دیتے رہے تھے لیکن ہم لوگوں نے اسے کبھی سنجیدہ لیا ہی نہیں اب ان کے جانے کے بعد احساس ہو رہا ہے۔ کمپیئر طارق عزیز نے کہا کہ لاہور کی ادبی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے کہ جو کبھی بھی پورا نہیں ہوگا۔ مستنصر حسین تارڑ نے کہا کہ اشفاق احمد اردو کے سب سے بڑے داستان گو تھے اور ٹی وی ڈراموں کے سب سے بڑے رائٹر تھے۔ اداکار فردوس جمال نے کہا کہ اشفاق احمد کی وفات سے ہم ایک اچھے ڈرامہ نگار و دانشور اور ادیب سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے عزیزوں میں ہمیشہ معاشرے کے ان پہلوؤں پر تذکرہ کرتے جو پس پردہ تھے خاص طور پر نوجوان نسل کیلئے ہمیشہ نرم گوشہ رکھتے اور ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے مینجنگ ڈائریکٹر ارشد خان' جنرل منیجر محمد اشرف عظیم پروگرام منیجر فرخ بشیر اور پی آر او حیات سیف نے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ مرحوم کا خلا صدیوں تک پر نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے معاشرے کے مختلف پہلوؤں میں روشنی ڈالی۔

روزنامہ ''صحافت'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

مشرقی دانش کا آفتاب غروب ہو گیا۔

اشفاق احمد چل بسے۔

Acc 10,508

ماڈل ٹاؤن قبرستان میں سپردخاک۔

نماز جنازہ میں دانشوروں' صحافیوں' اداکاروں اور حکومتی شخصیات سمیت سینکڑوں افراد کی شرکت۔

رسم قل' کل ان کی رہائش گاہ پر ادا کی جائے گی۔

اشفاق احمد دو ماہ سے علیل تھے' منگل کی صبح 9 بجے طبیعت خراب ہونے پر ہسپتال لے جایا گیا مگر راستے میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مرحوم کی عمر 79 سال تھی بھارت کے ضلع فیروزپور میں پیدا ہوئے۔

اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا' ادبی دنیا میں شہرت افسانہ "گڈریا" سے ملی۔ 25 سے زائد کتابیں لکھیں' لیل ونہار کے ایڈیٹر بھی رہے ریڈیو پاکستان کے پروگرام "تلقین شاہ" نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔

انہیں اطالوی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ پسماندگان میں بیوہ (بانو قدسیہ) اور تین بیٹے چھوڑے ہیں۔

(ح) 0168, 28 ستمبر pg

لاہور (رپورٹر + ایجنسیاں) ریڈیو پاکستان سے تلقین شاہ کے کردار سے برسوں سامعین کا دل لبھانے اور ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اجاگر کرنے والی آواز ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی اردو کے صاحب طرز نثر نگار' براڈ کاسٹر ڈرامہ نگار' دانشور اور ٹی وی پروگراموں کے میزبان اشفاق احمد خان گزشتہ روز اپنے کروڑوں چاہنے والوں کو اداس کر گئے۔ وہ گزشتہ دو ماہ سے علیل تھے مرحوم کو ان کی خدامت کے اعتراف میں ستارہ امتیاز دیا گیا تھا۔ منگل کے روز صبح

9 بجے طبیعت خراب ہونے کے باعث ہسپتال لے جاتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے ان کی عمر 79 برس تھی ان کے لواحقین میں ان کی اہلیہ نامور افسانہ نگار بانو قدسیہ اور تین بیٹے شامل ہیں۔ اشفاق احمد بھارت کے شہر ضلع فیروز پور کے گاؤں مکسر میں 22 اگست 1925ء کو پیدا ہوئے میٹرک تک تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی اور اپنے سکول کی ادبی تنظیم کاروان ادب کے صدر بھی رہے انہوں نے ایم اے اردو نیشنل کالج لاہور سے کیا جبکہ اشفاق احمد نے ادبی دنیا میں شہرت افسانہ ''گڈریا'' سے حاصل کی انہوں نے 25 سے زائد کتب لکھیں ان کی مشہور کتابوں میں توتا کہانی 'ایک ایک محبت سو افسانے' سفر در سفر، صبحانے افسانے' بند گلی' کے نام قابل ذکر ہیں ان کی آخری تصنیف ''زاویہ'' تھی جو کچھ عرصہ قبل مارکیٹ میں آئی ہے۔ اس نام سے پاکستان ٹیلی ویژن لاہور مرکز میں طویل عرصہ تک پروگرام بھی پیش کرتے رہے جو ناظرین میں بے حد مقبول رہا۔ وہ اب پھر نشر مکرر کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اشفاق احمد ایک عرصہ تک ادبی میگزین لیل و نہار کے ایڈیٹر بھی رہے بعد ازاں انہوں نے اپنا ذاتی ادبی میگزین ''داستان گو'' شروع کیا اسی دوران انہوں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار ایک آرٹ فلم ''دھوپ چھاؤں'' کی ڈائریکشن کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اشفاق احمد ریڈیو پاکستان میں طویل عرصے تک پروگرام ''تلقین شاہ'' پیش کرتے رہے پروگرام کی مقبولیت کے حوالے سے انہیں اکثر لوگ تلقین شاہ کے نام سے پکارنے لگے۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے ادب کی دنیا میں وہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کیلئے بے شمار ڈارمے لکھے جو بے حد مقبول ہوئے ان میں ایک محبت سو افسانے' منچلے کا سودا' حیرت کدہ' ناہلی تھلے' توتا کہانی' اور ڈرامے' اچے برج لاہور دے' وغیرہ شامل تھے۔ اشفاق احمد اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر بھی فائز رہے اور ریڈیو پاکستان آزاد کشمیر میں بھی اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اٹلی سے خصوصی تعلیم حاصل کی اور انہیں اطالوی زبان پر بھی عبور حاصل تھا اشفاق احمد خان کے تین بیٹے ہیں جن میں ایک بیٹا انیق ان کے انتقال سے ایک روز قبل ہی امریکہ چلے گئے جبکہ ایک بیٹا بینکار اور تیسرے بیٹے انیس ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ افسر ہیں۔ اشفاق احمد خان کی اہلیہ بانو قدسیہ کا ادب کی دنیا میں اہم

مقام ہے۔ اکثر تقریبات میں وہ اکٹھے شرکت کرتے تھے ادب کی دنیا کی اس خوبصورت جوڑی پر
اکثر لوگ رشک کرتے تھے' دونوں اپنے اپنے حوالے سے ادب کی دنیا میں ایک خاص مقام رکھتے
ہیں' مرحوم دیال سنگھ کالج میں اردو لیکچرار بھی رہے۔ اشفاق احمد خان کی نماز جنازہ' ماڈل ٹاؤن کی
گراؤنڈ میں سہ پہر پانچ بج کر پانچ منٹ پر ادا کی گئی جس میں گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد
مقبول کے علاوہ' اعلیٰ افسران شہر' کی مقتدر شخصیات اور شاعروں' ادیبوں' دانشوروں کی کثیر تعداد
نے شرکت کی۔ ان کی نماز جنازہ تقریباً پانچ ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی۔ اشفاق احمد کی
تدفین ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں ہوئی۔ ان کی نماز جنازہ میں شاعر منیر نیازی' ڈاکٹر سلیم اختر
' انور سدید' شہزاد احمد، قاضی جاوید' حمید اختر' حسین شاد' انتظار حسین' اے جی جوش' افضال شاہد
' خواجہ زکریا' اسلم کولسری' امجد اسلام امجد' کے علاوہ دیگر نامور شخصیات میں چیئرمین واپڈا طارق
حمید' پولیس اور دیگر محکموں کے اعلیٰ افسران شریک تھے اشفاق احمد خان کی رسم قل بروز جمعرات ان
کی رہائش واشر ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی نمبر 121 میں شام پانچ بجے ہوگی۔ قرآن خوانی اور ان
کی روح کے ایصال ثواب کیلئے خصوصی طور پر دعا کی گئی۔ اشفاق احمد کے جنازے میں جن
شخصیات نے شرکت کی ان میں سردار محمد چودھری' ڈاکٹر تبسم کاشمیری' خواجہ محمد زکریا منور
سعید (اداکار) طارق عزیز' ڈاکٹر سلیم اختر' ڈاکٹر احسن اختر ناز' احمد فراز' سمیع آہوجا' خالد اقبال یاسر
' ڈاکٹر انیس ناگی' غلام حسین ساجد' شہزاد احمد' احمد عقیل روبی، آفتاب اقبال (پروڈیوسر) شعیب بن
عزیز' خالد احمد' مستنصر حسین تارڑ' ڈاکٹر انور سدید' صابر لودھی' فرخندہ لودھی' معشہ خان، اسلم
کولسری' ناصر بشیر' حمید اختر' اعزاز احمد آذر افضال شاہد' ڈاکٹر سہیل احمد خان' طاہر یوسف' عمران
نقوی اور وکیل انجم شامل تھے۔

روزنامہ صحافت لاہور
8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کی تحریروں سے استفادہ کرتے رہیں گے۔
صدر اور وزیر اعظم کی طرف سے اظہار تعزیت۔

اسلام آباد (ثناء نیوز) صدر جنرل پرویز مشرف نے ممتاز دانشور اشفاق احمد کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے صدر نے کہا کہ اشفاق جیسے لوگ اثاثہ ہیں عوام ان کی تحریریں اور تجربات سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ وزیر اعظم شوکت عزیز اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی نے اشفاق احمد کی وفات پر تعزیت کی ہے۔

ہم والد کی چھاؤں سے محروم ہو گئے۔
اس قدر شفیق تھے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ بیٹا

لاہور (کلچرل رپورٹر) ابو یوں ہمیں چھوڑ جائیں گے ہمیں یقین نہیں آتا یہ بات ان کے بیٹے اثیر نے پاکستان سے بات چیت کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس قدر شفیق باپ تھے۔ جس کے بارے میں اگر بیان بھی کرنا چاہوں تو شائد نہ کر سکوں گا۔ میں ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں سے محروم ہو گیا ہوں۔

روزنامہ پاکستان لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد خان 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت والٹن کیمپ میں لاؤڈ سپیکر پر بچھڑنے والوں کو ملاتے رہے۔

لاہور (فرخ شہزاد غوری سے) قیام پاکستان 1947ء کے موقع پر اپنوں سے بچھڑنے والوں کو والٹن کیمپ میں اشفاق احمد خاں کی آواز ایک دوسرے سے ملاتی رہی' بتایا گیا ہے کہ اشفاق احمد والٹن کیمپ میں لگے ہوئے ایک لاؤڈ سپکر پر اناؤنسمنٹ کے ذریعے قیام پاکستان کے مواقع پر ایک دوسرے سے بچھڑنے والوں کے نام پکار کران کو ایک دوسرے سے ملاتے رہے۔انہوں نے والٹن کیمپ میں یہ ڈیوٹی انسانی رشتوں کے حوالے کے ساتھ دن رات جاری رکھی ۔اشفاق احمد خان کے انتقال کے حوالے سے ان کے ایک قریبی دوست نے کہالاکھوں خون کے رشتوں کو آپس میں ملانے والاشخص ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

روزنامہ "پاکستان" لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد جیسی شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔

وہ قوم کا ادبی اثاثہ تھے۔ وزیر اعلیٰ

پاکستان ایک بلند مرتبہ علمی ادبی شخصیت سے محروم ہو گیا۔ گورنر پنجاب

مرحوم نے تحمل، برداشت اور انسانی دوستی کے صوفیائے کرام کے مشن کو زندہ رکھا۔ شجاعت

اشفاق ادب کی دنیا کے لیجنڈ تھے۔ میاں عامر، پیر پگاڑا، عارف افتخار، سعادت اللہ خان اور ابرار الحق۔

مرحوم سچے پاکستانی تھے۔ قاضی، چودھری رحمت الٰہی، لیاقت بلوچ اور دوسرے رہنماؤں کا اظہار تعزیت۔

لاہور (ادبی رپورٹر + ایجنسیاں + پر) گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول نے ملک کے مایہ ناز براڈ کاسٹر، ادیب اور دانشور اشفاق احمد کے انتقال پر گہرے رنج اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ مرحوم کی اہلیہ محترمہ بانو قدسیہ اور دیگر اہل خانہ کے نام تعزیتی پیغام میں گورنر خالد مقبول نے کہا اشفاق احمد کی وفات سے پاکستان ایک بلند مرتبہ علمی اور ادبی شخصیت سے محروم ہو گیا ہے جو انسان دوستی کے حوالے سے اپنے ہم عصروں میں منفرد مقام رکھتے تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے اشفاق احمد خان کی وفات کو قومی نقصان قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اشفاق احمد جیسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں، وہ پاکستان کا ایک قیمتی علمی اور ادبی اثاثہ تھے جس پر کوئی بھی معاشرہ فخر کر سکتا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور سابق وزیر اعظم چودھری شجاعت حسین نے اشفاق احمد کے انتقال کو ناقابل تلافی قومی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ ملک ایک عظیم صوفی دانشور سے محروم ہو گیا ہے۔ مرحوم کی بیوہ بانو قدسیہ کے نام ایک تعزیتی بیان میں چودھری شجاعت حسین نے کہا کہ اشفاق احمد انسان دوستی، سادگی اور محبت و شفقت کی علامت تھے ان کی تحریریں اور افکار اسلام کی حقیقی روح کی عکاس تھیں ان کی قومی اور ملی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ضلع ناظم لاہور میاں عامر محمود نے اشفاق احمد المعروف "تلقین شاہ" کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم اشفاق احمد ادب کی دنیا کے "لیجنڈ" تھے۔ پیر صاحب پگارو نے پروفیسر اشفاق احمد کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ پیر صاحب پگارو، مرکزی سیکرٹری جنرل شیخ محمد انور سعید اور مرکزی جوائنٹ سیکرٹری عزیز ظفر خان آزاد نے ممتاز دانشور اور محقق بزرگ

کی رہنمائی سے محروم ہوگئی ۔اشفاق احمد کی وفات پر اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین افتخار عارف ڈائریکٹر جنرل گلزار احمد اور ریذیڈنٹ ڈائریکٹر قاضی جاوید نے گہرے رنج کا اظہار کیا ہے۔ اکادمی کی طرف سے جاری ہونے والے تعزیتی بیان میں انہوں نے کہا ہے کہ اشفاق احمد وطن عزیز کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے تھے۔انہوں نے اردو افسانے اور ڈرامے کو پاکستانی سماج کے ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تخلیقات میں ہماری اعلٰی اخلاقی اور سماجی اقدار کی نمائندگی کی ۔جی سی یونیورسٹی لاہور کے اسٹاف نے ممتاز ترین ادیب اور سکالر اشفاق احمد کی اچانک موت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے اور اس کو قومی المیہ سے تعبیر کیا ہے۔اولڈ راوین یونین کے صدر انسپکٹر جنرل پنجاب پولیس سعادت اللہ خان اور پنجاب پروفیسرز اینڈ لیکچررز ایسوسی ایشن جی سی یونیورسٹی یونٹ کے صدر پروفیسر حاجی محمد شریف اور ایسوسی ایشن کے ممبران نے اشفاق احمد کی اچانک موت کو گہرا قومی نقصان قرار دیا ہے۔چیئرمین سہار فار لائف ٹرسٹ ابرار الحق نے کہا کہ عظیم سکالر اور ادیب ڈاکٹر اشفاق احمد کی ناگہانی موت سے سہارا لائف ٹرسٹ ایک مدبر اور اہم بورڈ آف گورنر کے رکن سے محروم ہو گیا ان کی کمی آنے والے دنوں میں محسوس کی جاتی رہے گی۔ابرار الحق نے کہا کہ ڈاکٹر اشفاق احمد کی سہارا کیلئے خدمات' نیک خیالات اور غریب عوام کے ساتھ محبت کی وجہ سے ہی انہوں نے میرا ساتھ دیا اور ہر موقع پر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور میرے مقصد میں کامیابی کیلئے انہوں نے مجھے آگے بڑھنے میں مدد کی ۔ڈاکٹر اشفاق احمد کی گراں قدر خدمات نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد، نائب امرا چودھری رحمت الٰہی محمد اسلم سلیمی' حافظ محمد ادریس' لیاقت بلوچ اور ڈپٹی سیکرٹری جنرل فرید احمد پراچہ نے ممتاز ادیب دانشور اور مصنف اشفاق احمد کی وفات پر گہرے رنج و افسوس کا اظہار کیا ہے' اپنے تعزیتی بیان میں جماعت اسلامی کے مرکزی رہنماؤں نے کہا ہے کہ اشفاق احمد ایک سچے محب وطن پاکستانی تھے ۔وہ اسلامی نظریات کے حامی تھے ان کی تحریریں شگفتہ اور تعمیری انداز رکھتی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر ان کے پروگرام دلچسپی سے سنے اور دیکھے جاتے تھے ۔وہ ایک ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔

روزنامہ "پاکستان" لاہور

8 ستمبر 2004ء

میری قبر اچھی سی مگر کچی ہونی چاہیے۔
جہاں ہینڈ پمپ ضرور ہو۔
قبر پر ہر وقت ایک ڈھولکی والا ہو
جو قوالی کے انداز میں کچھ پڑھ رہا ہو۔

اشفاق احمد کا قومی ڈائجسٹ کو آخری انٹرویو۔

لاہور (ادبی رپورٹر) میری آرزو ہے کہ میری قبر اچھی سی لیکن کچی سی ہو جس پر ایک ہینڈ پمپ ضرور ہو تا کہ مسافر وہاں پانی پی لیا کریں۔ یہ بات اشفاق احمد مرحوم نے ''قومی ڈائجسٹ'' کو دیے گئے اپنے آخری انٹرویو میں اس سوال کے جواب میں یہ بات کہی کہ میری قبر پر ہر وقت ایک ڈھولکی والا ہو جو قوالی کے انداز میں کچھ پڑھ رہا ہو۔ شعر چاہے غلط ہی پڑھے کیوں کہ پڑھے لکھے لوگوں کے پاس وقت کہاں ہوتا ہے وہ تو کوئی ان پڑھ آدمی ہو سکتا ہے۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد خان نے اردو سائنس بورڈ کی عمارت اپنی نگرانی میں بنوائی

لاہور (ادبی رپورٹر) مکتبہ تعمیر انسانیت کے مالک سعید اللہ صدیق کے انکشاف کیا کہ پاکستان بھر کے علمی ادبی اور تحقیقی اداروں میں سائنس بورڈ واحد ادارہ ہے جو اپنی بلڈنگ میں کام کر رہا ہے۔ یہ عمارت اشفاق احمد مرحوم نے اپنے دور میں اپنی نگرانی میں بنوائی تھی۔ سعید اللہ صدیق نے "پاکستان" سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ملک کے دیگر تمام علمی و ادبی ادارے اس وقت کرائے کی بلڈنگز میں کام کر رہے ہیں۔

روزنامہ "پاکستان" لاہور
8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کا پروگرام ''زاویہ''
نواز شریف حکومت ختم ہونے پر بند کردیا گیا
بعدازاں پھر شروع ہوگیا۔

لاہور (ادبی رپورٹر) اشفاق احمد کا ٹیلی ویژن پروگرام ''زاویہ'' جہاں عوام میں مقبول تھا وہاں یہ خواص میں بھی پسند کیا جاتا تھا۔نواز شریف حکومت ختم ہونے پر ٹیلی ویژن حکام نے یہ پروگرام بند کردیا تو ایک تقریب میں جنرل پرویز مشرف کی اہلیہ محترمہ صہبا مشرف نے اشفاق صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنا پروگرام کیوں بند کردیا۔تو اشفاق صاحب نے جواب دیا شائد فوجیوں کے ڈر سے ٹی وی والوں نے بند کردیا۔تاہم تھوڑے عرصے بعد یہ پروگرام دوبارہ شروع کردیا گیا تھا۔''زاویہ'' میں ہونے والی گفتگو حال ہی میں کتابی صورت میں چھپ کر سامنے آئی۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کی وفات اورادب کیلئے سانحہ ہے

جمیل الدین عالی

مرحوم جتنے بڑے ادیب تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے

ان کے بغیر اردو ادب کی تاریخ ادھوری ہے۔ شوکت صدیقی

ان کے تخلیقی کام کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ فردوس جمال

انہوں نے ڈرامے کو تشخص دیا۔ امجد اسلام امجد

مرحوم جونیئرز کو دل کھول کر داد دیتے۔ یونس جاوید طارق عزیز کا پی ٹی وی کے

پروگرام میں اظہار خیال۔

لاہور (مانیٹرنگ ڈیسک) ممتاز دانشور اور شاعر جمیل الدین عالی نے کہا ہے کہ ایسا نہیں دکھائی دیتا کہ اشفاق احمد کے مقام و مرتبے کا کوئی بڑا ادیب بہت جلد ہمارے ہاں پیدا ہو سکے گا انہوں نے کہا کہ ان کی وفات اردو ادب کیلئے ایک بڑا سانحہ ہے۔ وہ اشفاق احمد کی یاد میں تیار کئے گئے پی ٹی وی کے خصوصی پروگرام میں اظہار کر رہے تھے، انہوں نے کہا کہ ان کے افسانے اور ڈرامے ایک محبت سو افسانے ان کی ایک اہم تخلیق جو عاشقانہ اور مدبرانہ بھی تھی۔ اور ایک خاص پیغام بھی دیتی تھی اردو کے ممتاز ادیب شوکت صدیقی نے اشفاق احمد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہ اشفاق احمد جتنے بڑے ادیب تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ ان کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ اداکار فردوس جمال نے کہا کہ اشفاق احمد کے تخلیقی کام کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اشفاق صاحب نے میرے فنی کیریئر کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اشفاق احمد کے صاحبزادے انیق احمد نے کہا کہ وہ ایک شفیق باپ تھے۔ انہوں نے ہر مشکل وقت میں ہماری راہنمائی کی ممتاز شاعر اور ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد نے کہا کہ اشفاق احمد نے ٹی وی ڈرامے کو ایک تشخص دیا۔ وہ اس کے بانیوں میں سے ایک تھے، ہم نے ان سے

ڈرامہ لکھنا سیکھا۔ ڈرامہ نگار اصغر ندیم سید نے کہا کہ وہ کتابوں سے بہت محبت کرتے تھے اور اپنی ذاتی لائبریری میں موجود ہر ایک کتاب کو ایک قرینے اور سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہ اشفاق احمد کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ انہوں نے ایک عام آدمی سے دانش کو حاصل کیا اور پھر اسے عام لوگوں تک پہنچایا۔

ڈرامہ نگار یونس جاوید نے کہا کہ اشفاق احمد جونیئر لکھنے والوں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کمپیئر طارق عزیز نے اشفاق احمد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اشفاق احمد صاحب کے جانے سے لگتا ہے کہ پاکستان کی ادبی وشناختی زندگی میں ایک ویرانی سی آگئی ہے۔ ادبی حلقے ایک طویل مدت تک انہیں فراموش نہیں کر سکے گے۔ پروگرام میں اداکار نذیر حسینی، جمیل ملک، ریاض محمود، مسعود اختر اور دیگر شرکاء نے بھی اشفاق احمد کو خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد

بے نیاز صوفی بابا، رکھ رکھاؤ سے سرشار دنیادار

اپنے دیرینہ ساتھی کے بارے میں ممتاز مفتی کی دلچسپ تحریر

اشفاق احمد کی زندگی میں ان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کے بارے میں ان کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں اظہار خیال کیا. لیکن ان کے دیرینہ ساتھی ممتاز مفتی نے ان کی شخصیت کا جس اندازمیں احاطہ کیا وہ منفرد اور انوکھا ہے. اس میں اشفاق احمد کی زندگی کے تمام پہلو جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں.

اشفاق احمد کھاتے پیتے پٹھان گھرانے میں پیدا ہوا۔ بہت سے بھائیوں میں ایک کے سوا سب سے چھوٹا۔ باپ ایک قابل محنتی اور جابر پٹھان تھا جس کی مرضی کے خلاف گھر میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ گھر کا ماحول روایتی تھا۔ بندشیں ہی بندشیں۔ اس کے باوجود اشفاق کی شخصیت میں بنیادی طور پر پٹھانیت کا عنصر مفقود ہے۔ اشفاق احمد کی شخصیت میں دکھ اور چپ کا عنصر میرے لئے ایک معمہ ہے چونکہ میں نے زندگی میں آج تک اشفاق احمد سا کامیاب آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے جوانی میں روایت توڑ محبت کی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ گھر والے کسی غیر پٹھان لڑکی کو بہو بنانے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ گھر میں محبت کا اعلان کرنے کی اس میں کبھی جرات پیدا نہ ہوگی۔ اس کے باوجود ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ محبت میں کامیاب ہو گیا۔ شادی کے بعد مجبوراً اسے گھر چھوڑنا پڑا اس وقت وہ بے سہارا تھا۔ بے وسیلا گھر کا چولہا جلانے کے لئے مجبوراً اسے سکرپٹ رائٹر بننا پڑا۔ اس زمانے میں سکرپٹ رائٹنگ کی اس قدر مانگ نہ تھی کہ گزارہ ہو سکے۔ اشفاق احمد کو اس کاروبار میں

صرف کامیابی ہی حاصل نہیں ہوئی بلکہ شہرت بھی ملی۔ بے شک اشفاق احمد نے جدوجہد کی محنت کی لیکن محنت کامیابی کی ضامن نہیں ہوتی۔ تقسیم کے بعد جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو وہ بنیادی طور پر وہی کچھ تھا جو آج ہے۔ دکھ اور چپ کے تار و پود سے بنا ہوا ٹاٹ جس پر سنہرے تاگے سے کاڑھی ہوئی پھل پتیاں تھیں۔ آج بھی وہ وہی ٹاٹ ہے' پتیاں البتہ نمایاں ہو گئی ہے۔ ٹاٹ اور سنہرے پن کا تضاد بہت واضح ہو گیا ہے۔ ان دنوں میں بمبئی سے آیا ہوا مہاجر تھا۔ اپنے عزیزوں کو مشرقی پنجاب سے بچا کر لا چکا تھا۔ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ مہاجر کیمپ میں محرر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک روز کیمپ کے ایک ویران کونے میں جب میں حالات کی وجہ سے پریشان کھڑا تھا تو ایک چٹی سفید' شگفتگی اور تازگی سے بھرپور نمیار میرے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ آنکھیں چمکا کر بولی "آپ ممتاز مفتی ہیں؟"

"جی" میں نے جواب دیا۔ "ہم نے آپ کی آپا پڑھی ہے"۔ "بہت اچھا کیا آپ نے"

بولی "میں ساتھ والے کیمپ میں ملازم ہوں۔ کبھی ادھر آیئے گا"۔ "جی اچھا"۔ میں نے جواب دیا۔ بولی "میرا نام اشفاق احمد ہے"۔

پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر ایسے لگا جیسا گلابی مخمل پر سنہرے پھول کڑھے ہوں۔ پھر اشفاق اور میں روز ملنے لگے۔ جوں جوں میں اس کے قریب آتا گیا' مخمل ٹاٹ میں بدلتی گئی۔ سنہرے پھل بوٹے ابھرتے آئے۔ طوائف کی پسواج کبھی کبھی کھلنے لگتی۔ اس لئے نہیں کہ اشفاق کے اندر کی طوائف بہت نمایاں تھی بلکہ اس لئے کہ وہ میرے اندر کی طوائف سے زیادہ بھڑکیلی تھی۔ ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں ننگی' کسی میں ادھ کھلی' کسی میں مستور۔ مثلاً ابوالاثر میں بالکل ننگی تھی' محمد طفیل میں مستور۔ انتظار میں ادھ کھلی ہے' اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے اس زمانے میں ہم لارنس باغ میں اوپن ایئر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ایئر تھیٹر زوبی کے قبضے میں تھا۔ زوبی اشفاق کا دوست تھا اور جانا پہچانا آرٹسٹ تھا۔ زوبی خوش باش نوجوان تھا۔ اندر میں سنجیدگی تھی۔ بات میں پھلجھڑی تھی۔ اوپن ایئر تھیٹر میں پہنچتے ہی اشفاق کے

اندر کا ڈرامائی نقالیہ باہر نکل آتا۔ پھر رنگین باتوں کے سنہرے جال ہوا میں اڑتے۔ نقلیں' قصے' کہانیاں' چٹکلے' لطیفے' اشفاق احمد تماشا ہوتا' ہم تماشائی ہوتے اور اوپن ایئر تھیٹر واقعی تھیٹر بن جاتا۔
اشفاق احمد Talented فنکار ہے۔ اس کی ٹیلنٹ کا مرکز آنکھ اور کان ہیں' خصوصاً کان۔ وہ مجھ سے زیادہ دیکھتا ہے' زیادہ سنتا ہے اس کا ذہن ہر تفصیل کو ریکارڈ کر لیتا ہے اور اس کا نطق اسے من و عن پروڈیوس کر سکتا ہے۔ ان دنوں اشفاق احمد ایک لق و دق جزیرے میں رہتا تھا۔ Robinson Crusoe کے جزیرے سے کہیں زیادہ ویران تھا۔ اشفاق احمد کا یہ جزیرہ ایک بہت کھلی نیم چھتی تھی جو ایک وسیع و عریض رستے بستے مکان کی اوپر کی منزل پر واقع تھی۔ جب بڑے خان گھر پر نہ ہوتے تو نچلی منزل میں ایک میلا لگ جاتا۔ شور شرابا' ہنسی مذاق لیکن نیم چھتی میں ہر وقت ہو کا عالم رہتا۔ وہاں چاروں طرف کتابوں کے ریک بھرے ہوئے تھے جن میں رنگارنگ کی کتابیں تھیں۔ ان کے درمیان فرش پر اشفاق احمد یا تو مطالعہ میں مصروف ہوتا یا پھر مستقبل کے منصوبے بناتا جاگتے کے خواب دیکھتا۔ اس جزیرہ کو دیکھ کر میں نے جانا کہ اشفاق احمد صرف دکھ اور چپ ہی نہیں' ازلی اکیلا بھی ہے۔ وہ بذات ایک خود ایک جزیرہ ہے جو کسی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہو۔ سارا سارا دن وہ کتابوں کے انبار میں بیٹھا رہتا۔ بے نام دکھ کا مارا ہوا' بے وجہ چپ تلے دبا ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ ساری نیم چھتی ایک عظیم اکتاہٹ سے لبالب بھر جاتی۔ اس میں ایک وحشت پیدا ہوتی۔ لیک کر وہ سنہرے پھل بوٹوں والا چغہ پہن لیتا۔ چغہ پہنتے ہی چہرے کے زاویئے اوپر کو ابھر آتے۔ ہونٹوں پر روغنی تبسم کھلنے لگتا اور وہ چٹکیاں بجاتا ہوا نیم چھتی کی سیڑھیاں اترنے لگتا۔ پھر وہ خوش باش نوجوان اوپن ایئر تھیٹر میں جا پہنچتا۔ وہاں ڈگڈگی بجاتا' گھنگرو چھنکاتا' مجمع لگاتا' تھیلے سے رنگین باتوں کے جال نکالتا' گنگناتا' گاتا' ڈرامے کھیلتا' قہقہے لگاتا' خود ناچتا' دوسروں کو نچاتا۔ لیکن یہ دور زیادہ دیر کے لئے نہیں چلتا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی جزیرہ' وہی ہوحق' وہی دکھ' وہی چپ' وہی تنہائی' وہی اشفاق احمد۔ اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس خاتون کی طرح گزر رہی تھی جو سارا دن ننگے سر ننگے پاؤں' ان دھلے منہ اور لٹ پٹ بال لئے دھوپ میں بیٹھی اونسیاں پانے میں لگی رہتی ہو اور شام کو ہار سنگار کر کے پشواج پہن کر طوائف

بن جاتی ہو۔ پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت اس قدر اہتمام کیوں کرتی ہے! اپاہج بنا کر ناچنے کی انگیخت دیتی ہے۔ گونگا بنا کر باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر اکساتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے۔ مگر یقیناً وہ ایسا کرتی ہے۔ اس زمانے میں ایک ویران نیم چھتی میں تنہائی' دکھ اور چپ کی بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فنکار کی تخلیق کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کن وجوہات کی بناء پر اشفاق احمد کی شخصیت میں ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک بے نیاز صوفی بابا' رکھ رکھاؤ سے سرشار ایک دنیا دار' خودنمائی سے بھرپور ایک خاتون' پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا' دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کسنے والا ایک تلقین شاہ' اپنی منوانے والا گھر کا مالک' سن کر جذب کر لینے والا ایک عظیم کان' مشینوں سے کھیلنے والا ایک بچہ' جان دینے والا ایک بنیا لٹیا لنڈھا دینے والا مہمان نواز! اشفاق کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔ اتنے عظیم کہ انہوں نے گھر کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے گھر میں بالشتیوں کی بھیڑ لگی ہوتی تھی۔ جب یہ گلیور گھر ہوتا تو کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوتی۔ گھر سے باہر ہوتا تو دھما چوکڑی مچ جاتی۔ ان کی بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتی کہ عجز' ادب' احترام اور دنیا داری کا کون سا نیا مرکب ایجاد کیا جائے جس کے زور پر ظل الٰہی کو ڈھب پر لایا جا سکے۔ خان منزل میں صرف پٹھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔ چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا۔ اس لئے گھر میں وہ سب سے چھوٹا بالشتیا تھا۔ اشفاق میں انفرادیت کی ایک کلی لگی ہوئی ہے۔ وہ چاہتا کہ کوئی انوکھی بات کرے' انوکھا کام کرے' انوکھی خبر سنا کر دنیا کو حیران کر دے۔ خان منزل میں اس کا یہ جذبہ تشنۂ تکمیل رہا۔ دل میں ایک کانٹا سا لگا رہا۔ ردعمل یہ ہوا کہ وہ کسی کو گلیور ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کسی پہلو سے خود کو بالشتیا تسلیم کرنے سے منکر۔ اگرچہ وہ اپنی فنکارانہ عظمت کا تذکرہ خود نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا کہ دوسرا کرے۔ دوسرا کرے تو اشفاق کے چہرے پر پھلجھڑیاں چلنے لگیں گی' چہرے کے زاویے اوپر کو ابھر آئیں گے' آنکھوں میں تبسم پھوٹے گا۔ کسی دوسرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ بات کو کاٹے گا نہیں لیکن ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔ اشفاق احمد کی شخصیت کے سادھو پن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ انا خاموشی کے گھونگھٹ تلے چھپے رہنے کے باوجود بڑی طوطا چشم ہے۔ اس جزیرے کی

بوجھل تنہائی میں اشفاق احمد نے اظہار کا جو پہلا طریقہ آزمایا' وہ مصوری تھا۔ یہ زودلی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے مصوری چھوڑ کر ادب کو اپنا لیا اور وہ مختصر افسانے لکھنے لگا۔ مصوری کا دور صرف تین چار سال رہا۔

ادب میں شہرت پانے کے بعد دنیائے ادب میں رکنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس کے اندر کی طوائف کا دم گھٹنے لگا اور وہ شو مین بزنس میں جا شامل ہوا۔ اولین دور میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا۔

اشفاق احمد نے آج تک اپنے ایک فن سے' صرف ایک مالی فائدہ حاصل کیا اور وہ سکرپٹ رائیٹنگ۔ عرصہ دراز تک اشفاق کے گھر میں حساب کتاب سکرپٹوں میں ہوتا رہا۔ کرایہ مکان چار سکرپٹ' باورچی خانہ کا خرچہ آٹھ سکرپٹ' علاج معالجہ ڈیڑھ سکرپٹ' لین دین دو سکرپٹ۔ آج بھی بانو سے پوچھو یہ صوفہ کتنے میں خریدا تھا تو وہ کہے گی' اچھی طرح یاد نہیں شاید تین سکرپٹ لگے تھے۔

گمان غالب ہے کہ ایک دن جب بھٹیارن دانے بھون رہی تھی' اسے وہ شخصیت یاد آ گئی جس نے اسے چڑ چڑ کا تحفہ بخشا تھا۔ وہ گلیور جس نے بچپن میں اسے مُحگنا بنائے رکھا تھا۔ اس وقت اشفاق احمد اپنے نئے سکرپٹ کے لئے موضوع سوچ رہا تھا۔ اس نے بچپن کے گلیور کا قصہ لکھ دیا۔

یوں تلقین شاہ وجود میں آ گیا!

تلقین شاہ ایک جاذب توجہ کردار ہے۔ لوگوں نے تلقین شاہ سنا تو بھونچکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے بالشتیے نے سر نکالا اور دوسروں کو تلقین کرنے والے گلیور پر تالیاں بجانے لگا۔ ہم سب میں کہیں نہ کہیں ایک چھپا ہوا بالشتیا موجود ہے جس کا وجود کسی نہ کسی تلقین شاہ کا مرہون منت ہے۔

اشفاق احمد ایک Perfectionist ہے مثلاً جب وہ ماڈل ٹاؤن میں مکان بنا رہا تھا تو کئی ایک ماہ کے لئے معمار بن گیا۔ چنائی اور پلستر کے کاموں کے اندر دھنس گیا۔ جب وہ مکان

میں نلکے لگوا رہا تھا تو آٹھ روز برانڈرتھ روڈ کے چکر لگاتا رہا۔ اس نے تمام ٹونٹیاں دیکھیں۔ کس کس کا منہ کھلا ہے۔ کس کس کا بند بند سا ہے' بیچ میں کتنے کتنے چکر ہیں' کس کس کا واشل مضبوط ہے' کھولیں تو کتنی دھار نکلتی ہے' بند کریں تو چونے کی صلاحیت کس قدر ہے۔ آٹھ دن کی تحقیق کے بعد وہ ٹونٹیوں پر تفصیلی مقالہ لکھ سکتا تھا کہ پاکستانی کارخانوں کی بنی ہوئی ٹونٹیوں کے کیا کیا خواص ہیں' کیا کیا خوبیاں ہیں' کیا کیا خامیاں' یہ تفصیلات اکٹھی کرنے کے بعد اس نے مکان کے نلکوں کے لئے ٹونٹیاں خریدیں۔

کباب بنانے کا شوق پیدا ہوا تو لاہور کے معروف کبابیوں سے کوائف اکٹھے کرتا رہا۔ قیمہ کیسا ہونا چاہئے' مصالحہ کیسا ہونا چاہئے' آنچ کیسی ہو۔ اس کے بعد اس نے کباب بنانے کی سیخیں خریدلیں اور میاں بیوی مل کر کباب سازی کی مشق کرتے رہے۔ اب اشفاق کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب منفرد حیثیت رکھتے۔ وہ اکثر دوستوں کو مدعو کرتا۔ خود کباب بنائے جاتا' دوست کھائے جاتے۔

اشفاق احمد کی خوش قسمتی کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ اشفاق احمد نے ایک خاتون سے عشق کیا۔ کئی ایک سال وہ اس کے عشق میں گھلتا رہا۔ عشق میں کامیاب ہوا۔ خاتون بیوی بن کر گھر آئی تو محبوب نہ تھی بلکہ عاشق نکلی۔ ورنہ اشفاق احمد کے جملہ کس بل نکل جاتے۔ محبوب طبیعت وہ ازلی طور پر تھا۔ بیوی کی آمد کے بعد بالکل ہی دیوتا بن گیا۔ کانٹا اشفاق کو چبھتا.... تو درد بانو کو ہوتا...... چھینکی اشفاق چلاتا...... تو آبلے بانو کے ہاتھوں میں پڑتے...... حیرت کی بات ہے کہ ایک ناقص' پکی دانشور نے پتی بھگتی میں اپنا سب کچھ جذبات' ذہن' روح تیاگ رکھا...... بانو بہت بڑی مفکر ہے۔ وہ ہر بات میں صاحب رائے ہے' عقل و خرد سے بھرپور لیکن جب اشفاق طلوع ہو جاتے تو سب کچھ سپاٹ ہو جاتا...... عقل' خرد اور دانشوری۔

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

لیکچرار سے تلقین شاہ تک

تحریر: اسلم کولسری

غالباً 1961ء کا ذکر ہے جب جناب اشفاق احمد نے ریڈیو پاکستان کے ارباب بست وکشاد کو ایک ہفتہ وار ریڈیائی پروگرام کا تصور دیا' جس میں اہم کردار صرف دو تھے اور دو ہی مرد انہ ..... یعنی ایک تو خود تلقین شاہ اور دوسرے ان کا ذاتی ملازم ہدایت اللہ۔ یہ ایک طنزیہ اور مزاحیہ پروگرام تھا' جس کے ذریعے معاشرے کی بدنمائیوں کا اظہار اور اصلاح مقصود تھی۔ متعلقہ افسران کا خیال تھا کہ یہ پروگرام ہو سکتا ہے مگر ایک یا دو ہفتے سے زیادہ چلنے کے امکانات معدوم ہیں۔ اشفاق صاحب نے کہا کہ آزمانے میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ محض آزمائشی طور پر یہ پروگرام نشر کیا گیا مگر ہوا یہ کہ تلقین شاہ براعظم ایشیا کا نمبر ون دنیا کا دوسرے نمبر پر آنے والا سب سے طویل ریڈیائی فیچر قرار پایا۔

جب ٹیلی ویژن نہیں تھا اور لوگ ریڈیو کے رسیا ہوا کرتے تھے' تلقین شاہ سننے کے لئے ہوٹلوں اور چائے خانوں میں لوگوں کا ہجوم ہوا کرتا' تلقین شاہ کے جملے لوگوں کے تکیہ کلام بن جاتے اور محفلوں میں گونجتے رہتے۔

اس پروگرام کے ذریعے اشفاق احمد نے جو اس وقت لیکچرار تھے نہ صرف معاشرے کی خرابیوں اور خامیوں پر بڑے فن کارانہ انداز میں تنقید کی بلکہ کشمیر کاز کے لئے بھی زبردست جدوجہد کی اور بھارت میں پاکستان کی جن شخصیات کا سب سے زیادہ ''احترام'' پایا جاتا تھا' ان میں تلقین شاہ بھی شامل تھے۔ تاہم ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مجھے جناب اشفاق احمد نے بتایا کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل ایک ممتاز اداکار تھے ماسٹر جینت جو عوام میں بے پناہ مقبول تھے۔ وہ اداکار امجد خاں کے والد تھے اور انتہائی خوبصورت۔ ان کی کار پر پردے لگے ہوتے تھے کہ اس کے بغیر ان کا سفر کرنا ممکن نہ تھا' لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا' اگر کسی نے ان کی ایک جھلک دیکھ لی' تو مہینوں نشے میں رہتا۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتا تھا اور ہم سب اس کے بے حد مداح تھے۔ پاکستان بن گیا تو وہ ماسٹر جینت بھارت چلا گیا۔ اشفاق صاحب نے بتایا کہ 1965ء کے بعد ایک دن میں حسب معمول دیر سے ریڈیو پاکستان کے دفتر پہنچا۔ گیٹ پر ہی ملازموں نے بتایا کہ سٹیشن ڈائریکٹر صاحب بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو بتایا گیا کوئی مہمان ہے شاید۔ میں سٹیشن ڈائریکٹر کے دفتر میں پہنچا تو یہ دیکھ کر

حیران رہ گیا کہ وہاں ماسٹر جینت بیٹھے ہیں اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اٹھ کر مجھ سے گلے ملے اور بتایا کہ میں لندن جا رہا تھا اور میں نے اصرار کر کے براستہ لاہور جانے کا اہتمام کیا محض اس لئے کہ ایک نظر تلقین شاہ کو دیکھ لوں۔

اس پروگرام میں مرکزی کردار تو تلقین شاہ (اشفاق احمد) اور ہدایت اللہ (نذیر حسین) کے ہیں تاہم اور بھی کردار آتے جاتے رہے جن میں شمیم آپا' ایوب خان' منور کاظمی' خان صاحب اور شاہ صاحب نے بڑی شہرت پائی۔

میں اسے اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی کچھ پروگراموں میں ماسٹر خوشی محمد کے طور پر صداکاری کا موقع ملا۔ اشفاق صاحب اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل تھے جب کہ میں وہاں ریسرچ آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا' مجھے ان کی شفقت میسر تھی' چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ شاید میں یہ کام کر سکوں' بعد میں انہوں نے مجھے موقع دیا' شروع شروع میں گھبراتا تھا مگر وہ ریکارڈنگ کے دوران مجھے تھپکی دیتے رہے یوں کام چل نکلا۔ سب صداکاروں کے ساتھ ان کا رویہ اسی طرح بے حد مشفقانہ ہوتا۔ بعض اوقات وہ کچھ لوگوں کی مالی مدد کے لئے بھی انہیں پروگرام میں شامل کر لیتے ہیں ان کے لئے کردار لکھتے اور معاوضہ دے دیتے ہیں تاکہ اس کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو اور ان کی مدد بھی ہو جائے۔

تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ محض طنزیہ مزاحیہ گفتگو نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں کہیں کہیں ادبی لحاظ سے ماسٹر پیس بھی آتے' یہی وجہ ہے کہ جب تلقین شاہ کے پروگرام کتابی شکل میں شائع ہوئے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

صداکاری پر جناب اشفاق احمد کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ بڑے بڑے آرٹسٹ ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں ...... کیا ہی اچھا ہو شملہ پہاڑی کو تلقین شاہ چوک کا نام دے دیا جائے تاکہ اس عظیم دانشور' ادیب' ڈرامہ نگار' افسانہ نگار اور صداکار کو خراج تحسین پیش کیا جا سکے۔

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق صاحب
زندگی کے چند ناقابل فراموش پہلو

ملک مصیب الرحمٰن (قطر)

مجھے اپنی زندگی میں جن دو تین شخصیات سے نیاز مندی پر ناز ہے ان میں جناب اشفاق احمد شامل ہیں۔ میں زمانہ طالب علمی سے ان کے افسانوں کے سحر میں گرفتار رہا ہوں ان کا شمار اردو ادب کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا رہے گا۔ جزئیات نگاری پر انہیں خاص طور پر عبور حاصل تھا۔ ان کا افسانہ پڑھتے ہوئے قاری خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے تمام مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں ان کا شہرہ آفاق افسانہ ''گڈریا'' کلاسیک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اگر اردو کے عظیم افسانوں کا ذکر ہوں تو ''گڈریا'' اس میں ضرور شامل ہوگا۔ ان کے افسانوں کا انجام عام طور پر ٹریجک ہوتا ہے۔ اس سے افسانے کا تاثر ایک عرصہ تک قاری کے دل و دماغ پر قائم رہتا ہے۔

اشفاق صاحب کے افسانوں کا سحر، تاثیر اور گرفت ان کے ڈراموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے ڈرامے اگر دماغ کو دانش عطا کرتے ہیں تو دل کو درد کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔ تحریر کے ساتھ ساتھ انہیں تقریر پر بھی کمال عبور حاصل تھا اور ان کے خطاب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ ہوش و خرد اور عشق و سرمستی کی جو آمیزش ان کی تحریر و تقریر میں نظر آتی ہے اس کی مثال خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔

دوحہ کی عالمی ادبی تنظیم مجلس فروغ اردو ادب جس کی بناء ڈالنے کا افتخار مجھے حاصل ہوا نے کچھ برس پہلے جناب اشفاق احمد کو عالمی فروغ اردو ادب کا ایوارڈ دینے کا اعزاز حاصل کیا۔ عام طور پر کوئی ایوارڈ جس شخص کو ملتا ہے اس کے عزت اور توقیر میں اضافے کا باعث ہوتا ہے لیکن جب یہ ایوارڈ جناب اشفاق احمد کی خدمت میں پیش کیا جا رہا تو تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایوارڈ اپنی خوش بختی پر ناز کر رہا ہو۔ ان دنوں مجھے اشفاق احمد صاحب کی قربت کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کی

طبعیت میں اتنی شفقت تھی کہ مجھے یوں لگتا جیسے میرے خاندان کا محترم بزرگ مجھ سے مخاطب ہو۔ میں نے ان کی صحبت میں محبت اور مروت کی جو نکور محسوس کی وہ میری زندگی کا سرمایہ ہے بانو آپا بھی ان کے ساتھ تھیں وہ جتنے روز یہاں رہے مجھے یہ محسوس ہوتا رہا جیسے میں بچپن کی خوشگوار فضاؤں میں سانس لے رہا ہوں۔ ان کے لہجے میں اس قدر محبت اور شفقت ہوتی تھی کہ میں سرشار ہو جاتا اور بچوں کی طرح ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیشہ اس شفقت اور محبت سے نوازا۔

ان کا ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والا پروگرام زاویہ غیر ملک میں مقیم پاکستانیوں کے لئے خاص طور پر کشش ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کی بصیرت افروز گفتگو اہل مشرق کے لئے رہنمائی کا فریضہ تو انجام دیتی ہی ہے۔ اہل مغرب کے لئے بھی انتہائی لازمی ہے۔ کیونکہ وہ ذہنی اور روحانی مسائل جو اہل مغرب کو درپیش ہیں ان کا حل انہی کی گفتگو میں نظر آتا ہے۔

کاش کوئی صاحب درد ان پروگراموں کو انگلش میں ڈب کر کے اہل مغرب کو دان کرے جو زندگی کی تمام تر سہولیات میسر ہونے کے باوجود خودکشی پر مائل نظر آتے ہیں اور نہ صرف خود بلکہ دنیا کو بھی سپرد آتش کرنے کے درپے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا سبب یہی ہے کہ وہ روحانی طور پر بنجر ہو چکے ہیں اور اشفاق صاحب کی گفتگو ایسی ہی بنجر زمینوں کو سرسبز و شاداب کرنے پر قادر ہے۔

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کے جانے پر

عدنان شاہد
(ردِ عمل)

مرحوم اشفاق احمد کی وفات پر یہ کہنا کہ

''اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا''

بہت چھوٹی بات لگتی ہے۔ جن لوگوں کو محترم اشفاق احمد سے شرف نیاز حاصل تھا' وہ بخوبی یہ بات جانتے ہیں کہ اس ایک رسمی جملے سے وہ بہت بڑے آدمی تھے۔

بچپن میں ''ایک محبت سو افسانے'' کے ڈراموں سے لے کر مرحوم اشفاق احمد کے افسانوں تک بہت کچھ پڑھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے جس حصے میں یہ سارے تجربے ہوئے وہ شاید اس قابل ہی نہ تھا کہ مرحوم کی باتیں سمجھ میں آسکتیں۔ اب جب کہ ان کے پرانے ڈرامے اور افسانے اور تحریریں سمجھ میں آنے لگیں اور ان سے تقریب ملاقات بھی ٹھہری تو وہ اس سفر پر روانہ ہو گئے جس سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

1992ء میں روزنامہ خبریں کا اجراء ہوا تو ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اس کی پالیسی یہ طے کی کہ ہم ان کی خبر چھاپیں گے جن کی کوئی خبر نہیں دیتا۔ اپنی خبروں' اپنے کالموں کے ذریعے ان لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کریں گے جن کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ صرف چند حروف چھاپ دینے سے آگے جا کر اخبار کے صفحات کو سوشل ورک کے لئے استعمال کریں گے۔ اشفاق احمد صاحب کے فین اور چاہنے والے تو ہم پہلے تھے۔ پھر انہی دنوں اتفاق سے ان کی کتاب ''سفر در سفر'' ایک مرتبہ پھر زیر مطالعہ آئی۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کرتے ہیں:

میں نے کہا ''عمر! جب تک میں نے صوفی ازم کے بارے میں کچھ نہ پڑھا تھا اور تصوف کے بارے میں علم حاصل نہ کیا تھا میری بھی یہی سوچ تھی جو تمہاری ہے اور ایک میں کیا ہر شریف آدمی اور پڑھے لکھے مہذب آدمی کی یہی سوچ ہے' لیکن اس علم پر ایک دو کتابیں پڑھنے

کے بعد اور ان سے کچھ حاصل نہ کر سکنے کے بعد میں ان بابوں اور بزرگوں کی تلاش میں نکلا جو ہمارے علم' ہماری دھرتی' ہماری سائیکی اور ہماری مٹی سے تعلق رکھتے ہیں' جن کے پاس ہمارے لوگوں کا علم اور وراثت ہے''۔

یہ ''جو پیر فقیر ہوتے ہیں'' ۔عمر نے سر جھٹک کر کہا'' روپے دو گنے کرنے والے؟''

'' یہ بھی اور ان کے علاوہ دوسرے بھی جو بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے ہیں' داڑھی کو مہندی لگاتے ہیں' ہاتھ میں چھڑی رکھتے ہیں' ڈکار لیتے ہوئے ایکسکلیوزمی کے بجائے الحمد اللہ کہتے ہیں اور پرانی قسم کے حنائی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں' استنجا کرتے ہیں' مصافحہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ سینے پر لگاتے ہیں''۔

''تمہیں کیا ضرورت آپڑی تھی ان لوگوں سے ملنے کی؟'' مسعود نے پوچھا

''اس لئے'' میں نے کہا'' کہ میں ٹائم' لائف' نیوز ویک' سویٹ نیوز اور ریڈرز ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کر تنگ آچکا تھا اور میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں ان بابوں کی بات بھی سنوں جنہیں میں اور میرا باپ اور میرے بھائی بہنیں کئی سال ہوئے گاؤں میں چھوڑ آئے تھے۔ دراصل میں اپنے لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ میں ہر ہفتے'' حلقے'' میں جا جا کر اداس ہو گیا تھا''۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' مفتی نے پوچھا۔

''یہ مفتی جی 1964ء اور 1965ء کی درمیانی مدت کا ذکر ہے۔ میں نے اپنا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈ لیا اور لائلپور' سالاروالا' گولڑہ شریف اور پاکپتن شریف کے چکر لگانے لگا کہ شاید یہاں مجھے کوئی ایسا بابا مل جائے جس کے پاس ہمارے لوگوں کا اصل علم ہو۔ وہ علم نہ ہو جو مودودی صاحب اور پرویز صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب اور ادارہ ثقافت اسلامیہ اور جامعہ اشرفیہ اور اقبال اکیڈیمیوں کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سفر وسیلہ ظفر کے دوران مجھے چند اصلی بابوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو کتابی علم نہ رکھتے تھے۔ پنجابی کے سوا اور کوئی زبان نہ جانتے تھے۔ تبحر علمی سے نا آشنا تھے۔ شخصیت کے اعتبار سے بڑے سادہ اور لہجے اور اظہار کے بڑے نرم تھے۔ میں نے ان سے کچھ باتیں سنیں۔ کچھ باتیں ان میں دیکھیں۔ کچھ مجھے سمجھ آیا' باقی کا سارا میرے پلے نہیں پڑا۔

''لاہور میں جب میں نے ایک بابا سے کہا کہ میں صوفی ہونا چاہتا ہوں تو انہوں نے پوچھا کس لئے؟ میں نے کہا کہ''اس لئے کہ یہ مجھے پسند ہے''۔ آپ نے کہا ''مشکل کام ہے سوچ لو''۔ میں نے عرض کیا''اب مشکل نہیں رہا کیونکہ اس کی پرائمری اور مڈل پاس کر چکا ہوں۔ پاس انفاس نفی اثبات، کا ورد کر لیتا ہوں۔ اسم ذات کے عمل کی بھی پریکٹس ہے''آگے کے راستے معلوم نہیں' وہ آپ سے پوچھنے آیا ہوں اور آپ کی گائیڈنس چاہتا ہوں''۔

بابا نے ہنس کر کہا تو پھر تم روحانی طاقت حاصل کرنا چاہتے۔ صوفی نہیں بننا چاہتے ہو۔ میں نے کہا ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ کہنے لگا روحانی طاقت حاصل کرنے کا مقصد صرف خرق عادات یعنی کرامات کا حصول ہے اور یہ طاقت چند مشقوں اور ریاضتوں سے پیدا ہو سکتی ہے' لیکن تصوف کا مقصد کچھ اور ہے؟ وہ کیا؟ میں نے پوچھا تو بابا نے کہا تصوف کا مقصد خدمت خلق اور مخلوق خدا کی بہتری میں لگے رہنا ہے۔ مخلوق اللہ سے دور رہنا رہبانیت ہے اور اللہ کی مخلوق میں اللہ کے لئے رہنا یہ پاکی ہے اور دین ہے۔ مجھے اس بابا کی یہ بات اچھی نہ لگی' بے چارہ بینڈو بابا تھا اور اس کا علم محدود تھا۔ میں اٹھ کر آنے لگا تو کہنے لگا روٹی کھا کر جانا۔ میں نے کہا جی کوئی بات نہیں میں ساہیوال پہنچ کر کھالوں گا۔ کہنے لگا خدمت سعادت ہے' ہمیں اس سے محروم نہ کرو۔ میں طوعاً و کرہاً بیٹھ گیا۔ بابا اندر سے رکابی اور پیالی لے آیا پھر اس نے دیگچے سے شوربا نکال کر پیالی میں ڈالا اور دال رکابی میں' چنگیر سے مجھے ایک روٹی نکال کر دی جسے میں ہاتھ میں پکڑ کر کھانے لگا وہاں مکھیاں کافی تھیں۔ بار بار' ایمو لیک کر حملے کرتی تھیں۔ بابا میرے سامنے بیٹھ کر مکھیاں اڑانے کے لئے کندوری ہلانے لگا اور میں روٹی کھاتا رہا۔

اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ کونے میں اس کے مریدوں اور چیلوں نے تھوڑی سی جگہ لیپ پوت کر کے ایک مسجد سی بنا رکھی تھی۔ وہاں دس بارہ آدمیوں کی جماعت کھڑی ہوگئی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی ندامت ہوئی کہ میں روٹی کھا رہا ہوں اور پیر مکھیاں جھل رہا ہے۔ میں نے کہا بابا جی آپ نماز پڑھیں۔ کہنے لگے آپ کھائیں۔ میں نے کہا جی مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے آپ جا کر نماز پڑھیں۔ مسکرا کر بولے' کوئی بات نہیں آپ کھانا کھائیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کہا

جناب عالی' انہوں نے نیت بھی باندھ لی ہے آپ نماز ادا کرلیں قضا ہو جائے گی۔ بابا ہنس کر بولا! نماز کی قضا ہے بیٹا خدمت کی کوئی قضا نہیں آپ آرام سے روٹی کھائیں......

''میں اس جیسے تین بابوں سے تین مختلف جگہوں میں ملا اور ہر جگہ سے مجھے مایوسی ہوئی۔ نہ کسی نے کوئی ورد بتلایا نہ وظیفہ سکھایا نہ اسم اعظم کی ترکیب بتائی۔ بس یہی حکم دیا کہ خلق خدا کی خدمت کرو۔ ان کے درمیان رہو' تصوف کی منزلیں خود بخود طے ہوتی چلی جائیں گی۔ میں نے اس علم کو بے کار اور بوگس جان کر پھر ٹائم' نیوز ویک اور سوویٹ نیوز کا مطالعہ شروع کر دیا۔

یہ حصہ پڑھ کر ہم بوکھلا گئے۔ ارے' تصوف کی منزلیں طے کرنا اتنا آسان ہے یہ تو ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔ یوں لگا جیسے ''خبریں'' کی پالیسی تو خود بخود اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس لائن پہ سیٹ ہو گئی جس کا در پردہ ذکر اشفاق مرحوم نے کیا یعنی یہ کہ اللہ تک پہنچنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق کی خدمت کرو۔ وہ دن اور آج کا دن' اپنی ذات کی حد تک' اپنے ضمیر کی حد تک' اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ناظر جان کر ہمیشہ یہی کوشش کی کہ ہمارے قلم سے کسی کا بھلا ہو جائے یا پھر بھلا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور یہ جذبہ' یہ امید پیدا کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ مرحوم اشفاق احمد کا اور ان کی تحریروں کا ہے۔

جو لوگ مرحوم اشفاق احمد کو اپنا پیر جانتے تھے یا ان سے پرانی دوستی اور قلبی تعلق رکھتے تھے یا وہ جو ان کو ایک بہت نیک آدمی کے طور پر جانتے تھے یا وہ جو ان کو بہت بڑا فلاسفر سمجھتے تھے' سب ہم سے بہتر ہیں۔ ہم تو وہ ہیں جو مرحوم سے ایک ایسی عقیدت رکھتے ہیں جس کا تعلق آپ کی تحریر و تقریر سے ہے۔ ہم نے نہ تو آپ کے ساتھ بلا توقف کلام پر مبنی کئی گھنٹوں کی نشست کی' نہ ہی ان کا پروگرام ''زاویہ'' خود جا کر سنا' لیکن خدا شاہد ہے کہ جب کبھی زمانے کے ہاتھوں ستائے گئے یا حادثات نے دل کو رنج دیا تو مرحوم کی کتابوں اور تحریروں نے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ صحیح عمل کرنے والے تو پیر کسی اور چیز کو جانتے ہیں یقیناً ان سب بزرگوں کا علم اور تجربہ ہم سے برتر اور بہتر ہے لیکن اپنی معمولی سے عقل کے تحت ہم تو مرحوم اشفاق احمد کو اپنا پیر اور استاد جانتے تھے۔ آج ہمارا پیر' ہمارا استاد ہمیں راستہ دکھانے والا نہ رہا۔

جس سے چند ملاقاتوں کے علاوہ ہمارا تعلق ہی نہ تھا لیکن جس کے قلم نے ہمیں قلم پکڑنا اور اس کو صحیح استعمال کرنا سکھایا آج وہی نہ رہا۔ خدا جانے ہماری محترمہ بانو آپا کس حال میں ہیں اور کیسے اس دکھ کو برداشت کر رہی ہیں۔ شاید دین پر صحیح عمل کرنے والے نیک لوگوں کی طرح انہیں اللہ تعالیٰ صبر کرنے کا ڈھنگ سمجھا دے۔ لیکن ہم جیسے بے عمل زبانی کلامی لوگوں کے پاس تو وہ راستہ بھی نہیں۔

مرحوم کے ریڈیو پروگرام تلقین شاہ کا ایک کردار تھا 'ہدایت'۔ تلقین شاہ اسے اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے اور وہ تھا کہ مستقل حماقتیں اور بے وقوفی کی باتیں کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر تلقین شاہ اسے بڑی محبت سے ایک جملہ کہتے تھے کہ "وے ہدایتیا' وے بے ہدایت ہی رہیا توں" (او بے ہدایت تو ہمیشہ بے ہدایت ہی رہا)۔ خدا جانے کیوں ہم نے ہمیشہ خود کو ہدایت جیسا ہی پایا۔

ہمیں پیار سے محبت سے "تلقین" کرنے والا شاہ جی تو نہیں رہے۔ ہے کوئی جو ہم جیسے "بے ہدایتے" کو ہدایت کر دے اور آگے کا راستہ سمجھا دے۔

روزنامہ "خبریں" لاہور

8 ستمبر 2004ء

''تلقین شاہ'' نہیں رہے

خالد منہاس

(عالم تمام)

اس وقت لاہور ہی نہیں پورا ملک سوگوار ہے۔ جو لوگ کتابیں پڑھتے ہیں وہ تو کچھ زیادہ ہی دل گرفتہ ہیں اور جو لوگ ٹی وی دیکھتے ہیں وہ بھی جگر تھامے بیٹھے ہیں۔ یہ خبر ہم سب کے لئے قیامت سے کم نہیں کہ اشفاق احمد اب ہم میں نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔ انہیں لحد میں اتار دیا گیا ہے' مگر پھر بھی نہ جانے کیوں دل اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں' جن کا اشفاق احمد سے ٹی وی اور کتاب کے ذریعے ایک رشتہ موجود تھا۔ وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کا گر جانتے تھے۔

ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ پیدائشی طور پر داستان گو تھے۔ ایسے لوگ اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ بات کو ادھر ادھر سے گھما پھرا کر کسی خاص موضوع کی طرف لے جانا ان کا بڑا کمال تھا۔ شاید اسی لئے انہوں نے لاہور میں اپنے گھر کا نام ''داستان سرائے'' رکھا تھا۔ اس فطری صلاحیت کو انہوں نے اپنی تحریروں میں بھی کمال خوبی سے استعمال کیا۔ چھوٹے چھوٹے جملوں اور عام سے انداز میں وہ ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے' جس سے انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی کئی حیثیتیں تھیں یا انہوں نے اپنی ہر حیثیت کو منوایا۔

شاید ان جیسے لوگوں کے لئے ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کہا گیا ہے۔ ایک سال تک جگر کے عارضے میں مبتلا رہنے کے بعد وہ اناسی سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ 22 اگست 1925ء کو مکیسر فیروز پور (بھارت) میں پیدا ہونے والے اشفاق احمد کو زندگی میں بہت عروج ملا۔ ویٹرنری ڈاکٹر محمد خان کے گھر پیدا ہونے والے اشفاق احمد نے ابتدائی تعلیم مکیسر

میں حاصل کی اور 1947ء میں پاکستان ہجرت کر کے آئے۔ یہاں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ایم اے اردو کیا۔ بعدازاں دیال سنگھ کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ 1953ء میں روم یونیورسٹی (اٹلی) میں اردو کے پروفیسر لگ گئے اور اس کے ساتھ ہی ریڈیو روم سے پروگرام بھی کرتے رہے۔ اٹلی کی روم یونیورسٹی اور گرے نوبلے یونیورسٹی فرانس سے اطالوی اور فرانسیسی زبان میں ڈپلومے کئے اور نیویارک یونیورسٹی سے براڈ کاسٹنگ کی خصوصی تربیت حاصل کی۔

پاکستان واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک ادبی مجلہ ''داستان گو'' کے نام سے جاری کیا' جو اردو کے آفسٹ طباعت میں چھپنے والے ابتدائی رسالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دو سال تک ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کی ادارت بھی کی۔ 1967ء میں مرکزی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے' جو بعدازاں اردو سائنس بورڈ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ 1979ء تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے انہیں وفاقی وزارت تعلیم کا مشیر بھی مقرر کیا۔

ان کی شہرت کا سبب افسانہ ''گڈریا'' بنا۔ یہ افسانہ 1953ء میں لکھا گیا۔ ان کا انداز تحریر انتہائی شگفتہ تھا جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ اردو ادب میں کہانی لکھنے کے فن پر اشفاق احمد کو جتنا عبور تھا' وہ کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ ''ایک محبت سو افسانے'' اور ''اجلے پھول'' ان کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے ہیں۔ بعدازاں سفر در سفر (سفر نامہ) کھیل کہانی (ناول) ایک محبت سو افسانے (ڈرامے اور توتا کہانی (ڈرامے) بہت مشہور ہوئے۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن نشریات 1964ء میں شروع ہوئیں۔ اس سے پہلے ریڈیو ایک طاقتور ترین میڈیا تھا اور اس کی آواز ملک کے طول و عرض میں پہنچتی تھی۔ 1965ء میں اشفاق احمد نے ریڈیو کے لئے پروگرام ''تلقین شاہ'' شروع کیا۔ یہ ایک ہفتہ وار پروگرام تھا اور لوگ بے چینی سے اس کا انتظار کرتے تھے۔ اچھے مزاح اور ذو معنی گفتگو کے باعث یہ پروگرام مقبول ہوتا گیا اور 30 سال تک ریڈیو سے نشر ہوتا رہا۔ ستر کی دہائی میں اشفاق احمد نے معاشرتی اور رومانوی موضوعات پر ایک ''ایک محبت سو افسانے'' کے نام سے ڈرامہ سیریز شروع کی۔ اسی کی دہائی میں ''توتا کہانی'' اور ''من چلے کا سودا'' میں وہ تصوف کی طرف مائل ہوئے تو ان پر خاصی تنقید ہوئی۔ انہوں نے جب

تو تا کہانی لکھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ وہ اردو غلط لکھ رہے ہیں' کیونکہ ط سے طوطا ہی پڑھا تھا۔ تحقیق ہوئی تو علم ہوا کہ ت سے تو تا بھی درست ہے۔ اب اشفاق احمد کی وجہ سے بہت سے لوگ ت سے تو تا لکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام ''زاویے'' شروع کیا۔ اس پروگرام میں وہ اکثر قصے کہانیاں سنا کر اپنے ناظرین اور حاضرین کو ایک نتیجے کی طرف لے جاتے تھے۔ ''نخریں'' نے ان کے پروگرام مرتب کر کے ادارتی صفحہ پر چھاپنا شروع کئے تو لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ وہ اپنی گفتگو میں بابوں کا ذکر اکثر کرتے تھے' حالانکہ وہ خود اس دور کے ایک بابے تھے اور لوگ ان سے ملتے اس لئے تھے کہ ان سے اچھی باتیں سنیں گے۔ انہوں نے زاویے کے تحت ایک پروگرام کیا ''میں کون ہوں'' اس کا ایک اقتباس دیکھئے۔

آپ کے جتنے بھی ایم این اے اور ایم پی اے ہیں' یہ ہمارے بارے میں بیٹھ کر فیصلے کرتے ہیں' لیکن وہ خود یہ نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں؟ یہ ایسے تیراک ہیں' جو ہم کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن ان کو خود تیرنا نہیں آتا۔ سیکھا ہی نہیں انہوں نے۔ جو گہری نظر رکھنے والے ہیں' وہ جاننا چاہتے ہیں۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کبھی اگر آپ نے غور کیا ہو یا نہ کیا ہو' لیکن آپ کے لاشعور سے یہ آواز آتی رہتی ہے کہ ''میں کون ہوں؟'' اور ''میں کہاں ہوں'' اور اس سارے معاملے اور کائنات میں کہاں فٹ ہوں' اس کے لئے ہمارے بابوں نے غور کرنے اور سوچنے کے بعد اور بڑے لمبے وقت اور وقت سے گزرنے کے بعد اپنی طرز کا طریق سوچا ہے' جس کے کئی رُخ ہیں۔ آسان لفظوں میں وہ اس نئے طریق کو ''فکر'' یا ''مراقبہ'' کا نام دیتے ہیں۔

اس طرح انہوں نے ایک پروگرام ''پنجاب کا دوپٹہ'' کے نام سے کیا جس میں انہوں نے خوبصورت انداز میں کہانی سنائی اور پنجاب اور سندھ سمیت سارے صوبوں کی یگانگت کی بات کی۔ دیکھئے انہوں نے کتنی خوبصورتی سے بات کی ہے۔

''صبح چلتے ہوئے میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ جب تک پنجاب کا دوپٹہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کندھے سے بندھا ہے پنجاب اور سندھ میں کسی قسم کا کریک نہیں آ سکتا۔ یہ تو اپنے مقصد کے لئے آئی ہے نا' لیکن مقصد سے ماورا بھی ایک اور رشتہ ہوتا ہے۔ میری بیوی کہنے

گی' کیوں نہیں' آپ روز ایسی خبریں پڑھتے ہیں کہ یہ سندھ کارڈ ہے' یہ پنجاب کارڈ ہے۔ جب ایک چودھری دیکھتا ہے کہ لوگوں کی توجہ میری اوپر ہونے لگی ہے اور لوگ میرے بارے میں Critical ہونے لگے ہیں' تو پھر وہ کہتا ہے اے لوگو! میری طرف نہ دیکھو۔ تمہارا چور پنجاب ہے۔ دوسرا کہتا ہے' نہیں! میری جانب نہ دیکھو تمہارا چور سندھ ہے' تاکہ اس کے اوپر سے نگاہیں ہٹیں' ورنہ لوگوں کے درمیان وہی اصل رشتہ قائم ہے' جو ملتان یا بہاولپور سے جانے والی لڑکی کا شاہ کے مزار سے ہے' جو اکیلی' تن تنہا' سوجے پاؤں' بغیر کسی خوراک کے کھڑی ہوئی ہے اور اس کا اعتقاد اور پورا ایمان ہے کہ اس کا مسئلہ حل ہوگا۔ اپنی ایک نظم میں شاہ فرماتے ہیں کہ "اے کمان کسنے والے تو نے اس میں تیر رکھ لیا ہے اور تو مجھے مارنے لگا ہے' لیکن میرا تو سارا وجود ہی تیرا ہے' کہیں تو اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچالے"۔

میں نے پہلے ہی کہا کہ وہ اپنے پروگراموں میں بابوں کا ذکر اکثر کرتے تھے۔ لوگ انہیں فون کرکے اور جب ہم نے "خبریں" میں ان کا پروگرام مرتب کرکے شائع کرنے شروع کئے تو خط لکھتے کہ انہیں کسی بابے کا پتہ دے دیا جائے۔ انہوں نے ایک پروگرام "خوشی کا راز" کیا' جس میں انہوں نے بابوں کا پتہ بتادیا۔ ملاحظہ ہو:

"خوشی تو ایسی چڑیا ہے جو آپ کی کوشش کے بغیر آپ کے دامن پر اتر آتی ہے۔ اس کے لئے آپ نے کوشش بھی نہیں کی ہوتی' تیار بھی نہیں ہوئے ہوتے' لیکن وہ آجاتی ہے۔ گویا اس رُخ پر جانے کے لئے جس کی آپ آرزو رکھتے ہیں' جو کہ بہت اچھی آرزو ہے' کیونکہ روحانیت کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا' مگر جب تک اسے تلاش نہیں کرے گا' جب تک وہ راستہ یا پگڈنڈی اختیار نہیں کرے گا' اس وقت تک اسے اپنے مکمل ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ انسان یہ کوشش کرتا ضرور ہے' لیکن اس کی Methodology مختلف ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی چیزوں سے بڑی کی جانب نہیں جاتا۔ آپ جب ایک بار یہ فن سیکھ جائیں گے' پھر آپ کو کسی بابے کا ایڈریس لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پھر وہ چھوٹی چیز آپ کے اندر بڑا بابا بن کر سامنے آجائے گی اور آپ سے ہاتھ ملا کر آپ کی گائیڈ بن جائے گی اور آپ کو اس منزل پر یقیناً لے جائے گی' جہاں آپ

جانے کے آرزومند ہیں''۔

ان کی ساری زندگی تلقین کرتے گزری۔ افسوس آج تلقین شاہ ہم میں نہیں رہے۔ ہمارے درمیان ایک بابا رہتا تھا' آج وہ ہم میں نہیں رہا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کا خلا دور دور تک پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ ان کی باتیں سن کر دل کا درد ہلکا ہو جاتا تھا' مگر آج ان کی وفات کی خبر سے دل گرفتہ ہو گیا ہے۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور
8 ستمبر 2004ء

میرے مرنے پر کیا ہوگا......؟

مرحوم اشفاق احمد کی کتاب
''سفر در سفر'' سے اقتباس

مفتی نے کہا ''اور اگر تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ میرے مر جانے کے بعد کیا ہوگا تو سوچو کہ تم سے پہلے جو مر گئے ان کے چلے جانے کے بعد کیا ہوا''۔

''واہ مفتی واہ'' مسعود نے سر ہلا کر کہا اور اس کا سر پوست کے ڈوڈے کی طرح دیر تک ہلتا رہا۔

''یہ فقرہ مفتی جی کا نہیں''۔ عماد آہستگی سے بولا ''ذوالنون'' مصری کا ہے' کیوں جی؟''

لیکن مفتی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں اپنی موت کے غم میں اندر سے اس قدر بھر گیا کہ میرے آنسو نکل آئے یعنی مرنے کے بعد کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ریڈیو اسٹیشن لاہور کا نیا ریڈیو سٹیشن اسی طرح چلتا رہے اور اس کی پہلی' دوسری اور تیسری ٹرانسمشن کی ابتداء اخلاق احمد دہلوی' عزیز الرحمان اور نسرین محمود اسی طرح کرتے رہیں گے۔ اپنے اسی مخصوص انداز میں' اسی خاص لہجے میں' وہی کپڑے پہنے ہوئے' کتنے ظلم کی بات ہے' وہ ریڈیو سٹیشن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے نہیں لگ جائیں گے اور میری کمی محسوس نہیں کریں گے ضرور کریں گے' میرے دل نے کہا اور مجھے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ باہر کے لوگوں کے بارے میں تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا' لیکن لاہور کے لوگ اس کمی کو ضرور محسوس کریں گے' شدت سے کریں اور پھر دیر تک کرتے رہیں گے' شاید کئی سالوں تک' بہت ممکن ہے ساری عمر۔ آخر میرا مر جانا اور ختم ہو جانا اور اس جہاں سے چلے جانا کوئی معمولی بات تھوڑی ہوگی۔ ایک عام ادیب اور فنکار مر جاتا ہے تو ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ میں تو پھر کئی حلقوں کا محبوب ہوں۔ قارئین کا محبوب' سامعین کا محبوب' ناظرین کا محبوب ہوں' یہ سب لوگ میرے بغیر کس طرح سے زندہ رہ سکیں گے اور راتوں

کو سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنے اپنے بستر جھاڑ کر اور اپنے تکیے سیدھے کر کے آرام سے کیسے سو جایا کریں گے بھلا؟

پھر مجھے آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ مجھے یاد بھی نہ رہا کہ میں چل رہا ہوں یا کھڑا ہوں' بیٹھا ہوں یا پتھر سے ٹیک لگا کر سوچ رہا ہوں' گھر میں ہوں یا راستے پر ہوں۔ سفر ہے یا حضر ہے۔ وجود مٹ گیا اور اہمیت کا بت ایستادہ رہ گیا۔ بہت بڑا بت' تانبے' رانگ اور پیتل کی دھات کا مرکب' سر سے پاؤں تک چمکتا ہوا' دھوپ میں چمکتا ہوا' برگد کے کئی سو سالہ پیڑ کے نیچے جرنیلی سڑک سے میل سوا میل دور درختوں کے ایک وسیع جھنڈ کے پاس۔

ابھی مجھے اس جہان سے گزرے دو گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ خبر سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن پہنچے گی۔ شام کا وقت ہو گا اور سٹیشن کے اندر اور باہر بڑی خاموشی ہو گی۔ پروگرام سٹاف کے لوگ جا چکے ہوں گے۔ ٹرانسمشن ڈیوٹی کا سٹاف سٹوڈیو کی طرف مصروف عمل ہو گا۔ چوہدری بشیر کسی ضروری کام سے دفتر آئے ہوں گے یا نہیں آئے ہوں گے' لیکن اکرم بٹ اپنے کمرے میں موجود ہو گا اس کے لئے یہ خبر کافی تکلیف دہ ہو گی۔ وہ اپنے ان تمام دوستوں کو فون کرے گا اور ہر ایک سے ایک ہی بات کہے گا کہ "سنا ہے اشفاق صاحب ہمارے ساتھ کیا ظلم کر گئے"۔ اور پھر اس کے بعد اسے وہ دن ایک ایک کر کے یاد آتے جائیں گے جب ہم پرانے سٹیشن پر گیراج کینٹین میں' سٹوڈیو میں' اپنے اپنے کمروں میں' برآمدوں میں' لان پر' ڈی سی پی کے اندر ریہرسل سے پہلے اور ریہرسل کے بعد بیٹھا کرتے تھے' ملا کرتے تھے' بولا کرتے تھے اور محبتیں کیا کرتے تھے اور ہمارے اندر کمال محبت کے باوجود دوری کا احساس رہا کرتا تھا۔

پھر ڈیوٹی روم میں راولپنڈی سے مسعود کا فون آئے گا اور چپڑاسی بھاگا بھاگا اکرم بٹ کو بلا کر لے جائے گا اور ان دونوں کے درمیان بڑی درد بھری باتیں ہوں گی۔ مسعود چونکہ مجھے پہلے سے جانتا ہے اور ہماری دوستی کے سالوں کا وقفہ طویل ہے' اس لئے ایک سینئر کی حیثیت سے وہ اکرم بٹ پر حاوی رہے گا۔ وہ مری اور آزاد کشمیر اور راولپنڈی کے قیام کی باتیں زیادہ کرے گا اور اکرم بٹ اس کا ماتحت ہونے کی حیثیت سے اور دوسرے اس کے مقابلے میں مجھے کم مدت سے

لئے جانے کی وجہ سے دبا دبا سا رہے گا اور ''بس جی مسعود صاحب' بس جی ...... حد کر گئے خان صاحب ...... کمر توڑ گئے وغیرہ ہی کہتا رہے گا۔ پھر ان دونوں کے درمیان شام سوا آٹھ بجے خصوصی پروگرام کی بات ہوگی اور اکرم کہے گا ''میں نے بندوبست کرنا شروع کر دیا ہے۔ گاڑی ابھی آتی ہے اور میں لوگوں کو جمع کرتا ہوں۔ کتنا وقت رکھیں؟'' پندرہ منٹ کافی ہیں مسعود کہے گا۔

''ناں جی پندرہ منٹ تو کچھ بھی نہیں مسعود صاحب' خان صاحب ادیب بھی تھے براڈ کاسٹر بھی تھے' سرکاری ملازم بھی تھے' پیارے دوست بھی تھے' پندرہ منٹ تو بہت کم ہیں''۔

''تو پھر سوچ تو ہم تو یہاں پندرہ منٹ کا پروگرام ہی کر رہے ہیں۔ تین منٹ کا چنک شہاب صاحب کا ہے' وہ ہم نے ریکارڈ کر لیا ہے۔ ساڑھے آٹھ منٹ کی تقریر مفتی صاحب کی ہے۔ انہوں نے بڑے انوکھے انداز میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے۔ تین ساڑھے تین منٹ میرے ہیں۔ باقی وقت عمر اور کلیم نے لیا ہے''۔

کلیم جی کون؟

''او یار عطا حسین کلیم' اس کے ساتھ بھی بڑے تعلقات تھے اشفاق کے''۔

''ہم تو پھر آدھ گھنٹہ لیں گے مسعود صاحب' لاہور سٹیشن کا بڑا ستون تھا'' تمکین شاہ۔ وسکری پینسی ''اس کے لئے تو آدھ گھنٹہ بھی ناکافی ہے''۔

ٹھیک ہے دیکھ لو۔ زیڈ اے بخاری سے زیادہ ٹائم نہ مل جائے ورنہ اعتراض ہوگا۔ وسکریپنسی ٹھیک نہیں ہوتی۔

وہ تو سب مانتا ہوں مسعود صاحب' لیکن ہمارا بھی تو دل ہے۔ یہاں لوگ ان کی عزت ہی نہیں کرتے تھے' ان سے محبت بھی کرتے تھے۔

کیا کہنے یار اس کے' اب ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔ نظامی صاحب گئے' محمد حسین چلا گیا' اب یہ بھی دھوکہ دے گیا۔ ویسے یار اکرم بٹ ہمارے ساتھ کے لوگ جا رہے ہیں ایک ایک کر کے۔

''ہاں سر اب اندر گھنٹی بجنے لگی ہے اور دوسری بات یہ ہے ...... مسعود صاحب کہ ''اچھا میں بھول نہ جاؤں' تمہارے پاس اس کی آواز کا کوئی ٹیپ تو ہوگا؟''

''لعنت ہو جی مسعود صاحب ان نئے نئے پروڈیوسروں پر سارے ٹیپ ای ریز کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ کون سی چیز کس وقت کے لئے سنبھال کر رکھنی ہے۔ میرے پاس ایک ذاتی ٹیپ ہے جس میں اشفاق صاحب کی آواز محفوظ ہے۔ کوئی ڈسکشن تھی۔ ہماری ثقافت قسم کی۔ اس میں کافی بولے ہیں اور اچھا چنک ہے''۔

''تو پھر ہم کو بھی لائنوں پر ریکارڈ کرا دو''۔

''آپ ٹرانس کرپشن سے لیں مسعود صاحب' ان کے پاس خان صاحب کا دو گھنٹے کا پروگرام محفوظ ہے۔ ایک افسانہ پڑھا ہے انہوں نے اپنی آواز میں۔ اور میری ایپلی کیشن کو ایسے نہیں پھینک دینا مسعود صاحب میں نے ایک کاپی ڈائریکٹ اسی لئے آپ کے نام بھیجی ہے''۔

''وہ بھی ہو جائے گا میاں' یہ کوئی وقت ہے۔ تم بس ایک پروگرام کر دو' اچھا سا یادگار' ہمارا یار تھا' اس کے لئے اتنا بھی نہ کر سکے تو پھر لعنت ہے ہم پر''۔

''آپ بے فکر رہیں جی' ایک مرتبہ تو لوگوں کے آنسو نکل آئیں گے''۔

''شاباش' لاہور سٹیشن کی روایت قائم رہنی چاہئے...... اچھا بھئی''۔

''ایک منٹ سر...... مسعود صاحب...... ہیلو...... ہیلو...... ہاں جی...... نیوز میں اشفاق صاحب کی خبر آ رہی ہے یا نہیں''۔

''آ رہی ہے' آنی کیوں نہیں تھی۔ یہ اس کا حق ہے' نیشنل نیوز بلٹن میں آئے گی۔ جی ایم اثر اس کا یار ہے۔ اس نے بڑی اچھی سٹوری بنائی ہے' بہت رو رہا تھا بیچارہ''۔

خان صاحب تو اس کے شاگرد بھی رہے ہیں شاید۔

''شاگرد کیا' وہ بھی ٹھیک ہے' لیکن بڑے گہرے دوست تھے۔ قلبی' نہایت قریبی' اچھا بھئی''۔

''اچھا سر خدا حافظ''۔

پھر اکرم بٹ کو' ریاض محمود کو' ظہیر صدیقی کو اور قدیر ملک کو پروگرام تیار کرنے کی بھسوڑی پڑے گی۔ جب وقت کم ہو اور پروگرام زیادہ فیڈ کرنا ہو تو ہمیشہ مشکل پڑ جایا کرتی ہے۔

میں جانتا ہوں وہ کافی پریشان ہوں گے اور لوگوں کی بے وقت موت پر ہم اسی طرح پریشان ہوا کرتے تھے۔ صوفی تبسم بیچارے کمن آباد ہی میں رہتے ہیں اس لئے صوفی صاحب کو لانے والی گاڑی انہیں بھی ساتھ ہی لیتی آئے گی۔ اے حمید بھی کمن آباد رہتا ہے لیکن جب وہ یہ خبر سنے گا تو دکھ سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے اور وہ رکی گفتگو کرنے پر لعنت بھیجتا ہوا آنے سے انکار کر دے گا اور پھر وہ اور ریحانہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ان دنوں کو یاد کرنے لگیں گے جب قدسیہ اور میں پہلی مرتبہ ان کے گھر اپنی میوہ منڈی کے قریب گئے تھے۔ بانو نے ریحانہ سے ان چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی بڑی تعریف کی تھی اور جن میں اے حمید نے ہمیں کشمیری چائے پلائی تھی اور اے حمید نے الماری سے ساری پیالیاں نکال کر انہیں اخباری کاغذوں میں لپیٹ کر بانو قدسیہ کے حوالے کر دی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا' بس بس اب بولیں نہ بالکل اور بانو نے بھرائی ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

آفتاب احمد کو جب ٹیلی فون پر یہ دلدوز خبر ملے گی تو وہ جی بھر کر روئے گا اور پھر رات بھر روتا ہی رہے گا۔ اس شام ضرور کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے گھر چھوڑنے جائے گا۔ پتہ نہیں آفتاب کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بات بے بات رونے لگتا ہے اور اس کی آنکھیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ پھر میرا گزر جانا تو اس کے لئے قیامت سے کم نہ ہوگا۔ محمد حسین کے فوت ہونے پر اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اور دوسرے بہت سے لوگوں کی آرزو ہوگی کہ ٹی وی پر جو پروگرام ہو وہ قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جائے' لیکن دوسرے لوگوں کو اس میں تامل ہوگا۔ اصل میں وہ اس تامل میں حق بجانب ہوں گے۔ ایک علاقائی ادیب یا علاقائی ٹی وی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنا مناسب بھی نہیں۔ اس سے ایک پریسی ڈینٹ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے علاقوں کے لوگ تقاضا کریں گے کہ اشفاق بیشتل فگر تھا' اس لئے اس کا پروگرام جائز طور پر قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جانا چاہئے۔ دوسرے لوگ جوان سے اتفاق نہیں کریں گے' اپنی دلیل میں شدت اختیار نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہمارے یہاں مرے ہوئے آدمی کو شدت سے کنڈیم کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آخر فیصلہ یہ ہوگا کہ 9 بجے والی خبروں کی تصویری جھلک میں ذرا سا حصہ اس پروگرام کا بھی دکھا دیا

جائے گا جو لاہور ٹی وی نے میری یاد میں کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہو چکنے کے بعد بھی میرے حامی با جرا ان میں اندر کوری ڈور میں کافی دیر تک یہ کہتے پھریں گے۔ یہ سب "اس...... حرامی کی شرارت ہے۔ جب وقت پڑتا تھا تو کیا دست بستہ سکرپٹ لینے اور ڈرامہ لکھوانے چلا جایا کرتا تھا اور اب انکاری ہو گیا ہے"۔

اردو بورڈ کے ملازمین بھی یہ خبر سن کر سکتے میں آ جائیں گے۔ ربانی کا، فضلی کا اور سلطان صاحب کا برا حال ہوگا۔ شریف دین غمزدہ ہوگا لیکن اس کو فکر ہوگی کہ یہ خبر تمام اخباروں میں نمایاں جگہ پر لگ جائے۔ اس کے پاس چونکہ میری پاسپورٹ سائز کی بہت تصویریں مختلف پوزوں میں ہیں اس لئے وہ دفتر پہنچ کر اپنی الماری سے مختلف تصویریں نکالے گا اور ان کی پشت پر اپنی منحنی لکھائی میں اخباروں کے نام لکھے گا۔ اردو اور انگریزی میں سانحہ جانکاہ کا مضمون بنا کر انہیں نفاست سے ٹائپ کرے گا اور اپنے پلے سے رکشا لے کر پہلے سیدھا فضلی کے گھر جائے گا اور پھر وہ دونوں اخباروں کے دفتروں کے چکر لگائیں گے۔

امجد حسین کو فکر ہوگی کہ یہ خبر چوکھٹے کے اندر چھوٹی تصویر کے ساتھ فرنٹ پیج پر آئے۔ اگر ادریس وہاں ہوا تو وہ زور دے گا کہ نیوز کم از کم دو کالمی ہونی چاہیئے۔ انور آرٹسٹ اگر اتفاق سے دفتر میں ہی ہوا تو وہ ادریس کی تائید کرے گا۔ شاہ جی نیوز تیار کریں گے۔ بائیو ڈیٹا شریف الدین اور فضلی فراہم کریں گے۔ میٹر کمپوز ہو جائے گا' لیکن اسلام آباد سے اکونومک کونسل کی ایک خبر آ جانے پر مجبوراً میری خبر کو اخبار کے آخر میں دینا پڑے گا۔ آخری وقت میں میک اپ کے وقت پھر مشکل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ تیسری دنیا کی ایک خبر جو بیک پیج پر کیری اوور ہو رہی ہوگی' وہ میرے لئے وقف جگہ پر حق شفع کر دے گی اور امجد حسین جھلا کر اور مجبور ہو کر میری خبر کو اندر تیسرے صفحے پر لے جانے پر مجبور ہو جائے گا۔

رات کو جب ریڈیو پر میرے انتقال کی خبر نشر ہوگی' تو چنوٹ' جھنگ' ساہیوال' منڈی بہاؤالدین' منڈی عبدو کے' علی اولک وغیرہ کے لوگ کہیں گے' لو جی ایہہ وی ختم ہو گیا۔ بڑا سیانا بندا سی' کیا تلقین شاہ دا روپ بھریا سی' اور بڑی بوڑھیاں یہ خبر سن کر کہیں گی "بابا تلقین شاہ" فوت ہو گیا اے' بن ایہہ

پروگرام کون کریا کرو؟"

حیدر علی نمبردار کہے گا" بن اسیں کی دسیے' ایہہ گورنمنٹ دے کم ایں جدھی مرضی ڈیوٹی لگا دیوے"۔

"ٹھیک اے نمبردار اکم تے چلدے ای رہندے ایں' اج بڑا اسیا نا بابا سی"۔

رات کو جب ٹی وی پر خبر نامہ میں یہ خبر نشر ہوگی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہوگا۔ بہت سے ناظرین آرزومند ہوں گے کہ میرے کسی پرانے پروگرام کی ایک جھلک دکھائی جائے۔ خاص طور پر نکھار پروگرام کی جس میں مہمان امانت علی ہے اور میزبان میں ہوں۔ ٹیلی ویژن والوں کی اس کوتاہی پر ناظرین اپنے اپنے گھروں میں نکتہ چینی بھی کریں گے' لیکن پھر دوسری باتوں میں الجھ جائیں گے۔ کچھ گھروں میں جہاں لکھنے لکھانے اور ٹی وی پروگراموں میں شرکت کا کام ہوتا ہے۔ میری موت پر افسوس کا اظہار کیا جائے گا کہ وہ ایک اچھا فنکار تھا' لیکن اچھا انسان نہیں تھا۔

ٹی وی پر نیوز سننے کے بعد کچھ لوگ گہری سوچ میں ڈوب جائیں گے کہ دیکھیں اب اردو بورڈ کی ڈائریکٹری کس کو ملتی ہے۔ ان میں سے چند ایک کی بیویاں کہیں گی" اب انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ چانس آپ کو ملنا چاہئے۔ آخر آپ نے ساری عمر اردو کی خدمت کی ہے اور اس زبان سے محبت کی ہے"۔

خاوند ٹھنڈی سانس بھر کر کہیں گا" بیگم آج کل خدمت اور محبت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ سب کانٹیکٹس کی بات ہے۔ اب مرحوم کو اردو سے کہاں محبت تھی اور اس نے کس طرح سے اس زبان کی خدمت کی تھی۔ یہ تو تعلقات کی بات ہے"۔

بیوی کہے گی' لیکن ڈرامے بڑے اچھے لکھتا تھا اور باتیں بھی بڑی مزیدار کرتا تھا۔

" بالکل ٹھیک ہے' میاں ایمانداری کے ساتھ جواب دے گا۔ اس کے ہم بھی معترف ہیں' لیکن اس کے لئے اردو بورڈ کی ڈائرکٹری کہاں تک جائز ہے؟ یہ سوال جو معاشرے کے حاکمان وقت سے پوچھا جانا چاہئے۔ یہ سب دھاندلیاں ہیں بیوی اور اس دور میں صحیح لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا"۔

پھر بڑی دیر تک بڑے گھروں میں اردو بورڈ کی ڈائرکٹری کا ذکر ہوتا رہے گا۔ کچھ ایسے لوگوں کو یاد کرنے کی کوششیں ہوں گی جن کے براہ راست حفیظ پیرزادہ سے تعلقات ہوں۔ ایک آدھ ٹیلی فون پی آئی اے کے دفتر بھی ہوگا کہ صبح پہلے جہاز سے اسلام آباد کے لئے سیٹ مل سکتی ہے یا نہیں۔ اس اک ذرا سی خبر سے گھر میں کہرام ہوگا۔ ادبی حلقوں میں محتاط تنقید ہوگی۔ ریڈیو سننے والے دیہاتی حلقوں میں غم ہوگا۔ دوستوں کے درمیان آئندہ کی فکر ہوگی۔ علمی حلقوں میں ہلچل اور منصوبہ بندی ہوگی۔ اردو بورڈ کے ملازمین کو تشویش ہوگی پھر صبح ہوگی اور دکانیں کھلنے لگیں گی اور لوگ دفتروں کو جانے لگیں گے اور بچے مدرسوں کے لئے تیار ہوں گے اور عورتیں منہ دھونے لگیں گی۔

شاہ عالمی میں ایک کراکری مرچنٹ اخبار ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھ دکاندار کے پاس جا کر کہے گا' یار یہ دیکھا تم نے ''تلقین شاہ'' مر گیا بیچارہ۔''

''کب؟'' ساتھ دکاندار بھونچکا ہو کر پوچھے گا۔

''تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ یہ دیکھو اس کی تصویر۔ ایک مرتبہ آئے نہیں تھے ہماری دکان پر سلور کی چلمچی خریدنے وہ اور اس کی بیوی''۔

''وہ اس کی بیوی تھی نیلے سوٹ والی''۔

ہاں' وہ بھی ڈرامے لکھتی ہے۔ اس نے ٹیلی ویژن پر گھوڑے والا ڈرامہ لکھا تھا۔

وہ تو اس کا ڈرامہ تھا تلقین شاہ کا اپنا۔ اس کی بیوی کا دوسرا تھا جس میں ایک آدمی خفیہ طور پر دوسری شادی کر لیتا ہے اور پانچ چھ سال تک اس کی بیوی بچوں کو علم ہی نہیں ہوتا۔'' بڑا ظلم ہوا یار ابھی تو جوان ہی تھا' پچاس سال کا بھی نہیں تھا''۔

پاکستان میں اتنی عمر ہی ہوتی ہے شیخ صاحب' پچاس سال کا آدمی دوسرے کنارے پر لگ جاتا ہے۔ کوئی قسمت والا ہی دس سال اوپر گزارتا ہے۔ پہلے زمانے میں عمریں کافی لمبی ہوتی تھیں۔ اس زمانے کی خوراکیں بھی تو دیکھو' خالص گھی' خالص آٹا' دودھ' دہی' لسی' سادہ غذا' شیر ببروں جیسے لوگ ہوا کرتے تھے' کیا مرد کیا عورتیں۔

ولیت کے لوگ تو اب بھی لال سرخ ہوتے ہیں۔

وہاں بے فکری ہے بھا جی' کوئی بے ایمانی نہیں' رشوت نہیں' بک بک نہیں' سب کام سرکار کرتی ہے۔ لال سرخ تو آپ ہی ہونا ہوا۔

وہ میم پھر نہیں آئی پرانے سیٹ خریدنے والی۔

کمینی بے سالی' آئی تھی ٹوٹی ہوئی پیالی لے کر' کہنے لگی تم نے ٹوٹی ہوئی پیالی رکھ دی پیکنگ میں اس کو تبدیل کر دو۔

تم نے انکار کر دینا تھا۔

''کوئی ویسی عورت ہوتی تو میں انکار بھی کر دیتا۔ ہمارے ملک کا سوال تھا۔ میں نے کہا لاؤ میم صاحب پیالی تبدیل کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے سارے دکاندار ایسے نہیں ہوتے' ہم لوگ دید والے ہیں' مہمان نواز ہیں''۔

''بڑے مہمان تھے بھئی بھائی کے لڑکے کی شادی پر' کوئی ہزار بارہ سو عورتیں بچے ملا کر''۔

بلیک کی یہی تو برکت ہے شیخ صاحب' ایک نانواں' دوسرے عزت' تیسرے تعلقات۔

ہم نے بلیک نہ کر کے کیا بنا لیا۔

''کچھ نہیں جی کچھ نہیں' ایسے ہی مر جائیں گے دس دس جوڑتے''۔

اس کے چند گھنٹوں بعد دوستوں کے درمیان ٹیلی فون پر باتیں ہوں گی۔ مجھے یاد کیا جائے گا۔ ہر کوئی مجھ سے قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے گا اور دوسرے کو خفیف کرے گا کہ باوجود مجھے اچھی طرح سے جاننے کے وہ اتنا نزدیک نہیں تھا۔ تابش کے بال اور پھول جائیں گے۔ آنکھیں اور خاموش ہو جائیں گی۔ زبان بالکل گنگ ہو گی۔ ریاض محمود اپنا زرعی پروگرام ریکارڈ کرنے کے لئے سٹوڈیو میں موجود ہوگا اور انجینئروں کی خوشامد کر رہا ہوگا۔ ''تلقین شاہ'' لکھنے والے کا پینٹ ہاف سیٹ چائے میں سے تین پیالیاں نکال کر'' کے تو'' سگریٹ پی رہے ہوں گے اردو بورڈ کا عملہ پریشان ہوگا کہ اگلی تنخواہ کے لئے پے بلوں پر کون دستخط کرے گا۔ پھر ان میں سے دو تین مل کر اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بینک جائیں گے اور وہاں سے فارم لیں گے کہ ڈرائنگ اور

ڈسبرسنگ آفیسر کے فوت ہو جانے کی صورت میں منسٹری کے سیکرٹری کے دستخط کئے جائیں اور تنخواہ نکالی جا سکے۔ پھر اردو بورڈ کے ملازم شریف الدین کو شام کی گاڑی سے اسلام آباد روانہ کریں گے تاکہ وہ ڈاکٹر اجمل کے پی اے سی من سگنیچر لا سکے اور بینک سے تنخواہ ڈرا کی جا سکے۔ بیچاروں کو کافی تردد کرنا پڑے گا" لیکن شریف الدین کی حکمت عملی سے مشکل راہیں آسان ہو جائیں گی اور ان کو وقت پر تنخواہ ملنے کی امید بندھ جائے گی۔ اس امید بندھنے کے بعد جب انہیں اطمینان ہو جائے گا تو وہ مجھے یاد کریں گے۔ فضلی ربانی' محمد علی' سلطان صاحب' طاہر اور بابو خان دل کھول کر مجھے یاد کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اپنے ساتھیوں کے خوف سے کچھ تعریف نہ کر سکیں گے کیونکہ ان پر مرحوم ڈائریکٹر کے پٹھو ہونے کا الزام لگ جائے گا اور نئے آنے والے ڈائریکٹر سے ان کی شکایت ہو جائے گی کہ یہ پرانے ڈائریکٹر کو دل سے چاہتے تھے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور ذہین فنکار اور شو بزنس کے ایک کامیاب آرٹسٹ کی موت کے باوجود لاہور کا سارا کاروبار نارمل طریق پر چلتا رہے گا۔ شاد عالمی چوک سے لے کر میو ہسپتال کے چوک تک ٹریفک اسی طرح پھنسا رہے گا۔ کوچوان گھوڑوں کو دوبچے اور قریبی کوچوان کو یچے لہجے میں گالیاں دیتے رہیں گے۔ ہسپتال کے اندر مریضوں کو کھانا جاتا رہے گا۔ ٹیلی فون بجتا رہے گا' بجلی کا بل آتا رہے گا' فقیر سوتا رہے گا' چوڑھے تاکی مارتے رہیں گے' استاد پڑھاتے رہیں گے' ریکارڈنگ ہوتی رہے گی' قوال گاتے رہیں گے' رنڈی ناچتی رہے گی' ڈاکیا چلتا رہے گا' سوئی گیس نکلتی رہے گی' تقریریں ہوتی رہیں گی' غزلیں لکھی جاتی رہیں گی' سوئی میں دھاگہ پڑتا رہے گا' قتل ہوتا رہے گا' زچہ مسکراتی رہے گی' بچہ پیدا ہوتا رہے گا۔

برانڈرتھ روڈ کی دکانوں پر نئے مکان بنانے والی بیگمات ولیتی ٹونٹیوں اور فلشوں سے سودے دیکھ رہی ہوں گی۔ ان کے پرسوں میں سو سو کے نوٹ ہوں گے اور ان کے خاوند اپنے اپنے مرکزوں پر روپے بنا رہے ہوں گے۔ کرشن نگر کی لڑکی نے ساری رات لگا کر باریک باریک خطوں کی کشیدہ کاری سے ایک محبت نامہ لکھا ہوگا اور ہسٹری کی کتاب میں رکھ کر برقع اوڑھ کر اسے پوسٹ کرنے جا رہی ہوگی۔ شادمان کی لڑکی ٹیلیفون پر اپنے محبوب سے گفتگو کر رہی ہوگی اور آپ پر یٹر

درمیان میں سن رہا ہوگا۔ موچی کے باہر بڈھے گھوڑے کی نعل لگا رہے ہوں گے اور گھوڑا ہسپتال میں نوعمر بچھڑے آختہ کیئے جا رہے ہوں گے۔ بڈھے عرضی نویس کا پیشاب بند ہوگا اور اس کے پوتے اسے چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لا رہے ہوں گے۔ خزانچی نوٹوں کی گڈھیوں میں سوراخ کر کے دھاگے پرو رہے ہوں گے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے مائیں لڑکیوں سے پوچھ رہی ہوں گی کہ ان کے لئے کون سی تاریخ ٹھیک رہے گی۔ چلہ کاٹنے والے دعائے حزب البحر پڑھ کر اپنے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر اوپر کی طرف اٹھا رہے ہوں گے۔ لڈو بناتا ہوا حلوائی اٹھ کر سامنے والی نالی پر پیشاب کر رہا ہوگا۔ لبرٹی مارکیٹ میں دو نوجوان ایک لڑکی کے پیچھے گھوم رہے ہوں گے۔ دلہنوں کے جسموں سے آج ایک اجنبی مہک بھی اٹھ رہی ہوگی۔ بچے گلی میں کیڑی کاڑا کھیل رہے ہوں گے اور قریبی مکان میں ایک ماں اپنے بچے کو پیٹ رہی ہوگی جس کا خاوند ایک اور عورت کے ساتھ جہانگیر کے مقبرے کی سیر کر رہا ہوگا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں کھلے پائنچوں کی شلواریں پہن کر لڑکوں سے یونین کی باتوں میں مصروف ہوں گی اور ہیلتھ سیکرٹری لاٹ صاحب کے دفتر میں اپنی ریٹائرمنٹ کے خوف سے پریشانی ہو رہا ہوگا۔ کچھ جسم ماربل کے باتھ روم میں واش کر رہے ہوں گے کچھ چیپس کے غسل خانوں میں نہا رہے ہوں گے۔ کچھ مسجدوں کے سقادوں میں پاک ہو رہے ہوں گے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ایک ادیب اور فنکار نے ساری عمر چھوٹی چھوٹی کر کے اپنی شہرت اور نیک نامی کا تالاب بھرا ہوگا اور دن رات ایک کر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کیا ہوگا اور اس ایک چھوٹے سے حادثے سے وہ سارے دلوں سے نکل گیا ہوگا۔ ہر یاد سے محو ہو گیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے جنم دیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے سچ مچ یاد کیا تھا اور اس دل سے بھی جس نے اسے فائدہ اٹھانے کے لئے دلی محبت کی تھی۔

تیسرے چوتھے روز اتوار کا دن حلقہ ارباب ذوق ادبی میں میرے لئے ایک قرارداد تعزیت پاس کی جائے گی۔ عین اسی وقت حلقہ ارباب ذوق سیاسی میں بھی ایک قرارداد تعزیت پیش کی جائے گی۔ سب متفقہ طور پر اسے منظور کریں گے لیکن اس کے آخری فقرے پر بحث کا آغاز ہوگا کہ حلقہ ارباب ذوق کا یہ اجلاس حکومت سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ مرحوم کے لواحقین کے لئے کسی وظیفے کا بندوبست کیا جائے۔ اس پر حاضرین دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ا۔

اس کے حق میں ہوگا کہ یہ فقرہ رہنے دیا جائے کیونکہ مرحوم ایک صاحب حیثیت ادیب تھا اور اس کی اپنی ذاتی کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں موجود ہے۔ پھر کوٹھی کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ کچھ اسے دو کنال کی بتائیں گے کچھ تین کنال کی، کچھ دبی زبان میں کہیں گے اس کی بیوی پڑھی لکھی خاتون ہے، وہ نوکری بھی کر سکتی ہے اور لکھنے لکھانے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ ریڈیو آنے جانے والے ایک ادیب سامعین کو بتائیں گے کہ بانو کی ذاتی آمدنی ریڈیو ٹی وی سے دو ہزار سے کم نہیں۔ میرے ایک دور کے رشتہ دار ادیب اعلان کریں گے کہ وہ ایک مالدار گھرانے کا فرد تھا اور اس کا اپنے باپ کی جائیداد میں بڑا حصہ ہے جو اسے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ پھر کوئی صاحب بتائیں گے کہ ورثا کو بورڈ سے گریجوایٹی بھی ملے گی۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد دن ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہونے لگیں گے اور میری پہلی برسی آ جائے گی۔ یہ کشور ناہید کے لئے آزمائش کی گھڑی ہوگی کیونکہ ہال کی ڈیٹس پہلے سے بک ہو چکی ہوگی اور میری برسی کے روز آل پاکستان ٹیکنیکل سکولز کے ہنر مند طلبہ کا تقریری مقابلہ ہوگا۔ کشور کو پاکستان سنٹر میں میری برسی نہ منا سکنے کا دلی افسوس ہوگا اور وہ رات گئے تک یوسف کامران کی موجودگی میں کف افسوس ملتی رہے گی۔ لوگ اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کو ایک ایشو بنالیں گے اور وہ لوگ جو عمر بھر مجھے جائز طور پر ناپسند کرتے رہے تھے وہ بھی کشور ناہید کے برخلاف دھڑے میں شامل ہو جائیں گے۔ مجھ سے محبت کی بنا پر نہیں کشور کو ذلیل کرنے کی غرض سے۔ پھر ذوالفقار تابش کی کوششوں سے گلڈ کے بڑے کمرے میں یہ تقریب منائی جائے گی اور عتیق اللہ، کشور بیدل، ریاض محمود، غلام قادر، سلیم مجھ پر مضمون پڑھیں گے۔

کس قدر دکھ کی بات ہے کہ زمانہ ہم جیسے عظیم لوگوں سے مشورہ کئے بغیر ہم کو بھلا دے گا۔ میں ہوا، نپولین ہوا، شہنشاہ جہانگیر ہوا، الفرج رونی ہوا، ماوراالنہر کے علماء ہوئے۔ مصر کا ناصر ہوا، عبدالرحمان چغتائی ہوا کسی کو بھی ہماری ضرورت نہ رہے گی اور اتنے بڑے خلا، پانی میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح بھر جائیں گے۔ ہماری اتنی بڑی قربانیوں کا کہ ہم فوت ہوئے اور فوت ہونا کوئی آسان کام نہیں لوگ یہ صلہ دیں گے۔ افسوس زمانہ کس قدر بے وفا ہے اور کس درجہ فراموش کار ہے۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

''ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے''

اشفاق احمد کا یہ تفصیلی انٹرویو معروف کالم نگار افضال ریحان نے کیا تھا جو جنوری 2003ء کے قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ اشفاق احمد کی وفات پر ہم اس انٹرویو کے بعض حصے بار دیگر شائع کر رہے ہیں۔(ادارہ)

☆☆...... آپ نے پہلا افسانہ کب لکھا؟

☆...... میں نے 1942ء میں پہلا افسانہ لکھا تھا اس کا نام ''توبہ'' تھا اور وہ ''ادبی دنیا'' میں چھپا۔ مولانا صلاح الدین نے اپنے ایڈیٹوریل میں اس کی بڑی تعریف کی۔ میں چھوٹا سا آدمی تھا۔ لیکن اس سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔

☆☆...... اس زمانے میں آپ کا سیاسی شعور کیسا تھا؟

☆...... اس زمانے میں ہماری ایک بہت طاقتور جماعت تھی ''ترقی پسند تحریک'' وہ کسی بندے کو بندہ ہی نہیں سمجھتی تھی۔ جو اس کے اصولوں سے مطابقت نہ رکھتے ہوں ایسے لوگوں کو چاہے وہ کیسے ہی ادیب ہوں کان سے پکڑ کر نکال دیتی تھی کہ یہ تو ادیب ہی نہیں ہے۔ جیسے ممتاز مفتی کے ساتھ ہوا۔ قدرت اللہ شہاب تھے' نسیم حجازی تھے۔

پاکستان بننے کے ساتھ ہم چند لڑکے پوری طاقت کے ساتھ نکلے جن میں انتظار حسین' اے حمید اور استاد دامن بھی تھے' اے حمید کی دوستی تو امرتسر کے کچھ ترقی پسند دوستوں کے ساتھ تھی لیکن ان کی تحریر میں وہ ساری باتیں نہیں آتی تھیں جو ترقی پسند تحریک کا تقاضا تھیں۔ یہی معاملہ انتظار حسین کے ساتھ اور خود میرے ساتھ بھی تھا۔

ہماری سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہم اپنی طاقت کے زور پر چلے۔

☆☆...... اپنی بال کے یکی؟

☆...... بالکل آپ نے صحیح الفاظ چنے' ہم نے اپنی بال کے یکی' اپنے قارئین پیدا کر کے اپنی

زندگی کی شمعیں جلا کر روشنی کی۔ یہ بڑا ہی مشکل کام تھا۔ اس وجہ سے وہ ہمیں پسند نہیں کرتے تھے' منہ نہیں لگاتے تھے کہ یہ نالائق روایت کے مارے ہوئے ہیں لیکن قارئین نے ہمیں جس طرح سراہا اس مہربانی سے ہم زندہ رہے۔

☆☆...... آپ اپنی زندگی کا سفر ریڈیو پاکستان کے حوالے سے بتایئے؟

☆...... میرا ایم اے کا رزلٹ ابھی نہیں آیا تھا کہ ہمارے ساتھی ممتاز مفتی' یوسف ظفر یہاں آئے اور کہا کہ ہم تو آج کل آزاد کشمیر ریڈیو میں کام کرتے ہیں اور انڈیا کے پراپیگنڈے کا توڑ کرتے ہیں ہمارے اسٹیشن ڈائریکٹر محمود نظامی بھی یہاں آئے ہوئے ہیں تم بھی ان سے ملو۔

ہم شام کو انہیں ملے تو انہوں نے کہا کہ چھوڑو یہاں جو بھی کر رہے ہو چلو ہمارے پاس وہ مجھے وہاں لے گئے تین سو روپے مہینہ بڑا اچھا ماحول' بڑے اچھے دوست' مسعود قریشی' وقار صدیقی' عمر' یہ پڑھے لکھے لوگ تھے سو ان کے ساتھ میں نے بھی وہاں کام شروع کر دیا۔

پروفیسر عابد علی عابد دیال سنگھ کالج کے پرنسپل تھے وہ وہاں کسی ناٹک کے سلسلے میں گئے میرا ایم اے اردو کا رزلٹ آ چکا تھا' انہوں نے مجھے دیکھا تو بولے ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہمیں اردو کے لوگ نہیں مل رہے'' میں نے کہا ''جی یہاں بہت اچھا ہے''۔ کہنے لگے ''نہیں غلط بات ہے تم ایک استاد ہو چلو ہمارے ساتھ'' اس طرح یہاں لاہور آ کر دیال سنگھ کالج پڑھانا شروع کر دیا۔ میاں ریحان یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ساری زندگی کبھی کسی نوکری کے لئے عرضی نہیں دی۔

☆☆...... اس کے باوجود بائیسویں گریڈ میں بھی پہنچ گئے؟

☆...... یہ اللہ کے کام ہیں آپ دیکھ لیں۔ یہاں آیا تو بڑے بڑے نابغہ روزگار لوگ سٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تھے انجم رومانی موجود تھے۔ یہاں آ کر پڑھائی کی طرف مزید رخ ہوا انگریزی کی طرف بھی رجحان ہوا۔ لائبریری دیال سنگھ کی بہت اچھی تھی۔

اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا تو اس دوران اٹلی حکومت نے ہماری گورنمنٹ کو لکھا کہ ہم روم میں یونیورسٹی کے لئے اردو کا استاد چاہتے ہیں جو ساتھ ہی ہمارے ریڈیو پر اردو کی براڈ

کاسٹ بھی کرے۔ یعنی ایک ہی شخص میں یہ دونوں باتیں ہونی چاہئیں سو اس لحاظ سے میں ایک ہی تھا جو یہ دونوں کام کر چکا تھا۔ سو مجھے روم بھیج دیا گیا...... صبح یونیورسٹی شام ریڈیو۔ میرے لئے سن اکاون باون میں یہ ایک بڑا دلچسپ تجربہ تھا۔ ایک نوجوان آدمی بحیثیت پروفیسر وہاں کے بڑے بڑے لوگوں کو پڑھا رہا ہے بڑے قابل لوگوں سے میل جول ہوا۔ کئی اطالین جو پاکستان سے ٹریڈ کے لئے اردو پڑھ رہے تھے' کئی تھے جو فارن سروس میں آنا چاہ رہے تھے' وہاں فارسی کے ایک پروفیسر ملے جو تھے تو اطالین لیکن انہوں نے علامہ اقبال کی کتاب "جاوید نامہ" کا ترجمہ کیا تھا۔ عربی میں بھی وہ بڑے قابل تھے قرآن شریف کا انہوں نے اطالین میں ترجمہ کیا۔ میرا وہ تجربہ بڑے کمال کا تھا۔ چھٹیوں میں میں نے سیر کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ' فرانس اور زیادہ وقت انگلستان گزارا کیونکہ وہاں ہمارے دوست اعجاز بٹالوی بیرسٹری کر رہے تھے ڈاکٹر جاوید اقبال بھی وہیں پر تھے۔

☆☆...... پھر تو آپ کی بڑی محفلیں جمتی ہوں گی؟

☆...... بڑی لمبی چوڑی محفلیں دلچسپ باتیں ایک سکھ لڑکا کہنے لگا کہ یہ آپ کی اردو کیا چیز ہے آپ لوگ لکھتے "خواب" ہیں پڑھتے "خاب" ہیں لکھتے "خواہش" ہیں پڑھتے "خاہش" ہیں یہ "و" کو کیا ہو جاتا ہے۔ اعجاز اسے سمجھا رہے تھے کہ "و" کہاں جا کر ساکن ہو جاتی ہے' کیسے آواز دیتی ہے۔ وہ لڑکا وہاں کئی سالوں سے بیرسٹری کر رہا تھا لیکن یہ بات سمجھ نہیں رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے بڑے دلچسپ انداز میں اسے کہا سنو یہ جو "و" ہے یہ کہتی ہے میں نے نہیں بولنا اس کا بولنے والا مزاج ہی نہیں یہ ناراض ہو جاتی ہے۔ میں جاوید کا وہ انداز آج تک نہیں بھولا ہوں جب انہوں نے کہا کہ "بھائی جب وہ نہیں بولتی ہے تو بس نہیں بولتی ہے تمہیں کیا"۔

☆☆...... جاوید صاحب کیا تب بھی ایسے ہی کھلے ڈلے تھے؟

☆...... ہاں ہاں تب تو وہ اس سے بھی زیادہ کھلے ڈلے تھے۔ بہت ینگ' میموں میں' صاحبوں میں بڑے پاپولر......

☆☆...... باپ کا ایڈوانٹیج کیا وہاں بھی انہیں تھا؟

☆...... بہت کم، کہیں کہیں، لیکن وہ اپنے بل بوتے پر ہی کافی تھے ان کا تھیسس وہاں بڑا پاپولر ہوا تھا مضامین بھی یہ لکھتے رہتے تھے۔

☆☆...... ان کا موضوع کیا تھا؟

☆...... ان کا موضوع تو فلاسفی تھا لیکن انہوں نے اسلام پر بھی وہاں ایک کتاب لکھی۔ اس طرح کی محفلیں ہوتی تھیں بی بی سی کے علی تقی بڑے دلچسپ آدمی ہوتے تھے۔

☆☆...... نوعمری میں آپ کو اقبال سے لگاؤ رہا؟

☆...... ہاں ان کے فوت ہونے پر ہم نے سکھوں سے مل کر جلوس نکالا بہت لمبا چوڑا جلوس' بہت روتے ہوئے تب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اگر میں لاہور یا ارد گرد ہوتا تو شاید ملنے کا خواہشمند بھی ہوتا۔

☆☆...... کبھی جناح صاحب کو دیکھا؟

☆...... 1942ء میں جب جناح صاحب جالندھر آئے تو مجھے بڑی شوق ہوا انہیں دیکھنے کا۔ میں فیروز پور میں ہوتا تھا۔ وہاں ان کی آواز بڑی عجیب وغریب اور پر وقار لگی۔ پھر جب پاکستان بنا تو ہمارا ایک قافلہ روتے پیٹتے لاہور پہنچا۔ جس میں میرے کنبے کے لوگ تھے ہم مزنگ روڈ پر ٹھہرے۔ میں نے بی اے کر رکھا تھا سو ایمپلائمنٹ کے آفس میں گیا انہوں نے تعلیم پوچھی تو کہنے لگے کہ اس معیار کی نوکری ہمارے پاس نہیں ہے پھر تیسرے دن گیا تو تعلیم میٹرک بتا دی سو انہوں نے کہا بطور کلرک کہاں نوکری کرو گے۔ ریلوے میں' محکمہ فوڈ میں یا رفیوجی کیمپ میں؟ میں نے کہا رفیوجی کیمپ میں۔ سو انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ والٹن کے رفیوجی کیمپ میں گیا تو وہاں کیمپ انچارج تھے رانا صاحب انہوں نے کہا کہ بڑا اسمارٹ سا لڑکا ہے۔ انہوں نے 65 روپے ماہوار پر مجھے وہاں رکھ لیا۔ کوئی پندرہ دن گزرے تو ہمارے سپرنٹنڈنٹ نے کہا یہ تو کوئی افسر لگتا ہے باتیں بڑی اچھی کرتا ہے اسے اناؤنسمنٹ پر رکھ لیتے ہیں۔ جس میں لوگوں کا حوصلہ بڑھانے والی باتیں کرنے کی بھی تاکید تھی سو میں یہ کام کرنے لگا۔ پھر ایک اور صاحب بھی اس کام کے لئے لائے گئے ان کا نام تھا ممتاز مفتی' میں وہاں کلرک تھا۔ اس لئے جھجکوں لیکن چونکہ ان کا نام بطور رائٹر

بھی جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ میں انہیں بتاؤں کہ میں نے بھی کچھ افسانے لکھے ہیں پھر خواجہ نواب محمد شفیع دھلوی مقرر کردیئے گئے یہ ان سے بھی بڑے افسانہ نگار تھے تب میں ڈرتے ہوئے ممتاز مفتی صاحب سے ملا تو وہ بڑی اپنائیت سے ملے۔ وہاں چونکہ مختلف ریجنل آفس بنے ہوئے تھے اس لئے ہم اپنے اپنے بوجھ پر کام کررہے تھے۔ لیکن باہمی ربط سے ایک واسطہ بن گیا۔ اس کیمپ میں بو بہت تھی میں نے بو سے بچنے کے لئے اپنے کمرے کو کافی حد تک کاغذوں سے بند کر رکھا تھا۔ ایک دن لنگر سے میں روٹی لے کر مڑ ہی رہا تھا کہ سامنے میں نے جس لمبے قد کے آدمی کو دیکھا تو آپ یہ سمجھیں کہ روٹی میرے ہاتھوں سے گر گئی کیونکہ وہ قائداعظم تھے۔ بہت غمگین۔ پوچھنے لگے کہ یہاں روٹی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے عرض کی کہ جی بہت اچھی ہے کہنے لگے کھا کر دکھاؤ پھر میں نے تھوڑی سی کھائی۔ میرا جی چاہا کہ ان سے عرض کروں ہمارے کمرے میں چلیں لیکن مجھے حوصلہ نہ پڑا۔ بس یہ ہے وہ ملاقات جس کا شرف مجھے ریفوجی کیمپ میں حاصل ہوا جب میں نے واپس آکر نواب شفیع صاحب کو اس کا احوال سنایا تو وہ رونے لگے پھر وہ روئی مفتی صاحب نے کھائی نہ میں نے نہ نواب صاحب نے۔

☆☆...... کسی جلسے میں مہاتما گاندھی کو دیکھا یا دیگر لیڈران کو؟

☆...... نہیں گاندھی جی کو تو نہیں دیکھا البتہ پنڈت نہرو کو دیکھا جب وہ موچی دروازے آئے تھے۔ علامہ مشرقی کی کتابوں سے بھرپور متاثر رہا عطا اللہ شاہ بخاری کی تقاریر بھی بہت سنیں۔

☆☆...... آپ کا مذہبی پچ تو شروع سے رہا ہے؟

☆...... یہ تمام شرفاء کے گھروں میں ہوتا ہی تھا۔ اب آپ خواہ میرے بچوں اور پوتوں کی طرح ہیں آپ لاکھ کہیں کہ میرا مذہبی پچ نہیں ہے۔ لیکن وہ تو بہرحال ہے۔ آپ کے محمود مرزا صاحب "پاکستان سب کا" کہیں اور "مذہب اپنا اپنا" لکھیں لیکن مذہب کا رول تو رہے گا وہ تو وسعت نظر پیدا کرنے کے لئے ایسی باتیں کرتے ہیں۔

☆☆...... کہتے ہیں جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں باقیوں کا تو مجھے نہیں پتہ آپ دونوں کی جوڑی

لگتا ہے واقعی آسمانوں پر بنی ہو گی؟

☆...... اس میں کوئی شک نہیں یہ اللہ ہی کی مہربانی ہے۔

☆☆...... آپا تو کہتی ہیں کہ اشفاق صاحب ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے؟

☆...... ہاں یہ ٹھیک بات ہے جیسے وہ اردو میں کمزور تھی۔ میں نے محنت کروائی۔ وہ کام ایم اے پاس کرنے کے لئے کیا اور پھر اس نے میری حوصلہ افزائی پر باقاعدہ لکھنا بھی شروع کر دیا پھر ناول لکھا۔

☆☆...... ''راجہ گدھ'' تو ایک شاہکار بنا؟

☆...... کیا بات ہے جی' یہ سب اللہ کے کام ہیں۔

☆☆...... آپ کو آئیڈیل جوڑی کیسی لگتی ہے۔ جن کا ایک ہی رخ ہے ایک ہی روٹ ہے؟

☆...... بالکل۔ کوئی جیلسی نہیں' آئیڈیل جوڑی ہے۔

☆☆...... اماں ابا سے آپ نے اس سلسلے میں اظہار کیسے کیا؟

☆...... میں اپنے اباجی سے اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں FACE نہیں کر سکتا تھا اور ہمارے خاندان میں باہر شادیاں ہوتی بھی نہیں تھیں جب کہ ہم راجپوت تھے اور یہ جاٹ' بہر حال گھر میں دبا دبا ذکر ہوتا تھا۔ ایک دن اباجی ان کے گھر کینال پارک میں گئے۔ بیٹھے تو دیکھا کہ وہ چارپائیاں اٹھا کر اندر رکھ رہی ہیں انہوں نے پوچھا کہ تم تو ایم اے پاس نہیں ہو؟ کہنے لگی ہاں لیکن میں کام کر لیتی ہوں اس پر وہ بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے پاس کر دی لیکن ہماری اماں ذرا سخت تھیں وہ خاندان کی وجہ سے پسند نہیں کرتی تھیں وہ کہتی تھیں کہ ''چٹھہ'' نام ہی بڑا فضول ہے۔ اس طرح کے تاثرات ان کی فیملی بھی تھے لیکن بہر حال جو خدا کو منظور تھا ہو کر ہی رہا۔

☆☆...... خان صاحب آپ کے بچے کتنے ہیں؟

☆...... میرے تین بیٹے ہیں بیٹی کوئی نہیں۔

☆☆...... وہ کیا کرتے ہیں؟

☆...... میرا بڑا بیٹا پروفیسر ہے۔ وہ یہاں نہیں امریکہ کی یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔ دوسرا افارما

سونکل کمپنی میں ملازم ہے تیسرا بنکر ہے۔

☆☆...... کیا وجہ ہے کہ آپ کی طرف کوئی نہیں آیا؟

☆...... کوئی بھی نہیں آیا یہ ان کی مرضی ہے۔

☆☆...... ''تلقین شاہ'' آپ کی ذات سے زیادہ قریب ہے یا ہدایت اللہ کے؟

☆...... میں سمجھتا ہوں کہ تلقین شاہ تو ایک مثالی شخص (Figure Examplary) ہے۔
لیکن میرا مزاج جو ہے وہ ہدایت اللہ کا ہے یعنی کاش میں ایسا ہو سکوں۔ یہ نہیں کہ میں ہدایت اللہ ہوں بلکہ میرا رول ماڈل وہ ہے۔ اب لوگوں کا بھی رول ماڈل وہی ہے۔

☆☆...... ایک ''زاویہ'' پروگرام تھا؟

☆...... وہ ابھی بھی چل رہا ہے۔

☆☆...... ایک دفعہ بند ہوا تھا نا؟

☆...... ہاں' وہ بیچ میں بند ہو گیا تھا۔ بلکہ میں آپ کو بتاؤں زاویہ کی ایک Viewer ہیں مسز پرویز مشرف تو وہ مجھے کہنے لگیں کہ ''جی میں تو ایک ہی پروگرام دیکھتی تھی۔ آپ نے بند کیوں کر دیا''۔ میں نے کہا ''بی بی 12 اکتوبر کو فوجی آ گئے تھے تو ہم ان سے ڈر گئے''۔ تو ان کا خاوند بھی سن رہا تھا' کہنے لگا ''سر! ہم نے آپ سے کیا کہا؟'' میں نے کہا ''دیکھئے آپ سے ہم نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن ہم T.V والے ہیں۔ ہمارا فرض ہے ڈر جانا کیونکہ ہم خوف زدہ لوگ ہیں ہم کہتے ہیں اللہ جانے پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ ہم پہلے ہی بوریا بستر سمیت کر گھر چلے جاتے ہیں سو ڈرنا ہمارا فرض ہے جیسے مارشل لاء لگانا آپ کا فرض'' کہنے لگے ''نہیں سر میں نے تو دیکھا ہی نہیں آپ اس کو چالو کریں''۔

☆☆...... آپ جمہوریت کے بڑے حامی ہیں لیکن جنرل مشرف اس کے باوجود آپ کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں؟

☆...... ان کو ایسے ہی وہم سا ہو گیا ہے کہ میں کوئی بڑا اچھا لائق آدمی ہوں۔ نیک بھی ہوں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔

☆☆ ...... انہوں نے آپ کو بلایا بھی تھا ایک مرتبہ؟

☆ ...... میں تو خوف زدہ ہو گیا بھلا میرا کیا کام۔

تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ

ل ملا لو اب آخری وقت ہے۔

یہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔ پھر میں نے کہا ''جی میرے پاس تو ٹکٹ نہیں ہے اس لئے میں کل انشاء اللہ...... '' انہوں نے کہا ''نہیں آپ کی ٹکٹ تو موجود ہے کور کمانڈر کے پاس بس آپ آ جائیں آدھا گھنٹہ میں''۔

میں پریشان تھا کہ پھر فون آ گیا وہاں سے کہ ''جی آپ نے اکیلے نہیں آنا آپا کو بھی لے کر آنا ہے'' آپا سے وہ بھی بڑے متاثر ہیں۔

میں نے کہا ''جی انشاء اللہ''۔

تو پھر ہم ڈرتے ڈرتے روتے پہنچے گئے شام کا وقت تھا آپ ۔ کی آپا کوئی Trainy نہیں ایسے مواقع کی وہ کوئی سیاستدان نہیں بیچاری اس نے کہا ''جی پرویز آپ نے تو بہت ڈالر اکٹھے کرنا شروع کئے ہیں وہ کریں گے پھر یہ کریں گے۔ مگر آپ ہمیں یہ بتائیں کہ What about human benefit کیونکہ اس کا تو کوئی پروگرام ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپا یہ Human Benefit کے لئے تو کر رہے ہیں۔ ملکی حالت بہت خراب ہیں اقتصادی صورت حال بہت بری ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو اس نے کہا نہیں جی میں یہ سمجھتی ہوں کہ میرے ملک کے جو چودہ کروڑ بندے ہیں وہ روٹی، کپڑا اور مکان نہیں مانگتے۔ وہ تو ایسے کندھے کی تلاش میں ہیں۔ جس پر سر رکھ کر وہ رو سکیں۔ اور میرے ملک میں وہ کندھا نہیں ہے۔ وہ کیسے Provide کریں گے آپ پھر وہ چونکے۔

وہاں ایک اور بھی جرنیل تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپا آپ نے سنا ہے پنجاب کا محاورہ کہ

''جدھی کوٹھی دانے اوہدے کملے وی سیانے''

بانو نے کہا کہ "بس پچھلے 53 برس سے یہی غلطی ہوتی رہی ہے کہ آپ نے کملوں کو سیانا کرنے کے لئے ان پر دولت کی چادر ڈال دی۔ اب آئندہ ایسا نہ کرنا" میں حیران ہو گیا کہ ان کے پاس تو کوئی جواب ہی نہیں تھا پہلے بھی آپ یہی کرتے رہے۔ اب اللہ کے واسطے کملوں کو کملا ہی رہنے دیں اور سیانوں کو سیانا رہنے دیں۔

تو بس ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ اچھا آدمی ہے مجھ سے بھی ایسی ہی باتیں پوچھ رہے تھے لیکن ان کی سوچ System کے اندر چلتی ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو System ہیں وہ ماتحت ہوتے ہیں نوع انسانی کے۔ جو شخص نوع انسانی کی بہتری کا سوچنے لگے پھر وہ اس طرف آئے تو بہتر ہوگا لیکن جو شروع یہاں سے کرتا ہے مثلاً چند روز قبل President صاحب گورنر ہاؤس آئے ہوئے تھے تو وہ چار باتیں بتا رہے تھے کہ ہم Transparency کریں گے۔

دوسرے یہ کہ ڈالر آ جائے گا پیسے آ جائیں گے تو ہم یہ کام کریں گے۔

☆...... لیل و نہار اور ریڈیو سے آپ اردو سائنس بورڈ میں کیسے پہنچ گئے؟

☆☆...... مجھے سائنس بورڈ میں بلا لیا گیا کہ آپ یہ کام تو کر دیں چونکہ اس میں تو کوئی Editorial نہیں ہوتا تھا اس لئے وہاں چلا گیا۔ الحمدللہ وہاں پر تیس برس گزارے یعنی ساری عمر کٹ گئی۔

☆...... یہ طویل تجربہ کیسا تھا؟

☆☆...... بہت اچھا! یہ تو ایک لمبی کہانی ہے الگ سے ہی ایک مضمون ہو سکتا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ ایک تو میرے ذہن میں اٹلی رہنے کی وجہ سے جیسے کہ میں کہتا ہوں کہ مجھے Experience ہوا میں تصویریں دکھا رہا تھا اپنی بیوی کو اٹلی کے زمانے کی اس میں ایک چھوٹی سی کار تھی جسے کہتے ہیں چوبیا وہ Fiat car تھی کہنے لگی یہ کار اتنی چھوٹی؟

میں نے کہا ایسی ہی ہوتی تھی لیکن اس میں چار بندے بیٹھ جاتے تھے آسانی سے میں اس پر دفتر آتا جاتا تھا یہ بہت Popular تھی۔ کہنے لگی کمال کی ہے یہ کہاں کی ہے میں نے کہا اٹلی کی۔

اس نے کہا" کیا اٹلی کار بھی بنالیتا ہے" مزید کہنے لگی کہ" وہاں تو کوئی انگریزی بھی نہیں جانتا تو جس ملک میں انگریزی ہی نہ پڑھائی جاتی ہو تو کیسے ترقی کر سکتا ہے"۔ یہ اس کا خیال تھا اور ہم سب کا یہی خیال ہے۔

تو میں نے کہا کہ یہ ساری کی ساری Italian کی بنائی ہوئی کار ہے اور کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا وہاں پر۔ اس پر کہنے لگی جبھی اتنی چھوٹی ہے۔

یہاں بات ہنسی پر ختم ہو گئی۔

لیکن جب میں سائنس بورڈ میں آیا تو میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ اور مضامین تو چاہے اپنی زبان میں پڑھائے جائیں یا نہ پڑھائے جائیں سائنس کے مضامین جب تک اردو میں نہیں ہوں گے یا اپنی زبان میں نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک کوئی اختراع کوئی ایجاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی اس ذمہ داری کے دوران ایک دفعہ ایک میڈیکل کالج میں گیا اور وہاں کے پرنسپل سے ملا ان سے کہا کہ جناب آپ جو پڑھاتے ہیں اس کورس کو اردو میں تبدیل کروائیں۔

کہنے لگے نہیں نہیں اردو میں نہیں کرنا' اردو میں بندہ مر جاتا ہے' انگریزی میں ٹھیک رہتا ہے' بندہ نہیں مارنا چاہیے۔

میں نے کہا آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ انہوں نے مجھے اپنا کورس دکھایا' اس میں 100 نمبر کا ایک پرچہ جنسی امراض کے اوپر۔ میں نے کہا آپ یہ کیوں پڑھاتے ہیں؟ ہمارے ملک میں تو ہے ہی نہیں یہ مرض اللہ کے فضل سے مہربانی ہے' سوزاک آتشک وغیرہ نہیں ہے' اس میں ہماری کوئی خوبی نہیں لیکن یہاں یہ ہے ہی نہیں کہنے لگے بس جی یہ شروع سے کورس میں چلا آرہا ہے اور انگریزوں نے بنایا ہے یہ کورس۔ ولایت میں کیونکہ یہ مرض بہت عام ہے اس لئے وہاں یہ ہے پھر میں نے ان سے کہا مجھے ذرا وہ پیپر دکھائیں جن میں لاکڑہ کاکڑہ یعنی جو بچوں کو خسرہ ہو جاتا ہے' اس کے متعلق بتائیں۔

کہنے لگے چونکہ خسرہ کے اوپر کوئی کتاب انگریزی میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ کم ہی پڑھاتے ہیں۔ میں نے کہا جناب کوئی بچہ حرامی ہوگا جس کو خسرہ نہ ہو یہ تو سب کو ہی ہوتا ہے'

خسرہ کے متعلق جو کتاب اردو میں لکھی جائے گی ظاہر ہے وہ زیادہ پڑھی جائے گی مگر وہ تو موجود ہی نہیں ہے۔

ہماری ساری زندگی چونکہ مرہون منت ہے انگریز حکمران کی اس لئے اردو میں کچھ تو کتابیں لکھی نہیں جا سکیں لیکن کوئی بھی کتاب جسے آپ کہہ سکیں کہ وہ مخترع ہے یعنی اس نے کوئی اختراع کی ہو وہ اردو میں نہیں آسکی ماسوائے میری ایک کتاب کے "ریگستانی ٹڈی کا ہضمی نظام"

تو یہ کتاب جب ہم نے چھاپی اور اعلان کیا کہ چھاپ رہے ہیں تو ہمیں چیکوسلواکیہ سے ایک خط آیا کہ اس کی 100 کاپیاں ہمیں بھیج دیں۔

میں نے کہا کہ بھئی یہ اردو میں ہے۔ انہوں نے کہا کچھ بھی ہو ہم ترجمہ کرا لیں گے لیکن ہم اس کے ہضمی نظام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

☆☆...... آپ نے بیوروکریسی کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟

☆...... بچے! بیوروکریسی بیچاری تو کچھ نہیں کرتی بس ایک نوجوان کو جو ماشاء اللہ گریجوایٹ بھی ہے اور شریف گھرانے کی وجہ سے کچھ اخلاقی ویلیوز بھی رکھتا ہے' اسے محض جھوٹ کی عادت ڈال دیتی ہے یا تھوڑی بہت ہیرا پھیری کے گر سکھا دیتی ہے۔ بیوروکریٹ اس کے سابقہ کریکٹر کو بس زائل کرتا ہے کیونکہ وہ اسے جب تک Emotional نہیں کرے گا اس کی گرفت کمزور رہے گی عطاء الرحمن نے مجھے کہا کہ میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں مجھے بتاؤ کمپیوٹر اور آئی ٹی وغیرہ کے ذریعے نوجوانوں کو کیسے تگڑا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ محض ہزار ڈالر کمانے سے تو وہ تگڑا نہیں ہوگا شاید اس سے الٹا کمزور ہو جائے ہماری کچھ اخلاقی قدریں بھی ہیں کچھ ادھر بھی توجہ دو۔

میں نے بیوروکریسی کی اخیر یہ دیکھی ہے کہ چند سہولتوں' چند مفادات کے وہ بھوکے ہوتے ہیں اس سے آگے کا وہ سوچ ہی نہیں سکتے؟

اور مفادات بھی گندے' کار ڈرائیور چپڑاسی بچوں کو سکول لانے لے جانے والا۔

بیوروکریسی کا پہلا تحفہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہونے کا بندے میں جو ڈنگ ہوتا ہے وہی نکال دیتے ہیں۔ اصل نکال دیا اور پتہ بھی نہیں چلا' چھتر کھائیں گے تو گھر آ جائیں گے۔

☆☆...... آمریت کے مقابلے میں آپ جمہوریت کو بہتر قرار دیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں اگر آپ تجزیہ کریں تو تقریباً دس فیصد لوگ ہوتے ہیں جن کا یہ سارا مخمصہ ہوتا ہے نوے فیصد تو اس سے بے خبر ہوتے ہیں؟

☆...... بالکل، کبھی کسی نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ کبھی ہماری جمہوریت کا بھی جائزہ لے کر دیکھ لیا جائے۔ یہ نیچے عام لوگوں تک تو جاہی نہیں پاتی اوپر ہی اوپر ایم این ایز اور ایم پی ایز کے چمچوں کی چم چم ہوتی ہے۔ مختلف حربوں سے جو جیتتے ہیں وہ پہلے اسمبلیوں میں گروپوں کی صورت اختیار کرتے ہیں پھر ان میں کچھ اجلاس میں سونے والے ہوتے ہیں اور کچھ پارٹی کے لیڈر انگوٹھا چھاپ ہوتے ہیں جو اسمبلی میں ٹکاٹک کرتے ہیں جو منسٹر بن جاتے ہیں وہ ذاتی کمائی میں لگ جاتے ہیں۔ جو بول رہے ہوتے ہیں ان کی نظر آئندہ کی وزارت پر ہوتی ہے۔

☆☆...... سر! ذرا سیکولرزم کا بھی پوسٹ مارٹم کریں؟

☆...... سیکولرزم سے عام ذہنوں میں جو کچھ آتا ہے وہ ہے Nonreligious یعنی Religion سے اس کا کوئی تعلق نہیں، مجیب کو فکر لگی ہوئی ہے کہ اشفاق صاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ ملک سب کا، مذہب اپنا اپنا، یہ NGO یہ سیمینارز یہ انٹرنیشنل فورم وغیرہ کیا کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں ہمارا مذہب اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتا اس کی وجہ ایک تو ہماری عائلی زندگی ہے، مرد عورت کے تعلقات ہیں دوسری ہماری اجتماعی زندگی ہے جو مذہب سے عبارت ہے۔

☆☆...... ہماری گھریلو زندگی میں ماں کا مرتبہ باپ سے زیادہ ہے؟

☆...... نہیں اس میں نہ ماں کا رتبہ زیادہ ہے نہ باپ کا دونوں کو اسلام ادب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسلام تو اس کو نہیں مانتا کہ عورت کا درجہ مرد سے زیادہ ہو۔

☆☆...... جو تکلیف ماں سہتی ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے؟

☆...... یہ جو باہر کھڑا دھوپ میں سنگھاڑے بیچ رہا ہے، جس نے ریوڑیوں کا چھابہ لگایا ہوا ہے اور سات سالوں سے یہ تکلیف سہہ رہا ہے۔ 9 مہینے کی تکلیف اس سے کیسے بڑھ گئی۔ اس حرام زادے کا تو ستیاناس ہو گیا۔

☆☆...... آپ کی نظر میں پاکستان کی پرابلم نمبر 1 کیا ہے؟

☆...... ہماری پرابلم نمبر 1 یہ ہے کہ یہ جو ہمارا حکمران طبقہ ہے ان کا پاکستان کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں پاکستان کی ذات سے' پاکستان کے کلچر سے' پاکستان کی دھرتی سے' ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی خوراک سے' یہاں کی گیس اور پٹرول سے تو ان کا گہرا تعلق ہے جس سے وہ فائدے بھی اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو برا بھی کہتے ہیں اس کے بندوں کو نہیں مانتے لیکن اس ملک کی جان بھی نہیں چھوڑتے۔ کاش کوئی ایسا طریقہ ہو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان خواص کو انہی بیچارے عوام میں شامل کر دے۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد...... ایک داستان گو

(مرحوم کے ہم عصر اے حمید کی یادداشتوں سے اقتباس)

اس سے ذرا آگے ایک دکان میں گارڈینیا نام کا ریستوران ہوا کرتا تھا۔ نیم روشن ٹھنڈا ٹھنڈا ریستوران...... کم گاہک اندر بیٹھے ہوتے۔ بیرے چل کر میز کے پاس آتے تو ان کی آواز تک نہ آتی تھی۔ یہ ریستوران بھی ختم ہوگیا۔ وقت کی آندھی اسے بھی اڑا کر لے گئی۔ ہم ریگل سنیما کا چوک کراس کر کے ''داستان گو'' والی ذیلی سڑک پر آئے تو یہاں گزرنے کے لئے جگہ ہی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

''گاڑی ریگل سنیما کے احاطے میں لگا دو یہاں سے پیدل چلتے ہیں''۔

اس نے یہی کیا۔ ریگل سنیما کے باہر اگر کوئی شے ویسی کی ویسی تھی تو وہ پھول بیچنے والوں کی گلاب، گیندے اور دوسرے رنگ برنگے پھولوں سے بھری ہوئی بالٹیاں تھیں۔ آج سے چالیس سال پہلے بھی ان پھول بیچنے والوں کے پاس کوئی دکان نہیں تھی۔ ریگل سنیما کے گیٹ کے باہر پھولوں کی ٹوکریاں اور بالٹیاں سجا کر بیٹھے ہوتے تھے اور آج بھی وہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے پھول بیچ رہے ہیں۔ ریگل سنیما کے گیٹ کی دوسری طرف جہاں اب کتابوں کی دکان ہے کبھی شیراز ریستوران ہوا کرتا تھا۔ یہاں کبھی کبھی میں اور اشفاق آ کر چائے پیا کرتے تھے۔ پھر اس کا نام پالز کیفے ہوگیا۔ اس کا مالک پال نام کا ایک بھاری بھرکم باکسر ٹائپ آدمی ہوا کرتا تھا۔ جو شام کو ریستوران کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ دوسری کرسی پر ٹانگیں پھیلا دیتا اور مال پر کبھی کبھی گزرنے والی موٹر کاروں کو تکتا رہتا۔ پھر نہ جانے وہ کہاں غائب ہوگیا اس کے ساتھ سفید ساڑھی اور اداس چہرے والی ایک خاتون بھی بیٹھا کرتی تھی۔ وہ بھی پھر نظر نہیں آئی۔ اس کے آگے ایک بڑا اسٹور ہے۔ یہاں پہلے سٹینڈرڈ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کی خاص بات یہ ہے تھی کہ یہاں پہلے پہل انجیلا نام کی ڈانسر ڈانس کیا کرتی تھی۔

انجیلا بعد میں میٹرو ہوٹل میں ڈانس کرنے لگی تھی۔ سٹینڈرڈ ہوٹل میں شراب کے جام بھی چلتے تھے۔ شراب سے مجھے یاد آ گیا۔ گوالمنڈی کے چوک میں ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ہم یہاں آئے تو میں نے دیکھا کہ اس ہوٹل کے باہر ایک بورڈ لگا تھا جس پر اردو میں لکھا تھا۔

''یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے''۔

اسی طرح جی پی او کے سامنے لائیڈز بنک والی بلڈنگ کے اوپر بہت بڑا نیون سائن لگا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

''مری بیئر بہترین بیئر ہے''۔

اب نہ وہ مری کی بیئر رہی' نہ سٹینڈرڈ ہوٹل رہا' نہ سٹینڈرڈ ہوٹل کی ڈانسر انجیلا رہی جو رہی تو بے خبری رہی۔

ہم پھول بیچنے والوں کے پھولوں سے جدا ہو کر داستان گو دفتر کے سامنے والے بس سٹاپ پر آ کر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اشفاق نے کہا۔

''یار! ہمارا چھوٹا سا شاہ نشین ٹائپ دفتر تو بالکل ہی ویران ہو گیا ہے''۔

وہاں خدا جانے کس نے اپنا دفتر یا دفتر کا گودام بنایا ہوا تھا۔ دفتر کی تنگ سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ یہ سیڑھیاں دوسری منزل پر روزنامہ ''آفاق'' کے دفتر کو بھی جاتی تھیں۔ یہ 1952ء کی بات ہے میں روزنامہ ''آفاق'' کے دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ پہلے میری ڈیوٹی دن کے وقت اخبار کے دوسرے تیسرے صفحے پر ہوا کرتی تھی۔ میرے ساتھ ناصر کاظمی اور علی سفیان آفاقی بھی ہوا کرتے تھے۔ ''آفاق'' اخبار میں آفاقی کے نام سے کالم لکھا کرتا تھا۔ پھر میں رات کی شفٹ میں چلا گیا۔ یہ ختم نبوتؐ کی تحریک کا زمانہ تھا جب مال پر بڑی گولی چلی تھی۔ رات کو کرفیو لگتا تھا۔ میں نے پاس بنوا رکھا تھا۔ پھر بھی رات کو ایک بجے گھر واپس جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کس طرف سے کوئی گولی نہ آ جائے۔ اشفاق نے سر کو بلا سا جھٹک کر کہا۔

''چلو یار! واپس چلتے ہیں۔ ان کھنڈروں میں کب تک پھرتے رہیں گے''۔

میں نے کہا ''ابھی ایک تاریخی کھنڈر کی سیر باقی ہے''۔

''وہ کون سا کھنڈر ہے''؟

''پاک ٹی ہاؤس''۔

اشفاق بے اختیار خوش ہو کر بولا۔

''ہاں یار! وہاں ضرور چلیں گے۔ چلو''۔

ہم نے گاڑی نکالی اور پاک ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے جو درخت تھا وہ پہلے سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گھنی شاخوں نے سڑک پر سایہ کر رکھا تھا۔ ٹی ہاؤس بھی زبان حال سے اپنی خستگی و شکستگی کی داستان سنا رہا تھا۔ فرش کی ٹائلیں جہاں سے اکھڑ گئی تھیں وہاں پلستر پھیر دیا گیا تھا۔ چند ایک میزوں پر اجنبی چہروں والے لوگ بیٹھے تھے۔ سراج صاحب کے بیٹے نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ کاؤنٹر چھوڑ کر ہمارے پاس آیا۔ اس کا چہرہ وفور مسرت سے چمک رہا تھا۔

''زہے نصیب کہ آپ پاک ٹی ہاؤس میں آئے''۔

میں نے کہا۔

''یار! چائے وہی پرانے پاک ٹی ہاؤس والی پلانا''۔

''اس سے بھی اعلیٰ چائے آئے گی''۔

پھر اس نے کسی بیرے کو آواز دی۔ بیرا آ گیا۔ کسی پرانے بیرے کی صورت اس میں نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ لال نامی بیرے کا بیٹا ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے چائے بنا کر لایا' مگر وہ چائے نہیں تھی جو کبھی ہم وہاں پیا کرتے تھے۔ اشفاق شیشے کی دیوار والی سیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں یاد ہے یہاں شہرت بخاری' قیوم نظر' حبیب جالب' انجم رومانی اور امجد الطاف بیٹھا کرتے تھے''۔

ہم کاؤنٹر کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا

''اور یہاں ناصر کاظمی میرے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ حلقتاً وہ بھی قیوم نظر والی ٹولی میں تھا مگر جس روز اس نے تازہ غزل کہی ہوتی تھی تو مجھے ساتھ لے کر اس میز پر آ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتی تھیں۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ لگا کر مجھے کہتا۔ تمہیں اپنی تازہ غزل سناتا ہوں''

میں نے اوپر گیلری کو جاتے زینے کو دیکھا۔ زینہ خالی تھا اوپر گیلری بھی خالی تھی۔ زینے کے پاس بھی ایک میز لگی تھی۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک بار گرمیوں کی دوپہر کو میں اس میز پر بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ شہرت بخاری، قیوم نظر اور محمود گیلانی نامی ایک سٹوڈنٹ بھی تھا جس کا تعلق منٹگمری سے تھا اور جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں ہی رہتا تھا۔ محمود گیلانی بڑا ادب پرست نوجوان تھا۔ اتنے میں پاک ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور سعادت حسن منٹو نے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ منٹو صاحب کی زندگی کے آخری افسوس ناک ایام تھے۔ یہ منظر پورے کا پورا مکمل تفصیل کے ساتھ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ شہرت بخاری نے منٹو صاحب کو دیکھا تو گھبرا کر کہا۔

اوئے منٹو صاحب آ گئے بھاگو وہ پیسے مانگیں گے''۔

قیوم نظر اور شہرت بخاری جلدی سے اٹھ کر اوپر گیلری میں چلے گئے۔ میں اور محمود جیلانی وہیں بیٹھے رہے۔ اس دوران منٹو صاحب ہماری میز پر پہنچ گئے تھے۔ غالباً وہ محمود جیلانی کو دیکھ کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی محمود جیلانی سے پوچھا۔

''تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں''؟

محمود جیلانی نے بڑے ادب سے بٹوہ کھول کر ان کے آگے رکھ دیا اور کہا۔

''منٹو صاحب! یہ سارے پیسے آپ ہی کے ہیں''۔

مجھے یاد ہے بٹوے میں دس روپے کے کتنے ہی نوٹ ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ منٹو صاحب نے ان میں سے صرف دو نوٹ نکال کر رکھ لئے اور کہا۔

''بس بیس روپے کافی ہیں''۔

اور جن قدموں سے چل کر وہاں آئے تھے انہیں قدموں سے چلتے ٹی ہاؤس سے باہر نکل گئے۔ ان دنوں جمخانہ شراب کا ادھا چودہ روپے میں آیا کرتا تھا۔ ہم دیر تک ٹی ہاؤس میں بیٹھے گزرے زمانے کو گزرے ہوئے زمانے کے چہروں کو یاد کرتے رہے۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ کیسے کیسے چمکیلے چہرے تھے جو ادب کے آسمان پر ستارے بن کر چمکے اور پھر اپنے پیچھے روشنی کی لکیریں چھوڑ کر نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ کبھی ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھے گلدان میں نرگس اور گلاب کے پھول مہکا کرتے تھے۔ شیشے میں ان پر سردیوں کی دھوپ پڑتی تو وہ بجلی کے بلب کی طرح روشن ہو جاتے۔ اب کاؤنٹر پر نہ گلدان ہے نہ گلدان کے پھول ہیں۔ صرف میں اور اشفاق احمد میز کے آمنے سامنے سر جھکائے بیٹھے پرانے دنوں کو یاد کر رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ اس میز پر کوئی اور بیٹھا ہمیں یاد کر رہا ہو گا۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

الوداع، اے میرے داستاں گو، الوداع!

سجاد میر

(شہر آشوب)

ہمارے عہد کا داستاں گو بھی چل بسا۔ اس نے یہ داستاں کس کس انداز میں نہیں سنائی۔ اشفاق احمد کا کوئی ہم عصر ان جیسا نہ تھا۔ عجیب شخص تھا، کیا کیا طلسم کھولتا گیا۔

ابھی ابھی کسی نے پوچھا ہے: آپ اس کے مرتبے کا تعین کیسے کرتے ہو۔ بے ساختہ عرض کیا، لاہور میں چار زندہ ادیب تھے، جی ہاں، ہر معنی میں زندہ، انتظار حسین، منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد جن سے اس ملک میں ادب کا وقار قائم تھا۔ ان میں صرف دو ایک اور شامل کر لئے جائیں تو پوری دنیا کا منظر نامہ مرتب ہو جاتا ہے۔ مکمل جاندار اور خوبصورت۔ وہ زندہ رہنے والے ادیبوں میں تھا اور یقیناً زندہ رہے گا۔

جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو اشفاق احمد کے گڈریئے کا چرچا تھا۔ منٹو کے عہد کے بعد جو دو ایک لکھنے والے اپنا وقار بنا سکے ان میں اشفاق پیش پیش تھے۔ معلوم ہوا، انہوں نے لاہور سے داستاں گو کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا ہے۔ چھوٹا سا پریس خریدا ہے، شاید ہاتھ سے چلتا ہے، کم از کم ہم نے یہی سنا تھا۔ دونوں میاں بیوی مل کر یہ پرچہ خود چھاپتے ہیں۔ اس بات میں ان دونوں بڑا رومانس محسوس ہوتا۔ میاں بیوی کے اس انداز پر رشک آتا تھا۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا جوڑا کوئی ایسا ہی درویشانہ ادبی رویہ اختیار کرنے کے خواب دیکھا کرتے۔

ہم خواب دیکھتے رہے اور اشفاق احمد کام کرتا رہا۔

ریڈیو پر تلقین شاہ کی دھومیں تھیں۔ یہ کردار اشفاق احمد خود کر لیا کرتے، لکھتے تو تھے ہی۔ ریڈیو کے میڈیا پر عقل و دانش کی باتیں دیسی انداز میں کرنے کا جو ڈھنگ اس

میں نکالا گیا تھا' وہ کہیں خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔

اشفاق احمد نے ایک فلم بنا ڈالی۔ ناکام ہوئی' مگر برسوں اس کا چرچا رہا کہ اس کے پیچھے ایک تخلیق کار کا دماغ جو تھا۔

ٹیلی ویژن آیا تو اشفاق احمد اس میدان بھی چھا گئے۔ داستان گوئی نے ڈرامہ نویسی کا رنگ اختیار کیا۔

وہ اپنی بات کہنے کے لئے ہر میڈیا میں راستہ نکال لیتے تھے۔ ہر میڈیا میں سب سے الگ اور منفرد نظر آتے۔

ایک زمانہ تھا جب کسی نے پوچھا' اپنی روایات واقدار کی پاسداری کے لئے الیکٹرانک میڈیا پر کیا کیا جائے۔ مجھے یاد ہے' میں نے مشورہ دیا تھا کہ اشفاق احمد اور سلیم احمد کے پاؤں پکڑلو۔ سلیم احمد تو خیر کھل کر نظریاتی آدمی تھے' مگر اشفاق تخلیقی سطح پر ان سرچشموں تک جا پہنچتے تھے جو ہماری تہذیب کے اصل ماخذ ہیں۔

جب اشفاق نے دیسی بابوں کا ذکر شروع کیا تو کسی نے کہا یہ ادھر کہاں جا نکلے' کوئی بولا' قدرت اللہ شہاب کی صحبت نے خراب کر دیا' کسی نے کچھ کہا' مگر داستان گو اپنی بات کرتا رہا۔ وہ پہلے بھی اپنی کہانیوں میں اپنی مٹی سے ذہانتیں تلاش کرتا تھا' اب بھی اس کا سفر اسی سمت تھا۔ وہ پہلے بھی اپنے اندر سے ہیرے تلاش کرتا تھا' اب بھی وہ اسی کو صراط مستقیم سمجھتا تھا۔ اس نے تو ادھر اُدھر کی چکا چوند سے مرعوب ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے جب اس نے حلقہ ارباب ذوق میں اپنی ایک تحریر پڑھی تھی' میں اس اجلاس میں موجود تھا۔ کیا خوبصورت انداز تھا۔ کچھ ایسی بات تھی:

باباجی سے اجازت مانگی' انہوں نے کہا' کھانا کھا کر جاؤ' دیگچی سے کھانا نکال کر دیا اور ساتھ پنکھا جھلنے لگے کہ مکھیاں نہ آئیں' کیونکہ باہر درخت تلے' ان سے مفرنہ تھا۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی' جماعت شروع ہوئی' ہم نے باباجی سے کہا' حضور

گناہگار نہ کیجئے' جماعت جا رہی ہے۔ کہنے لگے بیٹا' عبادت کی قضا ہے' خدمت کی قضا نہیں۔

کیا بات کی' میں آج تک اس ایک فقرے کا اسیر ہوں۔

بات یوں بھی کی جا سکتی ہے' لوگ سوچنے لگے۔ جب کسی کانفرنس میں خواہ مخواہ انگریزی میں گرم گفتاری ہو رہی ہوتی' میں نے کئی بار دیکھا اشفاق احمد آتے' پل بھر میں انگریزی بولنے والوں کا مذاق اڑاتے' انہیں شرمندہ سا کر جاتے اور بڑے وقار کے ساتھ اردو میں بولتے ہوئے داد سمیٹتے جاتے۔ یوں کہ اس کے بعد کوئی انگریزی بولنا بھی چاہتا تو زبان ساتھ نہ دیتی۔

وہ اس مٹی کی روح تھا جس میں میری صدیوں کی بصیرتیں چھپی ہوئی ہیں۔

پھر وہ وقت آیا جب اس داستاں گو نے اپنے لئے ایک زاویہ نشیں کا منصب تلاش کیا۔

وہ اب بھی داستاں گو تھا۔

وہ اب بھی ایک تخلیقی فنکار تھا۔

وہ اب بھی اس مٹی کے رس کا رسیا تھا' اپنی روح کا متلاشی تھا۔

Indigenous Wisdom شائد اسے ہی کہتے ہیں۔

اُدھر مغرب میں' میرا مطلب ہے المغرب میں خانقاہ کے لئے زاویہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نے اب چٹکیاں لینے کے انداز میں اپنے پروگرام کے لئے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

کیا اشفاق احمد شیخ بن بیٹھا تھا۔

ذرا غور سے سنئے یہ وہی داستاں گو ہے جو دیسی زبان میں دیسی عقل کے موتی رول رہا ہے۔

آپ کو ولایتی مال چاہئے۔

مگر تم سنو تو سہی یہ کہہ کیا رہا ہے۔

یوں لگتا ہے' یہ اس کے سارے تخلیقی سفر کا نقطہ عروج تھا جس میں برسوں کی ریاضت اور صدیوں کی بصیرت بولتی تھی۔

یہ خالص میری مٹی کی آواز ہے' میرے دیس کی بصیرت ہے' میرے پاکستان کی روح ہے' جسے یہ داستاں گو کس سادگی سے سنا رہا تھا۔

لوگ سن رہے تھے۔

زمانہ بڑے شوق سے سنا رہا تھا۔

تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

الوداع' اے روح عصر' الوداع! الوداع' اے میری گمشدہ متاع' الوداع! الوداع' میری روح کی آواز' الوداع! الوداع' میری مٹی کی پہچان' الوداع! الوداع! الوداع...... اب پھر کوئی ایسا داستاں گو نہیں آئے گا۔ الوداع' اے میرے داستاں گو الوداع!

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

تلقین شاہ کا انتقال

(شذرہ)

اشفاق احمد خان جو کہ اپنے مقبول زمانہ ریڈیو پروگرام کے حوالے سے تلقین شاہ کے نام سے بھی معروف تھے' گذشتہ روز انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اشفاق احمد خان زبان و ادب کے استاد رہے۔ قابل ذکر افسانہ نگار' ممتاز ڈرامہ نگار' دانشور اور صوفی منش انسان تھے۔ پاکستان کے ادبی اور سماجی حلقوں میں اشفاق احمد ادب و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اشفاق احمد ایک پاکستانی قوم پرست اور دل کی گہرائیوں سے مسلمان تھے۔ انہیں طویل عرصہ اٹلی میں پڑھانے کا موقع ملا جہاں انہوں نے اطالوی زبان سیکھی اور اس پر ایسا عبور حاصل کیا کہ اٹلی کے لوگ ان سے اپنی زبان سیکھتے رہے۔ اشفاق احمد نے کئی پاکستانی تصانیف کا اطالوی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

اشفاق احمد برس ہا برس اردو سائنس بورڈ کے چیئرمین رہے۔ انہوں نے بورڈ کے کام کو اس قدر متحرک کیا کہ بورڈ جلد ہی خود کفیل ہو گیا۔ اشفاق احمد خان مرحوم نے خود ادب اور تصوف کے بہت سے متوازن امتزاج سے ٹی وی ڈراموں کے متعدد سلسلے شروع کئے جو ہمیشہ عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ انہوں نے پروفیسر' ادیب' ڈرامہ نگار اور ایک متکلم (خطیب) کی حیثیت سے تین نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ ادب و دانش تحریر و تقریر کے حلقوں میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ آخری دنوں میں وہ ایک صوفی کے طور پر ٹی وی کے پروگرام "زاویہ" کے ذریعے اخلاقی قدروں کے فروغ کے لئے کوشاں رہے اور اپنے مخصوص و منفرد انداز میں نوجوان نسل کی رہنمائی کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

8 ستمبر 2004ء

مرحوم اشفاق احمد

عطاء الرحمن

(تجزیہ)

اشفاق احمد کے انتقال سے اردو زبان و ادب ایک سربرآوردہ افسانہ نویس و انشا نگار، براڈ کاسٹنگ کے فن کے چوٹی کے ماہر، برصغیر کی مسلم تہذیب کی مختلف جہات میں دلچسپی رکھنے والے ان کے اندر ڈوبی ہوئی شخصیت اور لاہور کی مجالس اپنے 'بابے' یا مرد دانا سے محروم ہو گئی ہیں۔ ایک عہد کا خاتمہ ہوا۔ ایک مجسم تہذیبی سفر تھا جو اختتام پذیر ہوا۔ افسانہ نگاری کی ایک منفرد روائت تھی جو اپنے بانی کی وفات کے بعد معلوم نہیں قائم رہتی ہے یا نہیں۔ اردو براڈ کاسٹنگ کا فن ایک مجتہد سے محروم ہو گیا۔ تہذیب، شائستگی اور حسن کلام کا ایک چلتا پھرتا نمونہ تھا جو آسودہ خاک ہو گیا۔ اشفاق احمد ایک فرد نہیں پوری انجمن تھے۔ محض ادیب نہیں، نئے ادبی رجحانات کو فروغ دینے والی ادیب ساز شخصیت تھے۔ وہ باتیں نہیں کرتے تھے اپنے خوبصورت جملوں اور الفاظ کے حسن انتخاب کے ذریعے موتی بکھیرتے اور دلوں کو موہ لیتے تھے۔ ادب اور ثقافت کے لحاظ سے ایک جامع الصفات شخصیت تھے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ مسلم تہذیب کی اعلیٰ قدروں اور ہمارے سماج کی بعض روائتی خوبیوں پر ان کا ایقان اتنا گہرا تھا کہ بڑے بڑے مغرب زدہ دانشوران کے بیان کے آگے سر جھکاتے نظر آتے تھے۔ ہماری کئی ایک سماجی قدروں میں سے جنہیں ہم نے فرسودہ سمجھ رکھا ہے، حکمت و دانائی کے ایسے نکات نکالتے تھے کہ سننے والا عش عش بھی کر اٹھتا اور اشفاق احمد کی نظر کی گہرائی کا بھی قائل ہو جاتا۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ تحریر میں، ریڈیو پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور مجلسی گفتگو کے دوران جگالی ہرگز نہیں کرتے تھے اپنی بات کہتے تھے۔

منفرد انداز میں کہتے تھے۔ تخلیقی شان اور ادبی آہنگ کے ساتھ کہتے تھے۔ میں نے ابلاغ عامہ کے فن کا اتنا بڑا ماہر کم دیکھا ہے۔ مرحوم کا کمال یہ تھا کہ جہاں کسی چوٹی کے دانشور اور صاحب علم کے ساتھ اعلیٰ تر علمی سطح پر گفتگو کرتے اور موضوع پر پوری گرفت اور مہارت کے ساتھ کرتے وہیں اپنے ریڈیو پروگراموں کے ذریعے عام شہری کیا۔ دیہاتی سامعین تک کے ساتھ اس دلکش انداز اور اس کے لب و لہجے میں ہم کلام ہوتے کہ وہ ان کے پروگراموں کا گرویدہ ہو کر رہ جاتے۔ 60 کی دہائی میں مقبولیت کے ریکارڈ چھو لینے والا ریڈیو پروگرام تلقین شاہ اسی خوبی کی وجہ سے خواص و عام کے کانوں میں رس گھولتا تھا۔ میں اس زمانے میں لاہور کے ایک ممتاز کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ کالج کے پروفیسر حضرات سے لے کر عام طلبہ تک کو ایک روز پہلے کے 'تلقین شاہ' والے نشریئے کے مکالمے ازبر ہوتے تھے۔ وہ زبان و بیان کے مزے لے کر دوسروں کے سامنے انہیں دہراتے اور خوشگوار تبصرہ کرتے۔ ان دنوں اگر کسی قصبے یا دیہات میں جانے کا اتفاق ہوتا تو وہاں بھی 'تلقین شاہ' پروگرام کی مقبولیت کا یہی عالم ہوتا۔ ابلاغ عامہ کا اس سے بڑھ کر کمال کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ٹیلیویژن کا دور آیا تو ادیب و افسانہ نویس اشفاق احمد کے شاہکار ایک محبت سو افسانے نے ڈرامے کا روپ اختیار کر کے ناظرین کو اس طرح متوجہ کیا کہ یادگار بن گیا۔

مجھے اسی کی دہائی میں اشفاق احمد کے ساتھ ریڈیو کے ایک مذاکراتی پروگرام میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ میں ایک غیر معروف طالب علم تھا۔ اشفاق احمد مرحوم مانے ہوئے دانشور اور تسلیم شدہ بلکہ صحیح تر الفاظ میں Accomplished براڈ کاسٹر میں اگرچہ بہت تیاری کر کے گیا۔ لیکن مرحوم کے سامنے میری کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان کی عظمت تھی کہ ایک قطعی غیر معروف اور اپنے سے عمر و علم و مطالعہ میں بہت کم درجے کے فرد کو برابر کی سطح پر بٹھا کر شریک مذاکرہ ہوئے۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا اس کا ایک ایک

لفظ یوں سمجھئے کہ رٹ کر گیا تھا۔ خوف تھا کہ پٹ نہ جاؤں' وہاں بے نیازی کا عالم تھا۔ فی البدیہہ گفتگو تھی۔ خیالات کی روانی تھی' بے تکلف الفاظ اور فقروں کی آمد تھی..... ریکارڈنگ ختم ہوئی..... سٹوڈیو سے باہر نکلے..... اشفاق احمد نے تھپکی دی بہت حوصلہ افزائی کی۔ کہا میرے خیال میں تمہیں لکھنا چاہئے۔

اشفاق احمد مرحوم اہل مغرب کی معاشرتی اقدار پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کے بعض کمزور پہلوؤں کو بڑے خوبصورت اور حکیمانہ انداز میں طشت از بام کرتے تھے۔ 1997ء میں پیرس کی ایک سڑک پر کار کے حادثے میں شہزادی ڈیانا کا انتقال ہوگیا تو میں نے اشفاق صاحب سے انٹرویو کیا۔ میرا ایک سوال تھا کہ شہزادی کی موت پر برطانیہ کے لوگ اتنے غمزدہ کیوں ہو گئے ہیں۔ انگریزوں جیسی متحمل مزاج اور مستحکم شخصیتوں کی شہرت رکھنے والی قوم' لیکن اس حادثے نے تو ان کے بڑے بڑے آدمیوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ کیا پرنس آف ویلز کی مطلقہ شہزادی میں کوئی خاص خوبی تھی۔ جو ولی عہد شوہر کو تو نظر نہ آئی لیکن بقیہ قوم اس پر فریفتہ تھی۔ یا حسین شہزادی کی حادثاتی موت میں کوئی ایسی بات تھی جو انگریز مرد و خواتین کے دلوں کو اس حد تک مغموم کر گئی ہے۔

اشفاق احمد سے یہ سوال اس تناظر میں بھی کیا گیا تھا کہ شہزادی ڈیانا طلاق لینے کے بعد مرحوم کے بھانجے اور برطانیہ میں مقیم ڈاکٹر حسنات احمد کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی۔ ان سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی۔ پاکستان آئی تو حسنات کے ماموں اشفاق احمد سے ملاقات کرنے ان کے گھر بھی آئی اسی کمرے میں بیٹھ کر اشفاق احمد سے میں نے درج بالا سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ انگریز پچھلی دو اڑھائی صدیوں کے دوران خطہ ارض کی سب سے بڑی سامراجی قوم رہے ہیں۔ سامراج اور گناہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ محکوم اقوام پر ظلم روا رکھے بغیر سامراجی اقوام اپنی سطوت و حکمرانی کے جھنڈے نہیں گاڑ سکتیں۔ انگریز چونکہ سب سے بڑے سامراجی تھے۔ اس لئے ان کے

مظالم بھی اتنے بڑے اور محکوم قوموں کے خلاف گناہ بھی اتنے زیادہ تھے۔ اب چونکہ یہ دور ختم ہوگیا ہے لیکن ان کی اجتماعی نفسیات میں احساس جرم تو پایا جاتا ہے۔ جو کسی طرح اپنا اظہار چاہتا تھا' اتنی خوبصورت شہزادی کی جو مرنے سے پہلے مظلوم بن چکی تھی حادثاتی موت نے انہیں رونے کا بہانہ فراہم کردیا ہے۔ وہ شہزادی کے مرجانے پر نہیں اپنے تاریخی جرم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے رو رہے ہیں۔

گذشتہ اتوار کی شام میں نے اپنے دوستوں محمد مشکور اور ندائے ملت کے کالم نگار محسن فارانی کے ساتھ دو بزرگوں کی عیادت کا پروگرام بنایا۔ دونوں ماڈل ٹاؤن کے مقیم' پہلے ہم ریاست حیدر آباد کی زندہ یادگار نواب مشتاق احمد کی رہائش گاہ پر گئے۔ نواب صاحب جنہوں نے قائداعظم کی خواہش پر پاکستان کے پہلے بجٹ کی تیاری کے موقع پر بانی پاکستان کی خدمت میں نظام میر عثمان علی خان کی جانب سے بیس کروڑ روپے نقد کی رقم لاکر پیش کی تھی اب ایک سو ایک سال کی عمر کو جا پہنچے ہیں۔ کمزور اور لاغر ہیں لیکن ذہن توانا ہے۔ ہم ان کی رہائش گاہ پر گئے تو بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ مختصر گفتگو کی' معذرت کی کہ اکیلے ہیں' کنبے کا کوئی فرد پاس نہیں' تواضع نہیں کر سکتے' ہمارے لئے ان کی زیارت سے بڑھ کر کوئی تواضع ہو نہیں سکتی تھی۔ ایک دو واقعات سنائے۔ ان کے آرام کے پیش نظر ہم نے جلد رخصت لی۔ باہر نکلے۔ محمد شکور نے گاڑی کا رخ اشفاق احمد کی رہائش گاہ داستان سرائے کی جانب موڑ دیا۔ میں نے کہا چونکہ علالت کی شدت ہے۔ اس لئے ہم دروازے کے سامنے گزرنے کے دوران دعائے صحت کریں اور آرام میں مخل نہ ہوں اور آج ان کی روح کے قفس عنصری سے پرواز کر جانے کی خبر ملی قلم برداشتہ یہ سطور صفحہ قرطاس پر منتقل ہوگئی ہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

روزنامہ نوائے وقت لاہور

8 ستمبر 2004ء

قوم ایک شجر سایہ دار صوفی سے محروم ہوگئی

ملک قوم کا اثاثہ تھے' خدمات ناقابل فراموش ہیں' معاشرے کا رہنما جدا ہو گیا سچا کھرا انسان بچھڑ گیا۔

صدر مشرف وزیر اعظم شوکت عزیز' شیخ رشید' پرویز الٰہی' خالد مقبول' نواز شریف کا اظہار افسوس۔

اسلام آباد (خصوصی رپورٹر) صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف اور وزیر اعظم شوکت عزیز سابق وزیر اعظم' چوہدری شجاعت حسین چیئرمین سینٹ محمد میاں سومرو وزیر اطلاعات شیخ رشید نے اشفاق احمد کے انتقال پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے وہ ملک وقوم کا اثاثہ تھے ان کی گرانقدر خدمات ناقابل فراموش ہیں انہوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ وہ ایک نامور دانشور تھے ملک ایک دانشور اور صوفی سے محروم ہو گیا ہے وہ ایک محب الوطن انسان دوست شخصیت تھے ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا برسوں تک پر نہیں ہوگا انہوں نے مرحوم کی مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا کرتے ہوئے سوگواران کے لیے صبر جمیل کی دعا کی ہے وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی نے نامور دانشور' افسانہ نگار اور براڈ کاسٹر اشفاق احمد خان کی وفات کو قومی نقصان قرار دیا ہے انہوں نے کہا کہ اشفاق احمد جیسی شخصیتیں روز بروز پیدا نہیں ہوتیں' وہ پاکستان کا ایک ایسا قیمتی علمی اور ادبی اثاثہ تھے جس پر کوئی بھی معاشرہ فخر کر سکتا ہے وہ ان چند مصنفین میں سے تھے جن کی تحریروں نے مجھے ذاتی زندگی میں متاثر کیا انہوں نے کہا کہ وہ اشفاق احمد کی گفتگو اور نگارشات سے راہنمائی اور روشنی حاصل کیا کرتے تھے میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ بانو قدسیہ کو جو خود بھی اردو ادب کی بہت بڑی شخصیت ہیں' یہ صدمہ جرات اور ہمت کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول نے کہا

ہے کہ اشفاق احمد ہمارے معاشرے پر نظر رکھنے والے اور معاشرے کو سمجھنے والے مفکر اور عالم تھے آج معاشرے کی رہنمائی کرنے والا انسان ہم سے جدا ہو گیا ہے گزشتہ روز ممتاز دانشور اشفاق احمد کی نماز جنازہ کے موقع پر صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اشفاق احمد معاشرے کی تربیت کرنے والوں میں شامل تھے مجھے امید ہے یونیورسٹی ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں شاندار خراج تحسین پیش کرے گی۔ سابق صدر رفیق تارڑ نے کہا کہ اشفاق احمد معاشرے کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے انہوں نے ہمیشہ حق وصداقت کی آواز بلند کی۔ ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین راؤ سکندر اقبال نے ڈاکٹر اشفاق احمد کے انتقال پر گہرے دکھ رنج اور غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ پوری قوم ایک شجر سایہ دار سے محروم ہو گئی ہے ان کی فکر ایک رہنما ہے جس پر چلتے ہوئے معاشرے میں محبت برداشت رواداری اور انسانوں سے پیار کے کلچر کو فروغ دیا جا سکتا ہے پاکستان مسلم لیگ کے مرکزی سیکرٹری جنرل سید مشاہد حسین وزیر مملکت محمد علی درانی اور ممبر قومی اسمبلی شیخ وقاص اکرم نے ڈاکٹر اشفاق احمد کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ صرف ملک وقوم ہی نہیں انسانوں سے محبت کرنے والوں کا نقصان ہے ان کا ہمیں چھوڑ کر چلے جانے پر آج دل اندر سے رو رہا ہے وہ سب کے تھے ان کی فکر اور تعلیمات ایک اثاثہ ہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے قائد محمد نواز شریف اور صدر محمد شہباز شریف نے ممتاز ادیب' دانشور اور درویش صفت انسان اشفاق احمد کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستانی قوم ایک مایہ ناز ادیب' دانشور' روحانی استاد اور کھرے انسان سے محروم ہو گئی ہے اشفاق احمد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کو اللہ تعالی نے تخلیق کی بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اور انہوں نے ساری زندگی اپنی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں استعمال کیا۔

روزنامہ "جناح" لاہور

8 ستمبر 2004ء

اشفاق صاحب

امجد اسلام امجد

(چشم تماشہ)

میر صاحب نے کہا تھا!

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

آج شام کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں ماڈل ٹاؤن ڈی بلاک کے پارک میں رکھی ہوئی ایک چارپائی کے گرد گھیرا کرتی خلق خدا کو دیکھ کر پتہ نہیں یہ شعر کیوں ہمیں بار بار یاد آیا اس دنیا کی تماشہ گاہ میں کرداروں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے کہ موت اور زندگی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں مگر کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ منظر سے ایک کردار کچھ ایسے Exit کرتا ہے کہ پس منظر اور پیش منظر دونوں ہی دھندلا سے جاتے ہیں ہمارے نزدیک اشفاق صاحب بھی ہماری آپ کی زندگیوں پر مشتمل ایکٹ کے ایک ایسے ہی مرکزی کردار تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے انہیں پہلی بار ہم نے اپنے فلیمنگ روڈ والے مکان کے قریب واقع شبیر پان والے کی دکان پر دیکھا تھا ان کے ساتھ اے حمید تھے جوان دنوں اایک ملحقہ گلی میں رہتے تھے دونوں حضرات اتنے خوش رو اور جامہ زیب تھے کہ وہ اس ماحول میں کچھ اوپرے اوپرے سے لگتے تھے ہم سکول کے آخری سالوں میں تھے چنانچہ جب کسی نے بتایا کہ یہ دونوں منفرد نظر آنے والے شخص مشہور ادیب ہیں تو ہم نے فوراً فیصلہ کیا کہ سکول کی لائبریری میں سے ان کی کتابیں لے کر پڑھیں گے تاکہ پتہ چل سکے کہ یہ کیا اور کیسا لکھتے ہیں کیونکہ اس وقت تک ہمارے آئیڈیل اور پسندیدہ ترین ادیب صرف دو تھے شفیق الرحمن اور ابن صفی۔ سکول کی لائبریری سے ان کی کتابیں طلب کرنے پر لائبریرین نے ہمیں جن نظروں سے دیکھا وہ آج تک ہمارے ذہن پر نقش ہیں کچھ ٹھیک سے یاد نہیں کہ سب سے پہلے ہم نے اشفاق صاحب کی کون سی تحریر پڑھی لیکن ہمارا تاثر کچھ کچھ ویسا ہی تھا جس کا اظہار مولانا حالی

نے ایک گورے افسر کی تقریر کے حوالے سے کچھ یوں کیا تھا کہ

اے بزم سفیران دل کے سخن آرا

پرخورد دکلاں تیری مفاہمت پہ فدا ہے

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے

اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ' کچھ بول رہا ہے

ہماری نارسائی یا کم فہمی کی وجہ تو شاید ہماری عمر اور مطالعے کی کمی تھی لیکن اشفاق صاحب کو ساری عمر بے پناہ' مقبولیت کے باوجود جزوی طور پر ایک ایسے ہی ردعمل کا سامنا رہا کہ ان کی فکر اور موضوعات کا انوکھا پن ان کے عہد کی اجتماعی سوچ سے ہمیشہ کچھ قدم آگے ہی رہا اور یوں وہ بھی کچھ حوالوں سے غالب کی طرح ایک نا آفریدہ گلشن کے ہی عندلیب رہے افسانوں میں ''توتے بلے'' سے لے کر طلسم ہوش افزا کی کہانیوں تک اور ڈراموں میں ''حیرت کدہ'' سے لے کر ''من چلے کا سودا'' تک ان کے ابلاغ کی ایک سطح قارئین اور ناظرین کے لئے ایک حد تک ایک ایسا ''چیستان'' رہی جس میں کشش اور گریز کی دونوں رویں ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور اس بات نے ہمیں ہمیشہ حیران رکھا کہ ایک ہی شخص بیک وقت ''آسان'' اور ''مشکل'' کا ایسا غیر معمولی ماہر کیسے ہو سکتا ہے جن دنوں ٹی وی پر ان کے ابتدائی ڈرامے ''ٹاہلی تھلے'' اور ''اُچے برج لاہور دے'' چلا کرتے تھے ہمارے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن اس سکرین پر ہمارا نام بھی بطور ڈرامہ نگار آیا کرے گا یوں ہماری نسل کے لکھنے والوں کے لئے ٹیلی پلے لکھنے کی ایک ہی ٹریننگ اکیڈمی تھی جس کا نام تھا ''اشفاق احمد''۔

ان سے بالمشافہ ملاقات خالد آفتاب (جواب ڈاکٹر خالد آفتاب اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں) کے توسط سے ہوئی جو ان کے سگے بھتیجے اور ایم اے او کالج میں ہمارے کولیگ تھے اور جن کے مزنگ والے گھر کے ایک بالا خانے میں ہم طفیل نیازی مرحوم سے اشفاق صاحب کی فلم ''دھوپ سائے'' کے گانے سنا کرتے تھے جو ایک ہفتہ چل کر ڈبوں میں بند ہو گئی تھی کہ اپنی چند تکنیکی کمزوریوں سے قطع نظر یہ فلم بھی اپنے وقت سے آگے کی چیز تھی۔

ستر کی دہائی میں ان کی بے مثال ٹی وی سیریز ''ایک محبت سو افسانے'' (جس کی بیشتر کہانیاں ان کے افسانوں پر مبنی تھی) آن ایئر ہوئیں تو وہ ٹی وی ڈرامے کے حوالے سے آئیڈیل اور رول ماڈل بن گئے اور ''نکھار'' جیسے پروگراموں کے توسط سے وہ بطور کمپیئر ٹی وی کی محبوب اور پسندیدہ ترین شخصیت سمجھے جانے لگے سو ہماری ان سے نیازمندی تو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ مگر ہمارے ابتدائی ڈراموں کو ہی انہوں نے جس طرح سراہا اور جس قدرت محبت اور شفقت سے ہماری سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی اس کا سارا کریڈٹ ان کی خوب صورت اور سایہ دار درخت جیسی شخصیت کو جاتا ہے کہ اس وقت سے لے کر اپنے دم آخر تک ان کی شفقت ہمارے شامل حال رہی اور وہ (بانو آپا سمیت) ہماری ہر کامیابی پر اس طرح خوش ہوتے رہے جیسے ماں باپ اپنے بچوں کی خوشیوں میں خوش ہوتے ہیں۔

اشفاق صاحب کی زندگی طرح طرح کے کارناموں سے بھری پڑی ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کی ایک بہت بڑی Contribution (جس کا اعتراف کرنے کی بجائے کچھ حلقوں میں اسے تمسخر کا نشانہ بنایا گیا) اپنے عہد کے انسان کو پورا اور مکمل انسان بننے کا درس دینا ہے جو طبعیات اور مابعد الطبیعات دونوں کو ساتھ لے کر چلنے والا ہو کہ انسان کی زندگی جانوروں کی طرح صرف جسمانی سطح پر کھانے پینے افزائش نسل کرنے اور مر جانے تک محدود نہیں ہے۔

اس کا ایک حصہ اس کے اشرف المخلوقات ہونے اور اپنے اس خالق کو ڈھونڈنے اور اس کی منشا کو جاننے سے بھی متعلق ہے جس نے یہ دنیا اور کائنات ایک متعین پروگرام کے حساب سے بنائی ہے ان کے آخری بیس برسوں کی تحریریں اور تقریریں واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں وہ انسانی زندگی میں ''روحانیت'' کو ہر سطح پر شامل کر کے ایک ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش میں تھے جہاں انسان جسمانی و روحانی زندگی کا ایک بہتر ملاپ حاصل کر سکے۔

تنقید اور مخالفت ہر منفرد اور تخلیقی سوچ رکھنے والے ابن آدم کی ہم قدم ہوتی ہے سو یہ معاملہ اشفاق صاحب کے ساتھ بھی رہا یہ وقت اس کی تفصیل میں جانے کا نہیں سو ہم اس بات کو کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہوئے اپنے خان صاحب/ بابا جی/ اور تلقین شاہ کو اسی دعا کے ساتھ رخصت کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان کے لئے آخرت کی ان منزلوں کو آسان فرما دے جس کا حال خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کا سانحہ ارتحال

(شذرہ)

ممتاز براڈ کاسٹر، ڈرامہ نگار، ادیب اور صوفی اشفاق احمد اگلے روز 80 برس کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے اور انہیں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مرحوم اشفاق احمد ایک ہمہ جہت شخصیت تھے اور انہوں نے اپنے عہد کی قریباً تین نسلوں کو متاثر کیا۔ وہ ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب کے دوست ساتھی اور ہم عصر تھے اور انہی کی طرح صوفی ازم اور روحانیت پر بہت گہرا یقین رکھتے تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی وفات سے اس تسبیح کے دانے بکھر کر اس طرح ناپید ہو گئے ہیں کہ اب کسی طرح ایسے نادر روزگار لوگوں کا اجتماع ممکن نہیں ہوگا۔ معاصرانہ چشمک کے باعث ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی لیکن انہوں نے روایتی صوفیانہ انداز میں کبھی اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی کوشش نہ کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے شدید حریفوں کو بھی اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ اپنے عہد کے ایک بڑے آدمی تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

روزنامہ جنگ لاہور

9 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد بھی روٹھ گیا!

عرفان صدیقی

(نقش خیال)

اشفاق احمد بھی روٹھ گیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے یوں اچانک چلے جانے سے دنیا کتنی سونی ہو جائے گی اور اس سے محبت کرنے والوں کے دل کتنے ویران، کتنے خالی خالی ہو جائیں گے۔ جانے اسے کیا جلدی تھی؟ ابھی تو کہانی ایسے موڑ پر پہنچی تھی کہ سارا مجمع گوش بر آواز تھا کہ داستان گو خاموش ہو گیا۔ سننے والے جانے کب تک پتھر بنے رہیں گے اور ان میں پھر سے جان ڈالنے والے شہزادے کی سواری جانے کب ادھر سے گزرے گی؟

وہ عجب شخص تھا۔ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، شاعر، سکرپٹ رائٹر، دانشور، حکیم، فلسفی، صوفی، داستان گو، سفرنامہ نگار لیکن اس کی یہ ساری حیثیتیں رنگ و بو کے مرقعے کی طرح اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھیں۔ بہت کچھ لکھنے اور بہت کچھ بولنے کے باوجود اس کی ذات میں عجب طرح کی پراسراریت تھی اور یہی اسرار اس کی شخصیت کا اعجاز تھا۔ 1980ء کی دہائی میں مجھے ریڈیو والوں نے ڈرامے لکھنے پر ڈال دیا۔ میرے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ چھپا تو اشفاق صاحب نے کمال شفقت سے اپنے تاثرات قلمبند کئے۔ اس مجموعے میں شامل ایک ڈرامے "یہ کہانی ختم ہوئی" کا موضوع محبت تھا۔ دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ایک ملاقات میں ان کی کتابوں کا ذکر چلا تو میں نے کہا "اشفاق صاحب! آپ کی بیشتر کتابیں میں نے پڑھ رکھی ہیں لیکن "سفر در سفر" مجھے بے حد پسند آئی۔ اس کی بات ہی کچھ اور ہے"۔ اشفاق صاحب مسکرائے اور بولے "سفر در سفر پڑھنے والوں کی نہیں، لکھنے والوں کی کتاب ہے"۔ کوئی ہفتہ بھر بعد ڈاکیا ایک پارسل لایا۔ کھولا تو اس میں "سفر در سفر" کے تازہ ایڈیشن کا ایک نسخہ تھا۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر خوشخط الفاظ میں لکھا تھا۔

"عزیز گرامی، عرفان صدیقی کے لئے، جس نے ریڈیو ڈرامے کی روایت کو بڑا سہارا

دیا ہے۔ اشفاق احمد 8 فروری 1990ء"

'سفر در سفر' میرے سامنے رکھی ہے اور میں لفظوں کے بانجھ پن کا شکار ہوں کہ کیا لکھوں۔ اشفاق احمد کے بارے میں ''مکتب فکر'' کا لفظ تو بہت ہی چھوٹا لگتا ہے' اس کو وہ قامت شخص کے سامنے ''دبستان'' کا لفظ بھی بونا دکھائی دیتا ہے۔ اسے ایک 'عہد' کہتے ہوئے بھی تشنگی نہیں بجھتی۔ وہ تو ایک 'زمانہ' تھا۔ صدیوں پر محیط زمانہ۔

ایک زمانے کی روے' جس میں نہ دن ہے نہ رات

یہ کوئی بارہ چودہ برس پہلے کی بات ہے' میں لاہور میں آیا ہوا تھا کہ میری ایک پرانی شاگرد مجھے ملنے آ گئی۔ وہ ان دونوں ایک مقامی ہسپتال میں بطور ڈاکٹر تعینات تھی۔ باتوں باتوں میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ایک اچھے خاندان کے شریف النفس ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن سخت گیر والد آمادہ نہ ہو رہا تھا۔ وہ خاندانی روایت اور محبت کی تنی رسی پر چل رہی تھی اور والدین سے بغاوت نہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر وہ اچانک بولی'' آپ اشفاق احمد کو جانتے ہیں؟'' میں نے کہا'' ہاں جان پہچان ہے'' وہ بڑی لجاجت سے بولی'' سر پلیز مجھے ان کے پاس لے چلیں' میں سب کچھ انہیں بتا کر ان سے رہنمائی لینا چاہتی ہوں''۔ میں محبت کی آگ میں پگھلتی لڑکی کو اشفاق احمد صاحب کے ہاں لے گیا۔ داستان سرائے کے لان میں تین کرسیاں ڈال دی گئیں۔ ڈاکٹر نے کتھا شروع کی اور داستان گو ایک مووب سامع کی طرح پتھر کا بت بن گیا۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا کہ محبت میں جنوں کی حدوں کو چھو لینے والی یہ معصوم لڑکی ایک انتہائی مصروف انسان کے سامنے کیا کہانی لے بیٹھی ہے۔ دیر بعد اس نے درد کی لمبی حکایت ختم کی تو میں اشفاق صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ حکیمانہ تلقین کی صندوقچی کھولیں گے' ان کے اندر کا داستان گو چوکڑی مار کر بیٹھ جائے گا اور داستان سرائے کے عین اوپر منڈلاتی شام مرصع کشیدہ کاری والا گھگھرا پہن کر گہری سبز رنگ گھاس پر اترے گی تو نوجوان لڑکی دیکھتے دیکھتے سنگ مرمر کی گڑیا بن جائے گی لیکن اشفاق صاحب نے سر کھجایا اور لڑکی کی طرف دیکھے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئے'' عرفان یار کچ کرنا پے گا'' اور پھر اس نے ایسا کچھ کیا کہ ساری مشکلیں دور

ہو گئیں۔ ڈاکٹر کے والدین نے اسے اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھا کر رخصت کیا اور آج وہ اپنی محبت کی ہمسفری میں تین خوبصورت بچوں کے ساتھ امریکہ میں رہ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اشفاق احمد کی موت نے اسے اداس کر دیا ہوگا اور اسے ''داستان سرائے'' کی وہ دل گرفتہ سی شام ضرور یاد آئی ہوگی۔

اشفاق' پاکستانیت میں گندھے گداز کا نام تھا۔ وہ اپنی تہذیب وثقافت کے رنگوں سے سجا ایسا حجرہ تھا جس کے منقش در و دیوار کی ہر ہر بیل' ہر ہر بوٹے میں اپنے پن کی پچی کاری دکھائی دیتی تھی۔ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو خدا ماننے والے دانشگروں کا جی بھر کا مضحکہ اڑایا۔ اس نے مغرب کے طلسم کا شکار' بیمار ذہنوں کے مقابلے میں توانا قوی خودی کو اس انداز سے پیش کیا کہ بے سمت اور بے مہار ''ترقی'' تہمت بن کر رہ گئی۔ اشفاق احمد نے اپنی تہذیب' اپنی ثقافت' اپنی بو باس' اپنی لوک دانش اور اپنے پرکھوں کی میراث کو اس عمدگی سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں میں سمویا کہ ان کا اسلوب ایک منفرد حیثیت اختیار کر گیا۔ ایسا اسلوب جس میں اپنے پہاڑوں کی گونج' اپنے چشموں کا ترنم' اپنی فصلوں کی لہلہاہٹ اور اپنی بہاروں کا نکھار رچا بسا ہے۔ اس کا قاری اس کے اسلوب کی جادوگری سے نکلنے کے سارے راستے بھول جاتا ہے۔ اشفاق قدامتوں کے غاروں میں بیٹھا جدت پسند تھا۔ ''تلقین شاہ'' اس کی اسی انفرادیت کا نمونہ تھا۔ یہ ریڈیائی پروگرام 42 سال تک گھروں' گلیوں' مجلسوں اور چوپالوں کا موضوع بنا رہا۔ خود اپنی ذات پر تیر برسانے والا تلقین شاہ' شاید آنے والے کئی سالوں میں بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے۔

اشفاق احمد کے جانے سے بھرا پرا پاکستان خالی سا دکھائی دینے لگا ہے۔

جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکونِ مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

'سفر در سفر' کے ایک باب میں اشفاق احمد نے اپنی موت کے بعد کے منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ میں درد اور گداز میں ڈوبے یہ صفحات بیسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ آج پھر میں نے اشفاق صاحب کا بھیجا ہوا نسخہ نکالا اور خود اپنے تازہ زخم پر نمک پاشی کرنے لگا۔ اشفاق لکھتا ہے:

''میں اپنی موت کے غم میں دکھ سے اس قدر بھر گیا کہ میرے آنسو نکل آئے لیکن میرے مرنے کے بعد کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ لاہور کا نیا ریڈیو سٹیشن اسی طرح چلتا رہے گا؟ کتنے ظلم کی بات ہے۔ لوگ ریڈیو سٹیشن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے نہیں لگ جائیں گے اور میری کمی محسوس نہیں کریں گے؟ ضرور کریں گے۔ میرے دل نے کہا اور مجھے بڑی تسلی ہوئی۔ باہر کے لوگوں کے بارے میں تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن لاہور کے لوگ اس کمی کو ضرور محسوس کریں گے۔ شدت سے کریں اور پھر دیر تک کرتے رہیں گے۔ شاید کئی سالوں تک۔ بہت ممکن ہے ساری عمر۔ میں تو کئی حلقوں کا محبوب ہوں۔ قارئین کا محبوب، سامعین کا محبوب، ناظرین کا محبوب .... یہ سب لوگ میرے بغیر کس طرح زندہ رہ سکیں گے اور راتوں کو سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنے اپنے بستر جھاڑ کر اور اپنے تکیے سیدھے کر کے آرام سے کیسے سو جایا کریں گے بھلا! .... ؟

استاد امانت علی خان فوت ہوا تو فلمی اداکار اجمل نے اشفاق احمد سے پوچھا ''بھاجی! ایہہ دسو کہ امانت مر کیوں گیا؟''

اشفاق نے کہا ...... ''اجمل صاحب! آرٹسٹ مرتا نہیں روٹھ جاتا ہے۔ معاشرہ آرٹسٹ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی ضدیں بھی پوری کرتا ہے لیکن معاشرے کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے ''مجھے ایک کوزہ لے دو۔ بکی مٹی کا کوزہ'' اور معاشرہ فوراً اسے کوزہ فراہم کر دیتا ہے۔ پھر آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے ''مجھے ایک ہاتھی لے دو'' اور معاشرہ فوراً اپنی تمام جمع پونجی جمع کر کے اسے ایک ہاتھی لے دیتا ہے۔ آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے ''اس ہاتھی کو اس کوزے میں ڈال دو''۔ اس وقت معاشرہ مجبور ہو جاتا ہے اور آرٹسٹ روٹھ جاتا ہے اور منتا نہیں اور چلا جاتا ہے''۔

اشفاق سے تو معاشرے نے ٹوٹ کر پیار کیا۔ وہ کہتا تو اس سے عشق کرنے والے لوگ ہاتھی کو کوزے میں ڈالنے کی بھی کوئی صورت نکال لیتے لیکن وہ تو کچھ بولا ہی نہیں۔ کوئی ضد ہی نہیں کی۔ بلاوجہ روٹھ گیا اور پھر اسیلہ چھوڑ کر اتنی دور چلا گیا کہ اسے آواز بھی نہیں دے سکتے۔

مجھے لاہور والوں کا پتہ نہیں کہ اشفاق سے خالی شہر انہیں کیسا لگ رہا ہے اور وہ کس حال میں ہیں لیکن ایک عجیب سا احساس میرے دل پر انگارے کی طرح دھرا ہے کہ میں کل رات بھی سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنا بستر جھاڑ کر اور اپنا تکیہ سیدھا کر کے آرام سے سو گیا تھا اور شاید آج رات بھی ایسا ہی ہو۔

اشفاق بھی کیا سوچتا ہوگا؟

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد، بابے اور ابن انشاء

افتخار مجاز

(باتوں باتوں میں)

اشفاق احمد "بابوں" کی محبت میں ایسے گرفتار تھے کہ جا بجا ان کے تذکرے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے۔ اشفاق احمد خود راوی ہیں کہ ابن انشاء سے ان کی گہری دوستی تھی مگر کہیں اختلاف رائے تھا تو وہ "بابوں" کے حوالے سے۔ اشفاق صاحب کہتے تھے کہ ابن انشاء کو میری "بابوں" سے محبت نہ صرف گوارہ نہ تھی بلکہ وہ ان کے حوالے سے میری گفتگو اور عقیدت پر باقاعدہ نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ بس یہ سب ایویں ای ہے ڈرامہ اور ڈرامہ بازی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اشفاق احمد نے بتایا کہ ایک روز وہ اپنے "بابا جی" کے ہمراہ کسی کی عیادت کو گئے۔ سفر رکشہ کا تھا جونہی رکشہ منزل مقصود پر رکا "بابا جی" تیزی سے اتر کر آگے کی طرف چل دیے جب کہ میں رکشے ڈرائیور کو کرایہ دینے کے لئے رک گیا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد جونہی میں "بابا جی" کے پاس پہنچا انہوں نے پوچھا "کتنا کرایہ ادا کیا ہے؟" میں نے بتایا: "حضور! میں نے رکشہ والے کو پانچ روپے کا نوٹ دیا تھا اس نے خود ہی چار روپے کاٹ کر ایک روپیہ مجھے واپس کر دیا یعنی میں نے اسے چار روپے کرایہ ادا کیا ہے"۔

اشفاق احمد کہتے ہیں بابا جی نے میرا جواب سن کر تبسم فرمایا اور بولے "تمہیں چاہیے تھا کہ یہ روپیہ بھی رکشہ والے کو ہی دے دیتے"۔ اس پر میں نے استفہامیہ انداز میں دیکھتے ہوئے ابھی لب بھی نہیں کھولے تھے کہ بابا جی نے مجھے شافی جواب دے دیا: "تم نے کون سا پلے سے دینا تھا، دیئے میں سے ہی دینا تھا ناں"۔

میں کبھی کبھار اشفاق احمد صاحب کی طرف جایا کرتا تھا۔ ایک روز متذکرہ بالا واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے: "جب میں نے یہ واقعہ ابن انشاء کو سنایا تو انہوں نے ناک بھوں

چڑھاتے ہوئے باباجی کے فقرے ''دیئے میں سے ہی دینا تھا ناں''۔ پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے باقاعدہ اس کا تمسخر اڑایا اور کہا: ''بھلا یہ کیا بات ہوئی'' بہرطور بات آئی گئی ہوگئی' تاہم جب اس کے کچھ عرصہ بعد ابن انشاء کراچی منتقل ہوگئے تو مجھے بھی چند روز کے لئے کسی کام سے کراچی جانا پڑا۔ اس دوران ایک روز جب میں ابن انشاء کے دفتر میں بیٹھا ان سے گپ شپ کررہا تھا تو ایک برقعہ پوش خاتون دفتر میں داخل ہوئی اور انشاء سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا' چنانچہ میں خود ہی اٹھ کر ذرا فاصلے پر بچھے ہوئے صوفے پر جا بیٹھا' تاہم میری نظریں اور توجہ انہیں کی طرف رہیں۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ مذکورہ خاتون نے ایک لفافہ انشاء کی طرف بڑھایا۔ انشاء نے لفافہ کھول کر پڑھنا شروع کیا اور پھر پڑھنے کے بعد اپنی میز کا دراز کھولا' اس میں سے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکال کر خاتون کی طرف بڑھا دیئے۔ خاتون نے پیسے تھامے اور شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگئی' تاہم اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ نہ تو خاتون نے اپنی زبان سے کچھ ادا کیا اور نہ ہی انشاء جی نے کوئی سوال و جواب کئے۔ اشفاق احمد نے بتایا کہ مجھے اس خاموش ڈرامے پر بڑا تعجب ہوا۔ چنانچہ خاتون مذکورہ کے رخصت ہوتے ہی اس نے کچھ کہنے کی بجائے دراز کھولا اور وہی لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے لفافہ کھول کر آنکھوں پر عینک فٹ کی اور پرچہ پڑھنا شروع کیا' لکھا تھا:

''محترم انشاء جی! السلام علیکم' میں آپ کے کالموں کی مستقل قاری ہوں۔ آپ کے کالم پڑھنے سے آپ کی شخصیت کا جو خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے وہ ایک ہمدرد' مخلص اور دردِ دل رکھنے والی شخصیت کا ہے۔ میں ایک سکول ٹیچر ہوں' جب کہ میرے والد بزرگوار مستقل بیمار اور بے روزگار ہیں' ہم کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں جس کا کرایہ 50 روپے ماہوار ہے مگر ہم گزشتہ چند ماہ سے یہ کرایہ ادا نہیں کرسکے۔ اب مالک مکان کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے' چنانچہ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر کل تک سارا کرایہ ادا نہ کیا تو وہ گھر کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دے گا اور ہمیں گھر سے بے دخل کردے گا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اگر ہمارے ساتھ یہ سانحہ ہوگیا تو ہم کہاں جائیں گے؟ براہ کرم مجھے تین سو روپے بطور قرض حسنہ دے دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ انشاء اللہ

آئندہ ماہ سے 25 روپے ماہوار کے طور پر آپ کے قرض کی ادائیگی شروع کردوں گی۔ براہ کرم مجھ سے میرا دیگر اتہ پتہ نہ پوچھیے گا' میں حلفاً یقین دلاتی ہوں کہ میں اپنے وعدے کی تکمیل کروں گی''۔

اشفاق احمد کہتے ہیں میں نے خط پڑھ کر واپس انشاء کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''بھئی یہ کیا ڈرامہ ہے' تم خاتون کو جانتے تک نہیں مگر اس نے تم سے 300 روپے مانگے' تم نے اسے 500 سو روپے دے دیئے' عجب سخاوت ہے؟''

اشفاق احمد کہتے ہیں' انشاء نے میرا سوال تحمل سے سنا اور پھر صرف اتنا کہا ''میں نے کون سے پلے سے دیئے ہیں' دیئے ہوئے میں سے ہی دیئے ہیں ناں''۔ اشفاق صاحب نے بتایا کہ میرے ''بابوں'' کی مخالفت کرنے والا انشاء خود مجھے اس وقت ایک بابا لگا!

روزنامہ ''خبریں'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

سب سے بڑا داستان گو چلا گیا!

سرفراز سید

(راوی نامہ)

اشفاق احمد بھی چلے گئے۔ وہ تو اسی روز چلے گئے تھے جب تقریباً چار ماہ قبل ان کا ایک مقامی ہسپتال میں پتے کا آپریشن ہوا تھا اور ہم کچھ لوگ روزنامہ خبریں کی طرف سے ان کے لئے گلدستہ لے کر گئے تھے۔ اس روز میں نے ان کے چہرے پر عجیب سے سائے لہراتے دیکھے تھے۔ میں خوفزدہ ہو کر ڈاکٹر کے پاس گیا اور پوچھا کہ اشفاق صاحب کے چہرے کی رنگت عجیب سی لگتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ ہمارا کام آخری حد تک کوشش کرنا ہے..... !! ڈاکٹر خاموش ہو گیا اور میرا خوف بڑھ گیا۔ چند روز پہلے میں نے حسب معمول ان کے گھر پر فون کیا۔ بانو آپا بہت پریشان تھیں صرف اتنا کہا کہ دعا کریں..... !

تقریباً 25 برس پہلے کی بات ہے۔ لاہور آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں اشفاق احمد سے آمنا سامنا ہوا۔ میں نے کہا کہ جناب میں آپ کا بہت پرانا مداح ہوں مگر ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا جو بہر حال آج ہو گئی ہے۔ وہ بہت حیران ہوئے کہنے لگے کہ یار تم پہلے شخص ہو جس نے اس قسم کی بات کی ہے۔ کیا مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں یہ بات نہیں بلکہ بالکل دوسری بات ہے۔۔ وہ یہ کہ میں نے طالب علمی کے زمانہ میں آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک محبت سو افسانے'' پڑھا۔ اتنے خوبصورت افسانے کہ طویل عرصہ گزر جانے کے بعد ان کی بہت سی سطریں بہت سے جملے یاد ہیں۔ خاص طور پر اس ہندو لڑکی کا یہ جملہ جو پاکستان کی فوج کے ایک کپتان کو کہتی ہے کہ ''تمہارے پاکستان جانے کے بعد میں نے شاعری شروع کی اس وقت ہندوستان کی بہت معروف شاعرہ ہوں۔ بے شمار غیر ملکی زبانوں میں میری شاعری کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ بہت سے ایوارڈز اور اعزازت ملے مگر یہ کہ میں چھوٹی بحر کا ایک شعر کہنا چاہتی ہوں جو ابھی تک نہیں کہہ پائی۔!!'' یہ اور اس طرح کی بہت سی اور باتیں ہیں۔

پھر...... ''پھر؟'' اشفاق احمد نے مجھ سے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ مجھ پر ان افسانوں کو پڑھ کر افسانہ نگار کی شخصیت کا ایک خوبصورت سحر سا چھا گیا۔ اتنے خوبصورت افسانے' اتنی خوبصورت زبان' اتنے اثر انگیز مکالمے لکھنے والے کی شخصیت بھی اتنی ہی سحر انگیز ہونی چاہئے۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ سے ملاقات ہوئی اور آپ کی شخصیت اتنی بھرپور اور خوبصورت نہ ہوئی تو آپ کے بارے میں میرا تاثر بہت مجروح ہو جائے گا۔

اشفاق احمد میری بات سن کر پریشان سے ہو گئے' کہنے لگے کہ بھائی تم نے مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ میری شخصیت تمہاری توقع پر پوری نہ اتری تو یہ تو خود میرے لئے مسئلہ بن جائے گا۔ اچھا چلیں' آپ کے پاس سواری نہیں ہے میں آپ کو آپ کے دفتر میں چھوڑ دیتا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور مشرق اخبار کے دفتر کے سامنے اتار دیا۔ میں گاڑی سے باہر نکلا تو کہنے لگے کہ ''سرفراز! مجھے یہ ضرور بتاؤ کہ میرے بارے میں تمہارا تاثر برقرار ہے یا نہیں؟'' میں نے کہا کہ' جناب پہلے سے زیادہ اچھا ہو گیا ہے!'' اس پر انہوں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور چلے گئے۔

میں تو خیر افسانے کا ایک قاری ہوں۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کے بارے میں عصر حاضر کے برصغیر پاک و ہند کے معروف افسانہ نگار انتظار حسین کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 1947ء کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک اہم کھیپ سامنے آئی' اس میں چند نام نمایاں تھے جن میں اے حمید' اشفاق احمد شامل تھے۔ میں بھی افسانہ لکھ رہا تھا مگر اشفاق احمد سب سے زیادہ ذہین افسانہ نگار تھے اور ان کے بہت آگے بڑھنے کے امکانات نظر آتے تھے۔ ان کی افسانہ نگاری کا دور بہت مختصر تھا مگر اس عرصہ میں انہوں نے بعض بہت خوبصورت افسانے لکھے۔ ان میں ''گڈریا'' افسانہ تو کلاسیکی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ وہ حیثیت تھی جو کہ افسانہ کی دنیا میں پریم چند کے افسانہ ''کفارہ'' اور غلام عباس کے افسانہ ''آنندی'' کو حاصل تھی۔ یہ اردو زبان کے بہترین افسانے شمار ہوتے ہیں مگر ہوا یہ کہ اشفاق احمد کو میڈیا نے اپنی طرف کھینچ لیا اور ان کی افسانہ نگاری پر ڈرامہ نگاری حاوی ہو گئی۔ اگرچہ انہوں نے اس شعبہ میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا مگر افسانہ

نگاری سے ان کی توجہ ہٹ گئی' جس کے بہت سے امکانات دکھائی دے رہے تھے۔ وہ افسانہ لکھتے رہتے تو بہت بلند مقام حاصل ہو جاتا۔ تاہم اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ اشفاق احمد کسی ایک خانہ میں بند نہیں تھے۔ وہ جس شعبہ میں بھی گئے وہاں بلند نام اور مقام حاصل کیا!

اور جہاں تک ڈرامہ نگاری کی بات ہے تو اشفاق احمد خان مرحوم کے جنازے پر مختلف بڑے اور معروف افسانہ نگاروں مستنصر حسین تارڑ' امجد اسلام امجد اور اصغر ندیم سید نے الگ الگ یکساں انداز میں ایک ہی بات کہی کہ ہم نے تو ڈرامہ نگاری کا فن بھی اشفاق احمد سے سیکھا ہے۔ امجد اسلام امجد نے تو یہاں تک کہا کہ وہ تو ہم سب کے لئے رول ماڈل تھے۔ اسی موقع پر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پنجابی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر شہباز ملک نے کہا کہ اشفاق احمد شعبہ پنجابی کے قیام کے وقت اس کے پہلے استاد تھے۔ وہ پنجابی کے طلباء کو ڈرامہ پڑھاتے تھے' میں بھی ان کے شاگردوں میں شامل تھا۔ اشفاق احمد نے دو سال تک مکمل استاد کی حیثیت سے پڑھایا۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ انہوں نے یونان' اٹلی اور دوسرے مغربی ممالک کی ڈرامہ نگاری کے بارے میں حیرت انگیز معلومات فراہم کیں۔ ان کا طریقہ عجیب تھا کہ چند کرداروں کے نام دے دیتے اور کہتے کہ ان پر ڈرامہ لکھو وہ بے مثال استاد تھے۔

ہر شخص اشفاق احمد کی شخصیت اور فن کے بارے میں مخصوص رائے رکھتا تھا۔ طارق عزیز کا کہنا تھا کہ میں نے تو کمپیئرنگ بھی اشفاق احمد سے سیکھی ہے۔ اعظم خورشید کے لئے یہ بات اعزاز کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس نے اشفاق احمد کی مشہور ٹیلیویژن سیریز ''زاویہ'' کی 100 سے زیادہ اقساط ریکارڈ کی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی مشترکہ کاوش ''داستان گو'' بہت یاد آئی۔ ''داستان گو'' ایک خوبصورت ادبی مجلہ جو بہت جلد آیا' مشہور اور مقبول ہوا اور پھر جلد ہی بند بھی ہو گیا۔ ایک بار اشفاق احمد کہنے لگے کہ بھائی مجھے ریڈیو ٹیلیویژن پر بہت پذیرائی ملی ہے مگر ''داستان گو'' بند ہو جانے کا بہت دکھ رہتا ہے۔ بعض اوقات جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک بار پھر ''داستان گو'' شروع کر دوں۔

وہاں بے شمار لوگ تھے۔ سب کے چہروں پر ایک جیسا کرب تھا۔ احمد فراز اور علی اکبر

عباس اسلام آباد سے آئے تھے۔صوبائی گورنر' ضلعی ناظم' بہت سے افسر' بہت سے ادیب اور شاعر سب خاموش تھے۔اظہر جاوید نے کہا کہ یار ایک دو جملوں میں کیا بیان کروں' ایک پورا عہد ختم ہوگیا ہے! اشفاق احمد' منفرد شخصیت' جس نے اکیلے اپنی جادو بیانی سے اپنی سحر انگیز تحریروں سے' اپنے ڈراموں سے' افسانوں سے' ایک نہیں کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ایک عجیب شخصیت جس کے بارے میں ایک نوعمر طالب علم نے کہا کہ اشفاق احمد کی زبان جادو بولتی ہے۔وہ شخص جو ان پڑھ بابوں کی بہت عزت کرتا تھا ان کے پاس مودب ہوکر بیٹھتا تھا۔ان کی باتیں سنتا تھا' ان سے مکالمہ کرتا تھا اور پھر ان سے حاصل کردہ "سیانف" کو لوگوں میں بانٹتا تھا۔وہ جس نے ایک درس بار بار دیا کہ لوگوں میں خیر بانٹو اور خیر کے سوا کچھ نہ بانٹو!

اشفاق احمد کی شخصیت اور زندگی پر لکھنا آسان بات نہیں۔اس کے لئے بہت سا وقت' بہت سی جگہ چاہیئے ایک مختصر کالم میں اتنی بڑی شخصیت کی ہمہ جہت زندگی کی بے شمار باتوں پر کیا کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ہاں یہ کہ مستنصر تارڑ کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ اشفاق احمد نے ہم سب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ ان کے چلے جانے سے یہ احساس نہیں ہو رہا کہ وہ واقعی چلے گئے ہیں! اس بات کو گلوکار شوکت علی نے بابا بلھے شاہ کی زبان میں یوں کہا کہ اشفاق احمد نہیں گئے گور پیا کوئی ہور!

اور پھر یوں ہوا کہ ماڈل ٹاؤن کے قبرستان کی دہلیزوں پر شام آکر بیٹھ گئی اور بہت سے لوگوں نے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ اشفاق احمد کے جسد خاکی کو اس مقام پر زمین میں اتار دیا جہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر فیض احمد فیض کی آخری آرام گاہ ہے۔بالآخر دونوں دوست ایک دوسرے کے قریب آ گئے!

روزنامہ "خبریں" لاہور

9 ستمبر 2004

اشفاق احمد: داستاں گو داستاں کہتے کہتے سو گیا

حافظ شفیق الرحمن

(آئینہ خانہ)

کل جب میں نے ''داستان سرائے'' کے ''بوڑھے مسافر'' اشفاق احمد کے بارے میں یہ خبر سنی کہ وہ اس سرائے کو چھوڑ کر اجنبی اگلی منزلوں کی جانب روانہ ہو گیا ہے تو یہ خبر سنتے ہی ساحر لدھیانوی کی اس نظم کا ایک مصرعہ جو اس نے آغا شورش کاشمیری کے چھوٹے بھائی یورش کے انتقال پر کہی تھی میرے حافظے میں بار بار تازہ بلکہ تر و تازہ ہوتا رہا:

اک چراغ اور بجھا' اور بڑھی تاریکی

اشفاق احمد زندگی بھر دلوں اور دماغوں کی دھرتی میں چراغ بوتے رہے۔ ان کی ہر تصنیف' ہر ناول' ہر رپورتاژ' ہر فیچر' ہر افسانہ' ہر ریڈیائی نشریہ' ہر ٹی وی ڈرامہ اور ہر مجلسی گفتگو اپنی جگہ روشنی کا ایک چھتنار اور صد رنگ شجر ہے۔ وہ کچھ بھی لکھتے' ان کا ہر جملہ دیپ مالا کی طرح جگمگانے لگتا۔ وہ ان عظیم لکھاریوں میں سے تھے کہ انگشت شہادت اور انگوٹھے کی بالائی پور کی گرفت میں ان کا قلم جب صفحۂ قرطاس پر رواں دواں ہوتا تو سطر سطر فکر و فن کی جنتوں کے زائچے بجنے لگتے۔ وہ بے تکان لکھتے اور بے داغ لکھتے۔ ایسا شفاف لکھتے کہ ان کے قلم کی نوک کا بوسہ لیتے ہی ہر لفظ گلاب بن جاتا۔ وہ بے کار نویسی کے عادی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگارشات کو پڑھتے ہوئے قاری ایک سرشار و سرمست کیفیت میں شرابور ہو جاتا ہے کہ اس کے آگے میر کے محبوب کی نیم باز آنکھوں کی مستی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ اشفاق احمد کی کوئی تحریر قاری کی آنکھ کے سامنے ہو اور اس کی نگاہ' توجہ' دھیان اور خیال بھٹک جائے۔

وہ ان ساحر مکالمہ کاروں میں سے تھے کہ ڈائس پر آتے ہی ہال میں سناٹا چھا جاتا۔ ہر کوئی جگر تھام کر بیٹھ جاتا۔ سامعین ان کی گفتگو اتنی توجہ اور انہماک سے سنتے کہ سانس لینا بھی بھول جاتے۔ وہ بنارس کے شوالے میں رکھی مورتیوں کی طرح مہر بلب دکھائی دیتے۔ ان کی گفتگو کے

دوران اگر ہال میں سوئی گر جاتی تو اس کا چھناکا بھی سامعین کو بم دھماکہ محسوس ہوتا۔ ان کا طرز گفتگو اتنا شگفتہ ہوتا کہ گمان گزرتا کہ چہار سو زعفران کے کھیت مہک اٹھے ہیں۔ بیان کی ایسی ساحری کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے کہ داد دینے والے یوں داد دینے پر مجبور ہو جائیں کہ تو نے اسٹیج پر تھوکا بھی تو پھول ہوا۔ علامہ اقبال نے مرد مومن کی نگاہ کے تصرفات بیان کرتے ہوئے کہا تھا ... نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ... وہ جو اشفاق احمد کی "گفتگو دل" دل کے کانوں سے سنتے" بے ساختہ و برجستہ اقبال کے اس مصرعے میں یہ ترمیم کر دیتے ... کلام مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ... میں نے بڑے بڑے جادو نگار شاعروں اور ادیبوں کو گفتگو کرتے سنا ہے خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک مدت کی گفتگو کے دوران فیض احمد فیض ایسے بڑے شاعر اور ادیب کی زبان بھی بیسیوں بار لڑکھڑاتی اور بیان ڈگمگاتا۔ گفتگو کے دوران ان کے الفاظ کی سانس پھول جاتی اور معنی کے پنڈلیاں کانپنے اور تھرتھرانے لگتیں۔ سٹیج پر ڈائس کے سامنے کھڑے وہ یوں گھبرائے ہوتے جیسے جرم بیگناہی میں دار پر چڑھ جانے والا ملزم ہیبت زدہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد اس تاریک بستی اور ظلمت گزیدہ دھرتی میں ایک ایسے کاشتکار کی مانند تھے جو قلم سے ہل کا کام لے کر سحر خیز اور فجر ریز افکار و نظریات کے نورانی بیج بوتے رہے۔ مولانا ظفر علی خان نے قلم سے تیغ کا کام لیا اور اس میں بے مثال بنے۔ اشفاق احمد نے اپنے قلم کو ہل بنا کر اس کی تیز دھار روشن نوک سے خیالوں کی دھرتی کا سینہ چیرا اور اسے رشک آفتاب بنا دیا۔ مولانا اس ہنر میں بے مثال تھے تو اشفاق احمد اس فن میں لاجواب۔ جب جب ان کا قلم صفحہ قرطاس پر رواں ہوتا ... جب جب ان کے ہونٹ گفتگو کے لئے وا ہوتے ... قارئین' ناظرین اور سامعین کو اپنے گرد و پیش' آس پاس' جہاں تہاں اور یہاں وہاں اجالوں کی فصل لہلہاتی اور جگمگاتی محسوس ہوتی سچ تو یہ ہے کہ وہ روشنی کا سانس لیتا مینار اور نور کا چلتا پھرتا گرڈ اسٹیشن تھے۔ سیاہ سمندر میں ان کا وجود نور کا جزیرہ تھا۔ وہ شخصیت کا ہے کو تھے روشنی کی ایک لاٹ تھے۔

ان کے ابتدائی افسانے میں اس دور کے معروف ادبی جریدے "ادبی دنیا" میں شائع ہوتے رہے۔ ادبی دنیا کے مدیر مولانا صلاح الدین تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ

اپنے جریدے میں شائع ہونے والی ہر تحریر کی اس طرح جانچ پرکھ کرتے جس طرح ایک پارکھ جوہری ایک نگینے کو شوکیس میں سجانے سے قبل ہر زاویہ اور ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیتا ہے۔ جناب اشفاق احمد کی تحریروں کا اوائل شباب ہی میں ''ادبی دنیا'' میں شائع ہو کر ارباب نقد و نظر سے تحسین کا خراج وصول کرنا اس امر پر دال ہے کہ صغر سنی ہی میں ان کے جوان کاندھوں پر ایک بوڑھا سر تھا۔ یہ عجب تضاد ہے کہ وہ جوان تھے تو کاندھوں پر بوڑھا سر تھا اور بوڑھے ہوئے تو سینے کے اکھاڑے میں جوان دل ڈنٹر پیلنے لگا۔

ادب اور آرٹ کی دنیا میں پرفیکشن کی تلاش ایک جانکاہ مرحلہ ہوتا ہے۔ بہترین سے بہترین ادب پارہ اور شعر تخلیق کرنے کے باوجود فنکار میں ایک ادھورے پن کا احساس رہتا ہے۔ یہ ادھورے پن کا احساس ہی اس کے کہنہ مشق تخلیق کار ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ اشفاق احمد نے زندگی بھر کبھی اپنے عالم' عامل' کامل ادیب' دانشور اور صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ خوشبو کو اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لئے ڈھول پیٹنے' نقارہ بجانے اور منادی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اشفاق احمد کی نگارشات کا سحر و کمال یہ ہے کہ انہیں پڑھتے ہوئے قاری کو کہیں کوئی خلا' روزن' درز' خام کاری' ناپختگی اور ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسی تخلیقات جن کو پڑھنے کے بعد قاری یہ محسوس کرے کہ وہ ایک ہموار' بے خم اور عریض و کشادہ شاہراہ پر سفر کر کے لوٹا ہے' بلا مبالغہ وہ مکمل ہی نہیں اکمل ہوا کرتی ہیں۔ ان اکمل تخلیقی فن پاروں کے مطالعہ کے دوران قاری کی ذہنی تشنگی دور اور فکری تکان کافور ہو جاتی' نیز یہ کہ وہ باطنی اور داخلی سطح پر سیرابی اور بحالی کے احساس سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ تحریریں اندر کے انسان کی اور ہالنگ کر دیتی ہیں۔ اشفاق احمد نے کئی ایسے فن پارے تخلیق کئے جو ادبیات عالیہ کی مانگ میں افشاں کی طرح تادیر دمکتے رہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک پیدائشی تخلیق کار تھے۔ بحیثیت افسانہ نگار ان کی شہرت اوائل شباب ہی میں برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ وہ بنیادی طور پر زبردست تخلیقی صلاحیتوں کی حامل ایک شخصیت تھے۔ وہ جس بھی میدان میں داخل ہوئے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی وہاں ان کی عظمت کے پھریرے لہراتے نظر آئے۔

وہ ایک ہمہ جہات اور جامع الصفات شخصیت تھے۔ جب ان کی حیات مستعار نے کہولت کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کا زاویہ نظر صوفیانہ ہو چکا تھا۔ ایک صوفی دانشور کی حیثیت سے انہوں نے معاشرے اور مملکت میں بڑا نام کمایا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ارض پاک میں وہ ملک

واصف علی واصف' قدرت اللہ شہاب' ممتاز مفتی اور پروفیسر رفیق جوگی کی طرح صوفیانہ اقدار' روایات اور درویشانہ افکار و تصورات کے امین تھے۔ وہ میرے استاد محترم حضور ملک واصف علی واصف کے مریدان خاص میں سے تھے۔ وہ ان کے درس تصوف میں باقاعدہ شرکت کرتے رہے۔ وہ ان کے کمرے میں جوتیاں باہر اتار کر داخل ہوتے۔ وہ حفظ مراتب کے قائل ہی نہیں معترف بھی تھے۔

انہوں نے سادہ زندگی بسر کی۔ آسودگی' مناصب اور عہدے انہیں اعصابی لحاظ سے کبھی تسخیر نہ کر سکے۔ وہ زندگی' محبت اور خوش خلقی سے معمور اور بھرپور ایک توانا' وجیع' بجیل اور تنومند شخصیت تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نگاہیں سمندر کے تیسرے کنارے' صحرا کی پانچویں کھونٹ اور دنیا کے آٹھویں براعظم پر بھی مرکوز و مرتکز رہیں۔ زندگی کی روحانی جہت کو وہ نمایاں ترجیح دیتے تھے۔ اس باکرامت شخصیت نے عزلت گزینی' بیاباں نوردی اور دلق پوشی کے بغیر ہی بہت سے روحانی منازل طے کیں۔ وہ صوفی دانشوروں کی سلک مروارید کا ایک بیش بہا اور دریک دانہ تھے۔ دستار و جبہ' عمامہ و قبا' تسبیح و عصا اور زاویہ و حجرہ تو خرقہ سالوس میں لپٹے برہمنوں کا محض ایک ''گیٹ اپ''' ''غازہ'' اور ''بہروپ'' ہے۔ اشفاق احمد عمل و کردار کی دنیا میں روایتی درویشوں اور صوفیوں کی طرح زاویہ نشینی' تسبیح خوانی اور سجادہ گیری کو تو اپنا شعار نہ بنا سکے لیکن زندگی کے آخری دو عشروں میں ان کی زبان اور قلم سے ادا ہونے والا ہر لفظ روحانی رنگ' صوفیانہ سرمستی اور وجدانی کیفیات' محسوسات کا آئینہ دار تھا۔ وہ بظاہر خوش پوش تھے لیکن بباطن گدڑی پوش۔ گذشتہ روز ''داستان سرائے'' کے اس خوش پوش درویش نے داستان سناتے سناتے یکدم رخت سفر باندھا اور ''پس داستان'' حقائق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اس کے جاتے ہی ''داستان سرائے'' یار لوگوں کے نزدیک ''ویران سرائے'' بن چکی ہے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کی رحلت

(اداریہ)

ممتاز ڈرامہ نگار افسانہ نویس صداکار اور دانشور اشفاق احمد منگل کے روز طویل علالت کے بعد لاہور میں انتقال کر گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) وہ پتے کے کینسر میں مبتلا تھے۔ انہوں نے پسماندگان میں بیوہ قدسیہ بانو اور تین بیٹے چھوڑے ہیں۔ اشفاق احمد 22 اگست 1925ء کو مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں سے ہی حاصل کی۔ تقسیم سے تھوڑا عرصہ پہلے ہی وہ تعلیم کے سلسلے میں لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج سے ایم اے اردو کیا۔ اس کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ روم چلے گئے جہاں وہ ریڈیو روم سے بطور اردو نیوز کاسٹر وابستہ ہو گئے۔ یہاں انہوں نے اطالوی زبان سیکھی اور یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے۔ وہ فرانسیسی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔ انہوں نے نیویارک سے ریڈیو براڈ کاسٹنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ بیرون ملک سے وطن واپس آ کر انہوں نے لاہور سے اپنے ادبی ماہنامہ "داستان گو" کا اجراء کیا۔ جنرل ایوب خان کے دور حکومت میں پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ (پی پی ایل) کو قومی تحویل میں لیا گیا تو انہیں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی جگہ ہفت روزہ لیل ونہار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ 1967ء میں وہ ڈائریکٹر جنرل مرکزی اردو بورڈ' بعد ازاں جسے اردو سائنس بورڈ کا نام دیا گیا' مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر 25 برس تک فائز رہے۔ 1962ء میں ہی انہوں نے ریڈیو پر تلقین شاہ کے نام سے پروگرام شروع کیا۔ اس پروگرام نے عوام میں زبردست مقبولیت حاصل کی' خصوصاً دیہی طبقے نے اس پروگرام کو بے حد پسند کیا۔ تلقین شاہ نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ تلقین شاہ سننے کے لئے ہوٹلوں اور چائے خانوں میں عوام کا ہجوم رہتا تھا۔ اس پروگرام کے ذریعے اشفاق احمد نے معاشرے کی خامیوں خرابیوں پر بڑے دلچسپ مگر طنزیہ انداز میں تنقید کی۔ یہ پروگرام 42 برس تک ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوتا رہا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1942ء سے ہوتا ہے۔

انہوں نے توبہ کے عنوان سے اپنی زندگی کا پہلا افسانہ لکھا جو "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ انہیں شہرت "گڈریا" نامی افسانے سے ملی' یہ 1953ء میں لکھا گیا' جس نے انہیں ممتاز ادبا کی صف میں شامل کر دیا۔ ان کی دیگر مشہور تصانیف میں ایک محبت سو افسانے' اجلے پھول' سفر مینا اور پھلکاری شامل ہیں۔ مہمان بہار کے نام سے انہوں نے ناول بھی لکھا۔ سفر در سفر ان کا رپورتاژ ہے جب کہ خطائے وطائے ان کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ ٹیلی ویژن کے لئے انہوں نے کئی شاندار ڈرامے تحریر کیے۔ ان میں' ایک محبت سو افسانے' اور ڈرامے توتا کہانی' منچلے کا سودا' اُچے برج لاہور دے' کارواں سرائے' قلعہ کہانی' حیرت کدہ' ناطق بھلے' ننگے پاؤں' شامل ہیں۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے 48 مکمل ڈرامے اور 329 فیچرز اور منی پلے تحریر کئے اور 29 کتابیں لکھیں۔ اشفاق احمد کو جنرل ضیاء الحق کے دور میں وفاقی وزارت تعلیم کا مشیر مقرر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ 1979ء میں انہیں اردو میں حسن کارکردگی پر صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔ انہوں نے چار بار گریجوایٹ ایوارڈ' دو مرتبہ پی ٹی وی ایوارڈ' مجید امجد ایوارڈ اور فروغ ادب کا عالمی ایوارڈ حاصل کیا۔ یوں دیکھا جائے تو اشفاق احمد اردو ادب کے معروف ترین ناموں میں سے ایک ہیں۔ ممتاز مفتی اور محمود نظامی جیسی شخصیات بھی ان کے رفقائے کار میں شامل تھیں۔ ان کے نظریات و خیالات سے اختلاف رکھنے والے بھی موجود ہیں لیکن ان کی ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی رحلت سے یقیناً ادب کی دنیا کا ایک اہم باب بند ہو گیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

روزنامہ "ایکسپریس" لاہور

9 ستمبر 2004ء

لاہور کا آخری داستان گو

عامر ہاشم خاکوانی

(نگار)

یہ غالباً 1995ء کی ایک خشک دوپہر تھی جب میں اپنے دوست شہزاد محسن خان کے ہمراہ اشفاق صاحب سے پہلی بار ملنے گیا۔ مجھے اپنے آبائی شہر احمد پور شرقیہ ضلع بہاولپور سے لاہور آئے ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے میں یہاں پر اردو ڈائجسٹ میں بطور سب ایڈیٹر ملازمت کر رہا تھا۔ ان دنوں میرے اوپر لاہور کی مخصوص شہری زندگی کی چھاپ نہیں پڑی تھی اور میں ابھی تک ڈھیلے والے کرتے اور چمکدار پشاوری چپل ہی پہنا کرتا تھا۔ مجھے لاہور کے علاقوں کا اتنا پتہ بھی نہیں تھا۔ غالباً اسی وجہ سے مجھے یہ علم نہیں ہوا کہ گارڈن ٹاؤن ایکسٹینشن کوئی پوش علاقہ ہے۔ میرے دوست شہزاد نے اشفاق صاحب سے فون پر ٹائم لیا کہ بہاولپور سے دو سٹوڈنٹ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اشفاق صاحب نے 3 بجے آنے کا کہہ دیا اور یوں ہم دونوں علامہ اقبال میڈیکل کالج کے ہاسٹل سے روانہ ہو گئے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی تحریروں کے ہم دونوں ہی زبردست مداح تھے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ان کا ڈرامہ ''من چلے کا سودا'' ختم ہوا تھا اور میں یہ اطلاع ملنے پر کہ یہ ڈرامہ کتابی شکل میں چھپ چکا ہے مال روڈ پر موجود کتابوں کی تمام دکانیں چھان چکا تھا مگر کہیں سے کامیابی نہیں ہوئی۔ جب گارڈن ٹاؤن ایکسٹینشن بلاک میں داخل ہوئے تو سڑک کے دونوں طرف ایستادہ عالی شان کوٹھیاں دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ چونکہ لکھاری ہیں اور ہمارے ہاں رائٹرز کی عمومی معاشی حالت خراب ہوتی ہے۔ آنے سے پہلے ہم سوچ رہے تھے کہ دو تین مرلے کا چھوٹا سا کوارٹر ٹائپ گھر ہوگا اور ممکن ہے جب دستک دینگے تو بانو آپا خود آٹے سے سنے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ دروازہ کھولنے آئینگی۔ ہم نے وہ افتتاحی فقرے بھی سوچ رکھے تھے جو ایسی صورت میں بانو آپا سے بولنے تھے' میرے ایک ہاسٹل فیلو نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ راجہ گدھ کا ذکر فوراً کر دینا' اس سے وہ سمجھیں گی کہ بڑا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ میں نے

اس مشورے کو اس لئے رد کر دیا کہ راجہ گدھ جیسے بڑے ناول پر سرسری گفتگو کرنا ممکن نہیں ہوگی اس پر بعد میں چائے پیتے ہوئے تبصرہ کرنا مناسب رہے گا۔ خیر جب ہم ڈھونڈتے ڈھونڈتے 121 سی ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن پہنچے تو بھونچکا رہ گئے۔ کوئی کنال بھر کی شاندار کوٹھی سامنے کھڑی تھی۔ دیو ہیکل آہنی گیٹ کے ساتھ نمبر پلیٹ پر داستان سرائے لکھا تھا۔ ہم نے گھنٹی بجائی تو ایک چھریرے بدن والا چاق و چوبند باوردی گارڈ نمودار ہوا' اس نے گھور کر ہمیں دیکھا اور پھر کھردرے لہجے مگر شائستہ الفاظ میں پوچھا' آپ لوگوں نے پہلے سے اپائمنٹ لیا ہوا ہے۔ ہمارے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے گیٹ کے ساتھ اندر کی طرف بنے ہوئے کیبن سے انٹر کام پر پوچھا۔ تصدیق ہونے پر اس نے قدرے نرم لہجے میں ہمیں اندر آنے کا کہا۔ دائیں طرف شاندار لان بنا تھا جس کی نرم گھنی گھاس سردیوں کی ہلکی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ہم خوبصورت پتھریلے پورچ کو عبور کر کے سامنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ یہاں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اس گھر کے مکینوں کا مڈل کلاس سے تعلق رہا ہے۔ سادہ سا فرنیچر' سفید رنگ کی دیواریں' سامنے بدھا کی تصویر آویزاں تھی۔ چند لمحوں میں بند گلے کے کرتہ شلوار میں ملبوس اشفاق احمد اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے بڑے مشفقانہ انداز میں ہماری خیریت دریافت کیا اور ہمارے ساتھ ہی بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو چند ہی منٹوں بعد ایک ملازم انواع واقسام کی اشیاء سے لدی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ٹرالی مین بچے کیک' خشک میوہ' پیٹیز' کیک پیس اور پھلوں کی قابیں دیکھ کر ہم دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو دیکھا' ہم نے سوچا کہ شاید جلد ہی کوئی اور خاص مہمان آنے والے ہوں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔۔ یہ سب اہتمام بہاولپور کے ایک قصبے سے آنیوالے دو فرش نشین طالب علموں کے لئے تھا۔ اشفاق احمد ایسا ہی شخص تھا...... لاہور کے ایک پوش علاقے کی شاندار کوٹھی میں مقیم مگر اس گھر کے دروازے اور اس کے مکینوں کے دل ہر خاص و عام پر کسی تخصیص کے بغیر کھلے تھے۔

اشفاق صاحب سے ملاقات تین چار گھنٹے طویل رہی۔ میرا اس ملاقات کے بعد یہ تاثر بنا کہ وہ ایک مثالی داستان گو ہیں' بڑی بڑی کہانیاں چھوٹے چھوٹے فقروں میں بیان کرنا' روزمرہ

زندگی سے اخذ کی ہوئی دلچسپ مثالیں اور پھر اوپر سے اشفاق صاحب کا انداز بیان'...... وہ اصلاً ریڈیو کے آدمی تھے' خوبصورت آواز' مناسب اتار چڑھاؤ' لفظوں میں وقفہ اور پھر مناسب ترین جگہ پر زور دے کر بولنا۔ اشفاق احمد جیسے انسان کے ساتھ چند گھنٹے بھی کم لگتے ہیں۔ ہم ذہن میں بہت سارے سوالات لے کر گئے تھے اور ہم نے خاصے سوال پوچھے بھی' مگر اشفاق احمد اپنے جوابات کے بہاؤ میں ہم لوگوں کو بھی بہا کر لے جاتے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں دو نکات پر بہت زور دیا' ایک یہ کہ ہم آزاد پیدا ہوتے ہیں' مگر اپنے گرد خود ساختہ تختے (بقول اشفاق صاحب پھٹے) لگا لیتے ہیں...... یہ پھٹے کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً میں ایم اے ہوں' میں پیدائشی شاعر ہوں' انجینئر ہوں' وغیرہ وغیرہ۔ اشفاق صاحب کا کہنا تھا کہ ہمیں کوشش کر کے ان پھٹوں کو الگ کرنا چاہئے اور اس کے لئے اپنی اصلی ذات کو کھوجنا چاہئے۔ دوسری نصیحت انہوں نے مجھے بطور خاص کی کہ ''ماننا'' سیکھو۔ انہوں نے آٹو گراف بک پر بھی یہ فقرہ لکھا ''مان جانا چاہئے کہ ماننے میں عظمت ہے''۔ میں ان دنوں تشکیک کے عمل سے گزر رہا تھا' میں نے ان سے خاصی بحث کی کہ بندہ ایسے خوانخواہ کیوں مان جائے' اس پر انہوں نے بڑی رسانیت سے سمجھایا کہ بھائی کسی کو کچھ ماننا آسان نہیں' اس کے لئے آپ کو پہلے اپنی انا ختم کرنی پڑتی ہے اور صوفی لوگ اسی انا کو مارنے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔

اشفاق صاحب سے دوسری تفصیلی ملاقات چند برس بعد ہوئی' اس بار بھی میرا دوست شہزاد محرک بنا ہم ان کے گھر پہنچے تو اشفاق صاحب نے پہلے کی طرح تواضع کی۔ یہ ملاقات بھی تین چار گھنٹے رہی۔ ان دنوں ان کا پروگرام زاویہ چل رہا تھا اور دوران گفتگو کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی آتے رہے۔ اس ملاقات میں اشفاق صاحب نے ایک بڑے اہم نکتہ پر روشنی ڈالی۔ میں نے کلچر کے بارے میں پوچھا کہ ہم کس کلچر کو اپنا سمجھیں' اس زمین کے قدیم کلچر کو یا وہ جس پر اسلامی ثقافت کا غلبہ ہے؟ اشفاق احمد اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے: ''دیکھو کلچر کی کوئی ساٹھ کے قریب تعریفیں کی گئی ہیں' ایک میری بھی ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جس گروہ انسانی کی پیدائش' شادی اور وفات کی رسومات اور طریقے ایک ہیں' ان کا کلچر بھی ایک ہے۔ یہ جو لوگ زبان اور

موسیقی کی بنیاد پر ایک کلچر ہونے کے دعویدار ہیں دراصل یہ کلچر نہیں فنون لطیفہ مشترک ہونے کی علامت ہے''۔

اشفاق احمد کی زندگی سے بابوں کو حذف نہیں کیا جا سکتا' وہ ملاقاتوں میں گھنٹوں مختلف بابوں کی لوک دانش پر مبنی باتیں سناتے رہتے' ایسی باتیں جو بالکل آسان اور سیدھی سادی ہونے کے باوجود پر مغز ہوتیں۔ میں نے ممتاز مفتی کی کتابیں اور ان کے خاکے پڑھتے ہوئے تھے' بانو قدسیہ کی مردابریشم بھی نظر سے گزری تھی' اس لئے میرا تاثر یہ تھا کہ وہ قدرت اللہ شہاب سے متاثر ہیں لیکن اشفاق صاحب نے انہیں صرف اپنا قابل احترام دوست قرار دیا' متاثر صرف وہ نور والے ڈیرے کے بابا جی سے تھے۔ واصف علی واصف کے بارے میں سوال پر انہوں نے صرف یہ کہا کہ وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے انشاپرداز تھے۔ ان سے جب بھی کوئی کسی بابے کا پتہ مانگتے تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ آپ نے گریجوایشن کرنے کے لئے چودہ سال لگائے ہیں' کسی بابے کو ڈھونڈنے کے لئے ایک مہینہ تو لگاؤ' ویسے ان کے خیال میں بابے منتہائے مقصود نہیں ہونے چاہیں اصل مقصد تو حقیقت کو پانا ہے۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی مشورہ دیا کہ اگر دن کا کچھ وقت اللہ کے ذکر میں گزارا جائے تو اپنے اندر کا بابا نکل کر باہر آ جائے گا۔

میں نے کالم کا عنوان ''لاہور کا آخری داستان گو'' لکھا ہے' ممکن ہے بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہو مگر حقیقت یہی ہے کہ اشفاق احمد جیسا داستانوں کے ذریعے حکمت اور روشنی کے موتی بکھیرنے والا چلا گیا' اب شاید ان جیسا کوئی اور مدتوں تک نہ آ سکے۔

روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

داستان گو

حسن نثار

(چوراہا)

میں بھی اوروں کی طرح اس بری خبر کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا لیکن پھر بھی یہ خبر کسی زہر بجھے تیز دھار خنجر کی طرح میری روح میں پیوست ہوگئی۔

بد دماغ' بے دماغ افسروں' قبضہ گروپوں کے سرغنوں' خوشامد میں لتھڑے ہوئے سیاستدانوں' انواع واقسام کے موقع پرستوں' مرغ بادنما دانشوروں' غلام گردشوں میں قالینوں کی مانند بچھے قلمکاروں' ناجائز منافع خوروں اپنی حدود سے تجاوز کرنے والے منہ زور سرکشوں' مختلف اور من گھڑت نظریات کے ہول سیلروں اور پرچون فروشوں' بہت زیادہ بے عزتی کے عوض ''تھوڑی سی عزت'' چاہنے والوں اور ایسے ہی دیگر ''معززین'' کے علاوہ اس معصوم' محکوم اور مظلوم ترین معاشرے کی جھول میں اور تھا ہی کیا کہ اشفاق صاحب بھی چل بسے۔

''داستان سرائے'' ماڈل ٹاؤن مین واقعہ اشفاق صاحب کے گھر کا نام ہے۔ داستان گو رخصت ہوا اور اب صرف ایک سرائے باقی ہے جہاں بانو قدسیہ ہوں گی اور داستانیں۔ کہنے کو زندگی کا سفر 79 سالوں پر محیط تھا لیکن دراصل یہ سفر ماڈل ٹاؤن کے ایک گھر سے ماڈل ٹاؤن کے قبرستان تک کا مختصر سا سفر تھا۔ اشفاق صاحب کی خواہش تھی کہ ان کی قبر اچھی مگر کچی ہو جس پر ہینڈ پمپ ضرور ہو اور اس کے ساتھ ہر وقت ایک ڈھولکی والا قوالی کے انداز میں کچھ پڑھتا رہے۔ حیرت ہے کہ اشفاق صاحب کو اس بات کی خبر نہ تھی کہ ان کی کوئی ایک قبر نہ ہوگی بلکہ وہ اپنے لاتعداد چاہنے والوں کے دلوں میں آسودہ ہوں گے اور ایک ہینڈ پمپ نہیں لاکھوں آنکھیں ان سے جدائی پر مدتوں بھیگی رہیں گی۔

اشفاق صاحب کیا تھے؟

اشفاق صاحب کیا کچھ نہ تھے؟

صوفی تھے' افسانہ نگار تھے' ڈرامہ نگار تھے' صداکار تھے' عالم تھے' فاضل تھے' فن گفتگو

کے امام تھے...... اصل بات یہ ہے کہ بغیر کسی عہدے' دبدبے اور ڈنڈے کے عوام ان کا احترام کرتے تھے' ان سے محبت کرتے تھے' انہیں اپنا سمجھتے تھے اور جس انسان کو خلق خدا کی غیر مشروط محبت ملے وہ ولی ہوتا ہے' انسانوں کا دوست' اللہ کا دوست ہوتا ہے اور یہی وہ سادہ سی بات ہے جو پھنے خان عوام دشمنوں کو سمجھ نہیں آتی۔

مجھے شخصیت پرستی سے نفرت ہے۔ میں اسے شرک سمجھتا ہوں لیکن محبت اور عقیدت اپنی جگہ' عزت و احترام کا اپنا مقام' اشفاق صاحب کے ساتھ میرا یہی رشتہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے لے کر اشفاق صاحب تک میں بیعت تو کبھی نہیں ہوا نہ ہی آستانوں پر حاضری میری افتادِ طبع کا حصہ ہے لیکن احمد ندیم قاسمی ہوں یا اشفاق صاحب...... گردن احتراماً جھک جاتی۔ اشفاق صاحب کے ساتھ ماڈل ٹاؤن کے نواز شریف پارک سے لے کر ایک مقامی بنک میٹرز کے دفتر تک میری مسلسل ملاقاتوں کے دوران میں نے اشفاق صاحب پر تنقید کے سوا کبھی کچھ نہیں کیا۔ مجھے اشفاق صاحب کے ''بابوں'' اور ''بابا کلچر'' سے سخت نفرت تھی۔ میں انہیں ہمیشہ کہتا کہ ''مسلمانوں کی تباہی میں مختلف قسم کے ''بابوں'' کا کردار بہت خوفناک ہے' ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم بابوں سے دور اور سائنس ٹیکنالوجی سے نزدیک تر ہوتے جائیں لیکن آپ بڑے خلوص سے یہ زہر عام کر رہے ہیں''۔ اشفاق صاحب اپنے مخصوص مسحور کن انداز میں مسکراتے اور ہاتھ ہلا ہلا کر اپنا فلسفہ بتاتے جو مجھے ہمیشہ اچھا تو بہت لگتا لیکن میں کبھی ان کی اس مافوق الفطرت دنیا کا باسی نہ بن سکا۔ میرے نزدیک سائنسدان سے بڑا ''بابا'' اور ''صوفی'' کوئی نہیں ہوتا جو بنی نوع انسان کی غیر متنازع فلاح و بہبود کے لئے زندگی وقف کر دیتا ہے لیکن داستان گو بابا اشفاق احمد کے رخصت ہونے پر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے صرف ''داستان سرائے'' ہی نہیں' میرا دل بھی سونا سونا سا ہو گیا' پورا شہر سائیں سائیں کر رہا ہے' پورے ملک پر سوگ کی چادر تن گئی ہے بلکہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے کروڑوں اردو قارئین بیٹھے بٹھائے اجڑ سے گئے ہیں۔

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد کا انتقال: علم و ادب کیلئے عظیم سانحہ

(شذرہ)

معروف دانشور ادیب اور ڈرامہ نگار اشفاق احمد کچھ عرصہ علیل رہنے کے بعد گزشتہ روز خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی عمر 79 برس تھی اور پچھلے چند ماہ سے پتے کے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ اشفاق احمد کا شمار ان مصنفین ہوتا ہے، جنہوں نے اردو ادب کو نثر نگاری کے نئے ڈھب اور انداز سے روشناس کرایا۔ اشفاق احمد بھارت کے شہر ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں مکتسر میں 22 اگست 1925ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی اور ایم۔ اے اردو گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ انہیں ادبی دنیا میں شہرت اپنے افسانے ''گڈریا'' سے حاصل ہوئی۔ انہوں نے 25 سے زائد کتب لکھیں اور ٹی وی ریڈیو کے لئے بے شمار ڈرامہ سیریز تحریر کیں۔ ان کی کئی کتابیں ''بیسٹ سیلر'' بھی قرار پائیں۔ ''گڈریا' ایک محبت سو افسانے' وداع جنگ' ایک ہی بولی' صبحانے افسانے' توتا کہانی' بند گلی' طلسم ہوش افزاء' اور ڈرامے' ننگے پاؤں' من چلے کا سودا' بابا صاحبا' سفر در سفر' اُچے برج لاہور دے' حسرت تعمیر' جنگ بجنگ' حیرت کدہ' شاہلا کوٹ' کھیل تماشا' گلدان اور زاویہ ایسی تصانیف ہیں جنہیں اگر اردو ادب کا نادر سرمایہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اشفاق احمد پی ٹی وی کے بانی ڈرامہ نگاروں میں سے تھے وہ اپنے ڈراموں میں ماحول کے بجائے کردار پر زیادہ توجہ دیتے تھے' یہی وجہ تھی کہ ان کے تخلیق کردہ کردار طویل گفتگو اور بحثیں کرتے نظر آتے تھے۔ وہ ایک نکتہ رس اور شگفتہ بیان انسان تھے اور بڑی آسانی کے ساتھ مشکل اور اہم مسائل بیان کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے زیادہ تر سماجی اخلاقیات اور مشرقی مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔

اشفاق احمد کا شمار اپنی تخلیقات کی وجہ سے قیام پاکستان کے فوراً بعد شہرت حاصل کرنے والے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ گذشتہ صدی کے چھٹے عشرے میں دنیا کے عظیم ادیبوں میں شمار کئے جانے لگے تھے' تاہم جو شہرت ان کے تخلیق کردہ کردار ''تلقین شاہ' کو ملی ان کے کسی اور ڈرامے کو

نصیب نہیں ہوئی۔ یہ ڈرامہ مسلسل 30 برس تک ریڈیو سے نشر کیا جاتا رہا۔ اشفاق احمد کی وفات سے حقیقتاً علم وادب کے ایک زریں دور کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ علم ادب کی دنیا میں ان کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا ایک عرصہ تک پر نہ ہو سکے گا اردو ادب کے لئے اشفاق احمد کی خدمات تادیر یاد رکھی جائیں گی۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد: وطنِ عزیز ایک بڑی شخصیت سے محروم ہو گیا

(اداریہ)

اردو کے عہد ساز اور عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، گفتگو کار، صدا کار، ادیب اور صوفی دانشور اشفاق احمد طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ لبلبہ کے کینسر میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر 79 برس تھی۔ انہیں گذشتہ روز ماڈل ٹاؤن میں ہزروں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اشفاق احمد 1925ء میں مشرقی پنجاب کے زرخیز اور مردم خیز ضلع فیروز پور میں ایک آسودہ حال پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کرنے کے بعد دیال سنگھ کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ انہوں نے سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے بھی محنت مشقت کی۔ انہوں نے زندگی بھر قلم کی مزدوری کی۔ رزق حلال کمانے کے لئے سخت ترین اور نامساعد ترین حالات میں بھی محنت اور ریاض کرنے سے انہوں نے کبھی جی نہیں چرایا۔ اکتساب علم و ہنر کے لئے انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ داخلہ لیا اور اس باب میں وہ کبھی کسی قسم کے نام نہاد عالمانہ تبحر کا شکار نہ ہوئے۔ انہوں نے روم یونیورسٹی اٹلی میں اردو کے استاد کی حیثیت سے 2 سال تک خدمات انجام دیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں ایک سال کے لئے وہ اعزازی طور پر شعبہ پنجابی میں لیکچرار کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ ماہنامہ ''داستان گو'' اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے ایڈیٹر رہے۔ آر سی ڈی کی جانب سے وہ ریجنل کلچرل انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی انتہائی ذمہ دارانہ اور فعال فرائض ادا کرتے رہے۔ اس حیثیت میں انہوں نے تینوں ممالک کے عوام کو قریب تر لانے کے لئے گراں قدر کوششیں کیں۔ وہ ایرانی، ترک اور پاکستانی ثقافت کی مشترکہ اقدار کے فروغ کے لئے بھی کام کرتے رہے۔ وہ برکلے یونیورسٹی کے برکلے اردو پروگرام سے بھی منسلک رہے۔ وہ پاک ایڈوائزری کمیٹی، نیشنل کونسل آف آرٹس، انجمن ترقی اردو بورڈ کراچی کے مختلف ادوار میں رکن رہے۔ انہوں نے اپنے ورثہ میں افسانے، رپورتاژ، ناول، شاعری، ٹیلی ویژن ڈرامے، ریڈیو پروگرام اور تراجم چھوڑے۔ ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والا ان کا پروگرام ''تلقین شاہ'' 60ء کی دہائی میں برصغیر کے طول و عرض میں انتہائی دلچسپی سے سنا جاتا تھا۔ یہ ایک ہفتہ وار ریڈیائی پروگرام تھا۔ اس پروگرام کے ذریعے انہوں نے ان گنت معاشرتی خرابیوں،

برائیوں' خامیوں اور بدنمائیوں کی اصلاح کی جانب عوامی توجہ مبذول کروائی۔ ان کے اس پروگرام کو ایشیا کا نمبر 1 اور دنیا کا دوسرے نمبر پر آنے والا سب سے طویل ریڈیائی فیچر تسلیم کیا گیا۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے 48 مکمل ریڈیو ڈرامے اور 329 فیچرز اور منی پلے لکھے۔ ٹیلی ویژن پر ان کے بہت سے ڈراموں نے زبردست شہرت حاصل کی۔ ان میں ''ایک محبت سو افسانے''، ''طوطا کہانی''، ''منچلے کا سودا''، ''اچے برج لاہور دے''، ''کارواں سرائے'' اور ''ننگے پاؤں'' نے ناظرین کے حلقوں میں لاثانی مقبولیت اور محبوبیت حاصل کی۔ انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کا بھی دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران انہوں نے ایک پاکستانی ادیب' دانشور اور تخلیق فنکار کی حیثیت سے پاکستان کے حوالے سے امریکا' برطانیہ' فرانس' اسپین' اٹلی' جرمنی' آسٹریا' بلجیم' ہالینڈ' کینیڈا' ناروے' ڈنمارک کے علاوہ بہت سے اسلامی ممالک کے شہریوں کے سامنے پاکستانیت کا تہہ منظر' پس منظر اور پیش منظر رکھا۔ وہ یہ کام پاکستانیت کے جذبے سے سرشار ہو کر رضاکارانہ کرتے رہے۔ انہیں ان کی عظیم خدمات کے صلے میں 1979ء میں حسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ ملا۔ مزید براں انہوں نے 4 مرتبہ گریجوایٹ ایوارڈ اور دو مرتبہ پی ٹی وی ایوارڈ حاصل کیا۔ 1997ء میں قطر میں عالمی ادبی تنظیم مجلس فروغ اردو ادب کی جانب سے انہیں فروغ ادب کا عالمی ایوارڈ دیا گیا۔ اشفاق احمد نے 79 برس کی طویل زندگی پائی لیکن ان کی شخصیت کی عظمت' افادہ رسانی اور انسانی خدمت کی لگن کے جنون کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستانی معاشرے اور مملکت کے شہریوں کو ابھی مزید کئی عشروں تک ان کی فکری رہنمائی' نظری سیادت اور شعوری پیشوائی کی ضرورت تھی۔ اشفاق احمد ایسی ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ یقیناً وہ ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے جن کے بارے میں مختار مسعود نے کہا تھا کہ وہ کسی قوم کو انعام کے طور پر عطا کی جاتیں اور سزا کے طور پر چھین لی جاتی ہیں۔ اس تناظر میں ان کی موت یقیناً ایک لمحہ فکریہ بھی ہے۔ یوں تو ہر ادیب' شاعر اور صحافی کے مرنے کے بعد یہ گھسا پٹا جملہ رسماً دہرایا جاتا ہے کہ اس کی موت سے جو خلا پیدا ہوا وہ مدتوں پر نہیں ہوگا لیکن ''ادارہ دن'' بہ صمیم قلب یہ محسوس کرتا ہے کہ جناب اشفاق احمد کی رحلت سے پیدا ہونے والا خلا واقعتاً صدیوں پر نہیں ہوگا۔ سچ تو یہ ہے:

شہر میں اک روشن دماغ تھا' نہ رہا

روزنامہ ''دن'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

تلقین شاہ (اشفاق احمد) اب نہیں ہے

محمد اعجاز خاور

میری عمر کے ادھیڑ عمروں کے لیے تلقین شاہ کا نام کوئی ایسا نامانوس نہیں ہے کہ ہمارے بچپن میں ریڈیائی ڈرامے ہی سب سے بڑی تفریح اور عیاشی تھی۔ تلقین شاہ عصر جدید کا ڈپٹی نذیر احمد تھا جو اپنے ریڈیائی ڈرامے میں ہمارے روزمرہ کے امور کے بارے میں فکری راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتا تھا پھر وقت نے کروٹ لیا ورٹی وی عام ہوگیا۔ محلے میں جب خال خال ٹی وی ہوا کرتے تھے تب ایک محبت سو افسانے 'توتا کہانی' 'من چلے کا سودا' اور پھر 80ء کی دہائی میں محمد نثار حسین نے پی ٹی وی لاہور سے طویل دورانیئے کے ڈرامے شروع کیے تو بھی اشفاق احمد کے ٹیلی پلے ناظرین کی توجہ کا مرکز رہے گو کہ ان کے ٹیلی پلے میں ریڈیائی ڈرامے کی بیانیہ تکنیک کا وصف ہمیشہ حاوی رہا مگر جب کسی نظریئے یا خیال کی تبلیغ مطلوب ہو تو ایسی قباحتوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

اشفاق احمد جن کے گرو مرحوم قدرت اللہ شہاب تھے ان کے فلسفہ تصوف کا انہوں نے عمر بھر پرچار کیا اشفاق احمد اور ممتاز مفتی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ قدرت اللہ شہاب کے ''لوقا اور یوحنا'' تھے۔ اشفاق احمد جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔ اپنی عمر کے آخری دور میں جب خود بھی بابے ہو گئے تھے انہوں نے ٹی وی کے پروگرام بیٹھک اور زاویے میں بابوں کے قصے کہانیاں سنانا شروع کر دیں تھیں جو کہ درحقیقت ان کے فلسفہ تصوف ہی کا ایک روپ اور آہنگ تھا گو کہ میں ذاتی طور پر اسے ''مسلم رامائین'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ ان کے نقطہ نظر سے ایک ہزار ایک اختلاف ہو سکتا ہے مگر وہ زندگی جو ہم اپنے مختلف اعتقادات سمیت عملاً جی رہے ہیں اس کا یہ تنوع ہے کہ ہمیں بسا اوقات تخیل پرستی immaginations کے سبھاؤ کو ہی زندگی سمجھنا پڑتا

ہے۔ رامائین جو مختلف قصوں کو جوڑ کر مکمل ہوتی ہے باباجی کے بابوں کی کہانیاں بھی کچھ ایسی ہی تھیں مگر ان Role Modles کے ذریعے لوگوں کو اپنا آپ درست کرنے کا بھی موقع ملتا تھا اور امکانات کے در ہمیشہ وا رہتے تھے یہی ان کے فن کی Originality اور حقیقت تھی۔ اشفاق احمد جو کہ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے ماہر بھی تھے اپنی زندگی میں درس وتدریس' براڈ کاسٹنگ کے شعبہ سے متعلق رہے اور (ضیائی مارشل لاء میں) وفاقی وزارت تعلیم کے مشیر بھی رہے ادبی مجلہ داستان گو اور ہفت روزہ لیل ونہار کی ادارت بھی کی مرکزی اردو بورڈ جو بعد میں اردو سائنس بورڈ میں تبدیل ہو گیا تھا اس ڈائریکٹر بھی رہے اس کے علاوہ انہوں نے نثر میں بے پناہ خدمات سر انجام دیں شاید واصف علی واصف کے بعد یہ دوسرے ایسے انٹیکچول ہیں جن کے ارادت مندوں کا ایک وسیع حلقہ موجود ہے کہتے ہیں کہ سایہ دار درخت کے نیچے کسی دوسرے پودے کا پروان چڑھنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ بانو آپ جو کہ باباجی کی شریک حیات تھیں اردو ادب مین شاہکار تخلیقات جیسے راجہ گدھ کی خالق ہونے باعث اپنا منفرد مقام اور ادبی رتبہ رکھتی ہیں ان کا ساتھ باباجی کی بھرپور ادبی زندگی کا وہ زنگار ہے جو ذی فہم لوگوں کو بخوبی طور پر معلوم ہے خدائے بزرگ و برتر نے اس جوڑے کو کرہ ارضی پر بہت سوچ سمجھ کر اکٹھا کیا اور پھر انہیں ادبی میدان میں آگے سے آگے بڑھتے رہنے کے بھرپور مواقع میسر کیے عموماً ایسا ہوتا ہے کہ بڑی شخصیات کے ہاں بلند پایہ اولاد نہیں ہوتی مگر بانو آپا اور باباجی اس سلسلے میں بھی خوش قسمت واقع ہوئے کہ انہیں اولاد بھی ایسی نصیب ہوئی جس نے قرطاس وقلم سے رشتہ جوڑا۔ خدا انیق احمد کی عمر دراز کرے۔

باباجی کا مکتبہ فکر ان کے بعد بھی آگے بڑھے گا یا نہیں اس کے بارے مین ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے کیوں انہیں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر جو سہولیات میسر تھیں وہ بیان کی فکر کے ابلاغ میں بہت بڑا ہتھیار تھا۔ اب چونکہ ان کے نوک قلم سے کوئی ایسی نئی بات سامنے آنا ممکن نہیں رہا کہ میڈیا اس کے فروغ کا باعث بنے ان کے ارادت مندوں کے ردعمل کے بارے میں یہ خوش گمانی کی جا سکتی ہے وہ ان کی فکر کے احیاء اور فروغ کے لئے عملی اقدامات کریں گے کہ یہ اسلوب بھی زندگی کا ایسا رنگ ہے جس کے بغیر زندگی روکھی اور پھیکی ہے مرحوم کے نزدیک سلاطین اور

خانقاہوں کا اسلام ہی حقیقی رنگ تھا تو ان کی زندگی مین ان کے سامنے واہ واہ اور داد و تحسین کے طوفان کھڑے کرنے والوں کا اب یہ امتحان ہے اس میں اب وہ کس قدر رنگ آمیزی کرتے ہیں یا پھر گزرتے پل کے ساتھ وہ رنگ جو کسی قدر ان پر چڑھا تھا دھیرے دھیرے اترنا شروع ہو جائے گا ایک انسان ساری زندگی جو کچھ جمع جوڑا جاتا ہے تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ کوئی بھی زندگی اور انسانوں کے لئے کیا کرے اور کیا سوچے؟؟

خواندگان کرام...... آخر میں مرحوم اشفاق احمد کے لئے دعا ہے کہ رب ذوالجلال ان کی مغفرت کرے اور ان کا حساب اپنے نیک برگزیدہ اور پیارے بندوں میں کرے کہ انہوں نے جیتے جی اس کے بندوں سے ماسوائے پیار کرنے کے اور کچھ نہیں کیا اور سنا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو ہمیشہ محبوب رکھتا ہے جو اس کے بندوں کو محبوب رکھتے ہیں انا اللہ وانا علیہ راجعون۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

9 ستمبر 2004ء

داستان سرائے کا دیا

اوریا مقبول خان

(حرف راز)

سخت دھوپ یا شدید بارش میں جب وہ کسی درخت کے سائے میں چلا جاتا تو اس کی باتیں سننے والوں کا ہجوم اس درخت کو گھیر لیتا۔ وہ چلنے لگتا تو لوگ اس کے ساتھ چلتے' جہاں ٹھکانہ بنالیتا وہاں لوگوں کا جمگھٹا لگ جاتا' نہ تو عام یونانیوں کی طرح تیکھے نین نقش رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی آنکھیں سحر انگیز تھیں لیکن اس کی زبان سے حکمت اور دانائی کا رس گھولتا جادو لوگوں کو مسحور کر دیتا تھا۔ سقراط کو ایتھنز والوں نے خاموشی سے زہر کا پیالہ پینے دیا لیکن صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہ اسے دفن نہ کر سکے وہ تو ایتھنز شہر سے بہت زیادہ بڑا ہو گیا تھا۔ وہ اسے کہاں دفن کرتے منوں مٹی تلے تو ایسے لوگ دفن نہیں ہوا کرتے۔ آج جب میں لاہور کے اشکبار ہجوم کو ایک ایسے ہی شخص کو منوں مٹی تلے دفن کرتے دیکھ رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ لوگ کس یقین کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم ایک ایسے شخص کو دفن کر رہے ہیں جس کی کہانیاں' جس کی گفتگو' جس کی زبان کا سحر کتنا عرصہ ہوا اب لاہور شہر سے کئی ہزار گنا زیادہ بڑا ہو چکا تھا ایسے لوگ تو دنیا میں مرنے کے لئے آیا ہی نہیں کرتے بس جھلک دکھا کر خوشبو بکھیر کر یوں اوجھل ہو جاتے ہیں جیسے برسات کی تیز بارش تھمے تو کوئل کی کوک چند لمحے کی ہوتی ہے لیکن اگلی برسات تک کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اگلی برسات کا انتظار کرواتی رہتی ہے۔

لیکن اس براست میں جس آواز نے گھنے درختوں کا بسیرا چھوڑا ہے شاید ویسی آواز دوبارہ سننے کے لئے کئی سو برساتوں کا انتظار کرنا پڑے شاید یہ انتظار ہی رہے کہ ایتھنز والے بھی تو ڈھائی ہزار سال سے کسی اور سقراط کا انتظار کر رہے ہیں لیکن سقراط تو دوسری دفعہ نہیں آیا کرتے۔

میٹھی میٹھی' پیاری پیاری اور مرنجاں مرنج محبت بھری کہانیاں لکھنے وار ڈرامے تحریر کرنے والے اشفاق صاحب نے سقراط کی طرح سچ کی ننگی تلوار اپنی تحریر میں استعمال کرنا شروع

کی تو کون تھا جس نے طعن و تشنیع کے تیر نہ چلائے ہو۔ کس کس زبان سے یہ فقرے نہ نکلے تھے کہ دیکھو اشفاق احمد کو کیا ہو گیا ہے۔ اچھا بھلا لکھ رہا تھا اسے درس دینے کا شوق کیسے پڑ گیا۔ کس کس پروگرام میں کیسے کیسے پیشہ ور سوال گروں نے نہیں پوچھا ہو گا۔ اشفاق صاحب اب آپ ویسا کیوں نہیں لکھتے اور دوسری جانب سے ایک دلآویز مسکراہٹ کے بعد وہی مطمئن کرنے والا جواب آتا میں پرائمری میں بھی پڑھتا تھا' اب پ بھی لکھتا تھا کیا ساری عمر پرائمری ہی میں رہوں۔ لیکن کسے خبر تھی کہ وہ جس راستے پر روانہ ہوئے ہیں' جس منصب کی ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی ہے وہاں پرانے میلے کچیلے کلف والے کپڑے اتار کر گڈریے کی طرح ہجوم کی بھیڑوں کو اپنے لفظوں کی بانسری کے گرد جمع کرنا پڑتا ہے بڑا مشکل اور صبر آزما کام ہے ایسے گلے کی بھیڑوں کو جمع کرنا جو چاروں جانب بکھری ہوں' بے منزل' بے نشاں۔

اور پھر یہ گڈریا اپنی داستان سرائے میں بیٹھا اپنی گفتگو کی چاشنی اور اپنی کہانیاں نتی بچی باتوں کے سحر بکھیرتا رہا۔ اس نے اپنے میلے کچیلے کلف لگے کپڑے جلا دیئے جن سے پاپولر ڈرامہ نگار اور کہانی نویس کی انا کھڑ کھڑ کرتی تھی اور پھر اس کے اردگرد ویسے ہی ہجوم جمع ہونے لگے: باتوں کے سامنے ہمہ تن گوش اس کی آواز کے جادوں میں جکڑا ہوا۔

میں نے اس سقراط صفت شخص سے عجیب طرح کی محبت کی ہے یہ 1972ء تھا جب حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں' میں نے اپنا پہلا افسانہ پڑھا اشفاق احمد اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے میری حوصلہ افزائی اور تعریف کے بعد وہ تو روانہ ہو گئے لیکن اس شخص کے سحر میں گرفتار ہو گیا اس کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو کڑی دھوپ میں بھی چند لمحے رک جاتا دیکھتا او چل پڑتا محفل میں ملاقات ہوتی بات ہوتی تو بس سنتا رہتا۔ پتا نہیں کیوں میری ساری گفتگو' ساری قابلیت اس کے سامنے موذب سی ہو جاتی۔ ایسے لگتا جیسے میں ایک چھوٹا لوہے کا بے کار ٹکڑا ہوں جو ایک بڑے مقناطیس کے حلقے میں آ گیا ہو' لیکن مقناطیس کی صفت بھی عجیب ہوتی ہے یوں سینے سے لپٹتا ہے جیسے بس اسی سے ملنے کی خواہش ہو اسی کے لئے تڑپ اور لگن دل میں بسائے بیٹھا ہو۔

کبھی کبھی اشفاق احمد مجھے ہزار راتوں تک کہانی سنانے والے وہ کردار لگتے جن کے سامنے پوری قوم ایک شہزادے کی طرح ہو جو کسی جن کی قید میں ہو اور اس نے اس کے جسم میں اپنے جادو کے زور سے حرص و ہوس' انا' ظلم و زیادتی' مکر و فریب کی سوئیاں چبھو رکھی ہوں وہ ایک دن اور ایک رات میں کہانی سناتے اور ایک سوئی بدن سے نکال دیتے لیکن ابھی تو بہت سی سوئیاں باقی تھیں اور بہت سی کہانیاں بھی مگر وقت نے کسی کو ہزار راتوں تک کہانی سنانے نہیں دی۔

مجھے داستان سرائے کے مکین سے بہت محبت ملی۔ لیکن آج جب لوگوں کے جم غفیر میں گم جب ساری دنیا ایک شخص کے چلے جانے کے دُکھ میں ڈوبی تھی جس سے یہ شہر آباد تھا جو رخصت ہوا تو ایسا لگتا ہے لاہور خالی ہو گیا۔ اور شاید مدتوں خالی رہے کہ شہر سیمنٹ' سریے اور اینٹ گارے سے نہیں پہچانے جاتے ایسے لوگوں سے شناخت پاتے ہیں جن کا نام لیکر کوئی فخر سے کہہ سکے یہ اس کا شہر ہے میں لوگوں کے دکھ سے الگ سوچ رہا تھا جب اشفاق صاحب کوئٹہ میں میرے گھر آئے تو دروازے پر لگی تختی دیکھ کر رک گئے کہا اور یا کمال ہو گیا تم بھی 121-C میں رہتے ہو چلو کوئی ایک چیز تو ہم دونوں میں مشترک ہے پھر جب گزشتہ پی ٹی وی ایوارڈ پر اسلام میں ملے تو پوچھا کوئٹہ میں کتنے سال ہو گئے میں نے کہا 24 سال' کہا بہت نہیں ہو گیا۔ میں نے کہا ارادہ کر رہا ہوں بولے بس اب آ جاؤ لاہور' میں واپس کوئٹہ چلا گیا میں نے 121-C فروخت کر دیا اپنی جمع پونجی اٹھائی اور لاہور چلا آیا یہاں آ کر ابھی دم بھی نہیں تھا کہ خبر ملی دوسرے 121-C والے کا پتہ بھی تبدیل ہو گیا لوگوں کی طویل لائن بھی لگی جب بھی اس پرسکون چہرے کے پاس آ کر رکا ایسا لگا جیسے وہ اپنی مخصوص ہنسی میں ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہہ رہے ہوں دیکھو اور یا اب ہم میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں بس ایک۔ سب اس زمین پہ خاک میں جانے کو آئے ہیں۔

روزنامہ ''جنگ'' لاہور
9 ستمبر 2004ء

عرض کیا ہے

ریاض الرحمٰن ساغر

داستاں کہتے کہتے

وہ سرتاپا محبت کی زباں تھا
عجب شیریں سخن ، زشک بیاں تھا

اُسے کہتے رہے ہم ''داستاں گو''
مگر وہ تو مجسم داستاں تھا

نہ جانے کونسی تھی روح اس میں
کہ وہ ہر روح میں رُوحِ رواں تھا

تھا جو اشفاق احمد ایک بابا
یہیں تھا وہ مگر جانے کہاں تھا

چلے جانا تو تھا ہی اُسکو لیکن
بچھڑنے کا ابھی موسم کہاں تھا

''گڈریئے'' کی ضرورت تھی ابھی تو
ابھی اِک نسل کا ریوڑ جواں تھا

تبسم، ادھ کھلی کلیوں سا لب پر
تو چہرے پر بہاروں کا سماں تھا

تصوف کا وہ عشق انگیز خطبہ
وہ ایک ویران مسجد کی اذاں تھا

وہ بنا اپنی "بانو قدسیہ" کا
کہ جس پہ سب کو عاشق کا گماں تھا

وہ ہر سو جہل کے صحرا میں ساغر
کسی بدو کا ٹھنڈا سائباں تھا

روزنامہ نوائے وقت لاہور
9 ستمبر 2004ء

قندِ مکرر

آہ... اشفاق احمد!

دل گرفتہ ہے مری ارضِ وطن، تم جا چکے
چھوڑ کر اپنا چمن "پیر چمن" تم جا چکے
علم و دانش، آگہی، عرفاں کا تابندہ خیال
باعمل کردار، پاکیزہ چلن، تم جا چکے

سلیم اختر قریشی

روزنامہ "خبریں" لاہور
10 ستمبر 2004ء

------داستان گو چلا گیا------

چوپال اجڑ گئے!

عمران نقوی

(کنار راوی)

عدم آباد کا ایک مسافر" داستان سرائے" میں دم لے کر اپنی منزل کی سمت روانہ ہو گیا۔ عجب جادو مزاج مسافر تھا جتنے پل یہاں مقیم رہا اپنے سحر سے دلوں کے قلعے مسخر کرتا رہا۔ اپنی باتوں کے اسم سے باطن کے در وا کرتا رہا۔ اپنے افسانوں کی طلسم کدے میں نئی نئی دنیا میں آباد کرتا رہا۔ اس کی زنبیل میں افسانے' ڈرامے سفر نامے اور نجانے کیا کیا کچھ بھرا تھا۔ وہ زنبیل کھولتا تو لفظ تخلیق کا لباس پہن کر جبین وقت پر کھل اٹھتے۔ وہ بولتا تو ایک زمانہ دم سادھے اس کے لہجے میں گم ہو جاتا۔ وہ ایک ایسا درخت تھا جس کی شاخوں پر فکر کی چڑیاں چہچہانے آ جاتیں۔ وہ ایک ایسا میٹھا چشمہ تھا جس سے تھکے ہارے مسافر من کی پیاس بجھاتے اور زندگی کی کڑے مسافتوں پر روانہ ہو جاتے افسوس! بچھڑتی ساعتوں کے بے رحم ہاتھوں نے حرف حرف شیرینیاں بانٹتا یہ شخص ہم سے چھین لیا۔ داستان گو چلا گیا' منتظر ساعتیں دم بخود ہیں اب یہ چوپال پھر نہیں بسے گا۔

ضیاء الحسن نے کہا تھا

کیسے کیسے نہ تھے قصہ گو شہر میں
بولتے تھے کبھی اب نہیں بولتے

خالد شریف کے بقول

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دشت بے در و تک دشت ہی دشت ہے۔ پیاس ہے تا بہ حد نظر پیاس ہے۔ آسمان پر کہیں کوئی بادل کا ٹکڑا نہیں۔ رہروان طلب منتظر ہیں کسی حرف شریں کے...... اور ستمبر کی سات کو سانسوں کی ایک طناب کیا ٹوٹی، جسم کا خیمہ زمیں بوس ہو گیا۔ وہ جو لبوں پر نقش ہو گیا۔ ہوا ہے کہ قریہ سسکتی پھر رہی ہے۔ گلابوں کے چہرے زرد پڑ گئے ہیں۔ تتلیاں خوشبوؤں کا راستہ کھو بیٹھی ہیں۔ خزاں ہے کہ امڈتی چلی آتی ہے۔ رات ستارہ کیا ٹوٹا کہ سارے ہی مسافر بھول گئے۔ اب راہ تو بے نشان راہ کوئی نہیں مسافر جائیں تو کدھر جائیں منزل پکارے تو کسے پکارے۔ ایک چپ بے چار سو پھیلی اندھی چپ۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

10 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد.......اور اجمال

تاریخ پیدائش 22 اگست 1925ء (ضلع فیروز پور بھارت) سلسلہ ملازمت.... لیکچرر (اردو) دیال سنگھ کالج لاہور' لیکچرر (اردو) روم یونیورسٹی اٹلی' لیکچرر پنجابی (پنجاب یونیورسٹی) ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بوڈ (ملازمت کا سب سے طویل دور اسی ادارے میں گزرا) ادارت.... ماہنامہ ''داستان گو'' لاہور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' لاہور۔

اعزازات..... صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی 1979ء ستارہ امتیاز' گریجوایٹ ایوارڈ' پی ٹی وی ایوارڈ' فروغ ادب کا عالمی ایوارڈ' سابق ممبر انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد یونیورسٹی سابق ممبر کمیٹی آف سزان پاکستانی کلچر (ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور) سابق ممبر انجمن ترقی اردو بورڈ کراچی' سابق ممبر پاک ایڈوائزری کمیٹی برکلے اردو پ۔ پروگرام برکلے یونیورسٹی امریکہ' سابق ممبر نیشنل کونسل آف آرٹس اسلام آباد۔

تصانیف.. سفر در سفر' گلدان' حسرت تعمیر' جنگ بجنگ صبحانے افسانے ایک ہی بولی' پھلکاری' ایک محبت سو افسانے' من چلے کا سودا' شاہلا کوٹ' حیرت کدہ' سفر مینا' طلسم ہوش افزا (سائنس فکشن) گڈریا' اجلے پھول ننگے پاؤں' بند گلی (ڈرامے) کھیل تماشا' اچے برج لہور دے' بابا صاحبا' تلاش' تو تا کہانی' مہمان سرائے' کھٹیا وٹیا' زاویہ' دھینگا مشتی' شوراشوری' ڈھنڈورا' ذکر شہاب (یادنامہ' قدرت اللہ شہاب مرحوم)

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

تلقین شاہ کی آواز مر گئی

ریڈیو پاکستان کے لئے برسوں پر محیط خدمات کا اجمالی جائزہ

محمد اسلام شاہ

اشفاق احمد نے ادبی سفر "گڈریا" سے شروع کیا۔ پھر اردو ادب میں پانی گراں قدر خدمات کے ذریعہ بلند مقام حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ہی ریڈیو پاکستان میں ان کی تخلیقات نے انتہائی مقبولیت حاصل کی اپنی ایک تحریر "میرا ریڈیو پاکستان لاہور۔ میں لکھتے ہیں۔

"میں نے اپنی رسمی تعلیم تین یونیورسٹیوں سے حاصل کی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ روم یونیورسٹی (اطالیا) اور گرینوبل یونیورسٹی (فرانس) لیکن ان کے علاوہ ایک چوتھی یونیورسٹی بھی ہے جس سے مجھے باقاعدہ کوئی سند یا ڈگری نہ مل سکی البتہ اس کے عطا کردہ کرم نے میری زندگی کی راہوں کو منور کیا۔ اس نور سے نہ صرف میری راہیں روشن ہوئیں بلکہ اس روشنی میں اپنے ساتھیوں کو بھی نئی جہتوں کے نشان دکھانے میں بہت حد تک کامیاب ہوا یہ چوتھی یونیورسٹی ریڈیو پاکستان لاہور تھی ......

انہوں نے ریڈیو کیلئے تقریباً 48 ڈرامے اور 229 فیچر اور خاکے تحریر کیے۔ مختصراً یہ کہ اپنے عہد کے ادیبوں میں سب سے زیادہ ریڈیو کیلئے انہوں نے لکھا۔ اشفاق صاحب ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ بہتری ڈرامہ پروڈیوسر بھی تھے۔ انہوں نے ایک جشن تمثیل میں اپنا ڈرامہ "متاع غرور" خود پیش کیا اور سامعین سے بے پناہ داد حاصل کی وہ اپنا فیچر تلقین شاہ خود پروڈیوس کرتے اور اس میں کامیاب ترین ڈرامہ آرٹسٹ کی حیثیت سے خود تلقین شاہ کا کردار ادا کرتے یہ فیچر سالہا سال ہفتہ وار نشر ہوتا رہا۔ انتقال سے چند ہفتے پہلے شدید بیماری کی وجہ سے یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اس مقبول ترین فیچر کے علاوہ حسرت تعمیر پروگرام بھی کیا۔ داداولوہار کے کردار سے بھی سونی دھرتی پروگرام کے میزبانوں کی رہنمائی کی۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن میں موسیقی کے پروگراموں میں انٹرویوز

کئے اور مخصوص بیٹھک کا انداز بھی سجایا۔ ڈرامہ آرٹسٹوں میں محمد حسین، نزیر حسینی (ہدایت اللہ) آفتاب احمد موہنی حمید، خورشید شاہد، خالدہ ارجمند اور ثروت عتیق کی بہت تعریف کرتے تھے۔ موسیقاروں میں امانت علیؒ خاں سے بہت پیار کرتے ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار، ڈرامہ آرٹسٹ ہونے کے علاوہ وہ بہت بڑے انسان دوست بھی تھے۔ ان کے دوستوں میں ممتاز مفتی، مسعود قریشی، خواجہ عمر سر فہرست تھے ان کے ساتھ وہ سیر و سیاحت بھی کرتے تھے۔ ان کے دوستوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ریڈیو آزاد کشمیر کا آغاز کیا اور اسے کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق چلایا۔

اشفاق احمد سٹیج پر آتے تو تقریب کو گل و گلزار بنا دیتے انتہائی قیمتی معلومات اور ہدایات انتہائی خوبصورت اور دلچسپ انداز میں بیان کرتے۔ حلقہ ارباب ذوق کی صدارت کرتے تو علم و ادب کے دریا بہا دیتے۔ پنجابی ادبی سنگت کی ایک صدارت میں آپ نے اپنی چھوٹی چھوٹی پنجابی نظمیں سنانی شروع کیں تو لوگوں کی فرمائش پر کافی دیر تک وہ سلسلہ جاری رہا۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

اہل قلم کے تعزیت نامے

(منیر نیازی)

اشفاق احمد صاحب کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اردو ادب کا ایک بڑا افسانہ نگار رخصت ہو گیا۔ مرحوم میرے بڑے اچھے دوست بلکہ عزیز تھے۔ ان کی وفات میرا ذاتی نقصان بھی ہے

(ڈاکٹر وزیر آغا)

اشفاق احمد صاحب کی شدید علالت کی خبریں تو مل رہی تھیں لیکن اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک اپنے عزیزوں، دوستوں اور مداحوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اشفاق احمد کے رخصت ہونے سے نہ صرف اردو افسانے کا ایک دور ختم ہو گیا ہے بلکہ خود افروزی کی اس تحریک کی بھی دھچکا لگا ہے جو ربع صدی سے جاری تھی اور جس کے فروغ میں وہ ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے ادب کے علاوہ انہوں نے شو بزنس میں بھی بڑا نام پیدا کیا اور اسے بھی اپنے افکار کی ترسیل اور فروغ کیلئے استعمال کیا۔ اشفاق احمد پوری اردو دنیا میں ایک اہم تخلیق کار کی حیثیت رکھتے تھے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)

اشفاق احمد حقیقتاً ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔ وہ براڈ کاسٹر، استاد، فکشن رائٹر، ڈرامہ نگار، سفرنامہ نگار، شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مسحور کن گفتار کے حامل شخص تھے میرے خیال میں ان کا اصل کام جس کی بنا پر وہ زندہ رہیں گے ان کے افسانے اور ناول ہیں۔ وہ قیام پاکستان کے بعد

اُبھرنے والے فکشن رائٹرز میں انتہائی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔زندہ کردار تخلیق کرنے کی جتنی صلاحیت ان میں تھی وہ گزشتہ نصف صدی میں کسی اور کو قدرت کی طرف سے عطا نہیں ہوئی کسی کو عہد ساز کہا جا سکتا ہے تو وہ بلاشبہ اشفاق احمد ہیں جن کے افکار و خیالات نے دونسلوں کو متاثر کیا ہے۔

(حکیم سرو سہارنپوری)

اشفاق احمد کی رحلت ہماری ادبی اور ثقافتی زندگی کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مرحوم ادب اور آرٹ کی دنیا کی ایک بڑی قدآور شخصیت تھے۔

(افتخار عارف)

اشفاق احمد کی وفات ایک بڑا قومی اور تہذیبی سانحہ ہے۔وہ ان چند شخصیات میں شامل تھے جو پاکستان کی ادبی شناخت کا حصہ ہیں اور جن کی نگارشات ادب کے عالمی نقشے پر پاکستان کی نمائندگی کرتی ہیں ہماری ادبی تاریخ میں وہ ہمیشہ ایک اہم تخلیق کار کے طور پر یاد کیے جاتے رہیں گے۔

(امجد اسلام امجد)

اشفاق احمد ہمارے دور کے Greats میں شامل تھے۔اردو ادب میں ان کی حیثیت "آل راؤنڈر" کی تھی۔وہ جس فیلڈ میں گئے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ڈرامہ نگاری میں وہ میرے لئے رول ماڈل تھے۔اس حوالے سے مجھے ہمیشہ ان کی محبتیں حاصل رہیں۔

(حفیظ الرحمٰن احسن)

اشفاق احمد ادب' آرٹ' آواز اور تصویر کی دنیا میں ایک ایسی باکمال اور یگانہ روز

شخصیت تھے جو دنیا کی بہت کم قوموں کو نصیب ہوتی ہے یوں عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو کوئی عجب نہیں کہ وہ دنیائے ادب وفن کی ایک منفرد شخصیت قرار پائیں۔ وہ ہمارا سرمایہ افتخار تھے۔ ان کی زندہ جاوید تحریریں ہر عمر کے اہل قلم کیلئے قابل تقلید نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(خالد اقبال یاسر)

اشفاق احمد کی وفات پر یوں لگا جیسے اردو سائنس بورڈ یتیم ہو گیا ہو۔ بورڈ کے عملے میں بہت سے لوگ پچیس سال تک ان کے زیر سایہ رہے اس لئے ان کے انتقال کو یہاں ذاتی صدمہ سمجھا گیا مرکزی اردو بورڈ اور پھر اردو سائنس بورڈ۔ نے 1967ء سے لے کر 1989ء اور 1991ء سے 1993 کے عرصے میں ترقی کی بہت سی منزلیں ان کی ذاتی محنت کے سبب تہہ کی ہیں

(قاضی جاوید)

اشفاق احمد صاحب کی شخصیت کے جو پہلو عام طور پر پوشیدہ رہے ہیں ان میں ایک فلسفے سے ان کا لگاؤ ہے کبھی کبھی ان سے اس موضوع پر دیر تک باتیں ہوا کرتی تھیں۔

(ابصار عبدالعلی)

اشفاق صاحب کی وفات سے اردو ادب کا ایک زریں عہد ختم ہو گیا لیکن ان کی تخلیقات کی زندگی خضر سے کم نہیں ہو گی۔

(فرخ زہرا گیلانی)

اشفاق احمد کی تحریر پڑھتے ہوئے انسان کو مختلف جہانوں کی سیر کا موقع میسر آتا ہے حق مغفرت کرے۔

(خالد شریف)

اشفاق احمد سراپا شفقت اور محبت تھے اتنے بڑے ادیب افسانہ نگار ڈرامہ نگار اور دانشور ہونے کے باوجود ان میں غرور و تکبر نام کو نہ تھا۔ ریڈیو کے دیومالائی کردار تلقین شاہ کے ذریعے انہوں نے عوام الناس اور خواص میں یکساں پذیرائی حاصل کی۔

(اے۔جی جوش)

اشفاق احمد ایک بڑے افسانہ نگار اور بڑے ڈرامہ نویس تھے۔ انہوں نے جو لکھا اور جتنا لکھا وہ آنے والی نسلوں کیلئے مشعل راہ ہے۔

(ڈاکٹر اختر شمار)

اشفاق احمد کی وفات سے اردو ادب و ثقافت ایک بہت بڑے زیرک انسان اور جینوئین ادیب سے محروم ہوگئی ہے ان کا خلا کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ آپ ایک پہلودار شخصیت کے مالک تھے ان کی موت ایک عہد کی موت ہے۔

(ڈاکٹر ضیاء الحسن)

اشفاق احمد اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں "گڈریا" کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے وہ ایک وسیع الجہت ادیب تھے۔ عوام میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے خواص میں محترم۔

(پروفیسر حمیدہ شاہین)

اشفاق احمد نے اردو میں فقری ڈارے کی بنیاد رکھی۔ان کے ڈارے گہری معنویت کے ساتھ ناظرین کیلئے دلچسپی کے عناصر سے معمور تھے۔وہ جتنے بڑے ادیب تھے اتنے ہی بڑے انسان تھے۔

(عدنان اقبال)

اشفاق احمد قوم کا قیمتی اثاثہ تھے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف صوفیانہ اندازہ کو اپنایا بلکہ ڈارموں میں بھی انہوں نے اصلاح کے پہلو کو ہی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ان کی وفات سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے پور ہو سکے گا۔البتہ ان کی تحریریں آنے والوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی اور ادب میں ان کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا

روزنامہ نوائے وقت لاہور،

10 ستمبر 2004

پیارا دوست، کھرا انسان

ڈاکٹر وحید قریشی

اشفاق احمد سے میری دوستی کم و بیش 45 برس پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میں دوبارہ لاہور آ کر اسلامیہ کالج میں ملازم ہوا اور اپنا مکان سمن آباد میں بنایا۔ اشفاق میرے قریب ہی رہتے تھے۔ اس زمانے میں ان سے دوستی ہوئی اور ان 45 برسوں میں مجھے کوئی دن ایسا یاد نہیں جب کوئی اختلاف ہوا ہو یا کوئی بدمزگی پیدا ہوئی ہو اس زمانے میں اشفاق ایک دنیادار نوجوان تھا جو نفسیات کے علم کی وجہ سے ہر مدمقابل کو مسخر کر سکتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ روحانیت کی طرف نکل گیا۔ اسکی محبت دوستوں تک محدود نہیں رہی بلکہ ہر شخص کیلئے اس کے دل میں محبت کا جذبہ بیدار رہتا تھا۔ اس کے قریبی دوستوں میں تو اے حمید تھا لیکن ان کے وسیع تر حلقے میں 'میں بھی موجود رہا' پھر وہ ماڈل ٹاؤن میں چلے گئے' کبھی کبھار ملنا جلنا ہوتا تھا پھر جب میں اسلام آباد میں مقتدرہ قومی زبان کا صدر نشیں ہوا اور ممتاز مفتی سے زیادہ قریبی تعلقات استوار ہوئے اور قدرت اللہ شہاب سے راہ و رسم پیدا ہوئی تو پھر اشفاق احمد کو میں نے بہت زیادہ قریب سے دیکھا اور ان کے مزاج کے نرم و ملائم پہلو مجھ پر اور زیادہ منکشف ہوئے۔ جہاں تک ان کی ادبی خدمات کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک باب ان کے انتقال سے ختم ہو گیا۔ وہ فکشن ہی کا بہت بڑا نام نہیں' اردو نثر کا بھی ایک عظیم رائٹر تھا۔ اس کا سفرنامہ جو دراصل اس کے دوستوں کی سرگزشت ہے ایک لحاظ سے ہمارے سفرنامے کی صنف میں ایک نیا تجربہ تھا۔

اشفاق نے ڈرامے میں بھی نام پیدا کیا۔ ''گڈریا'' سے جس آدمی نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا وہ ادب کے میدان میں آگے ہی بڑھتا چلا گیا اور آج اس کی ٹکر کا کوئی ادیب مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ اشفاق کو میں نے غم و الم کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔ ابن انشاء کا انتقال، شہاب صاحب کا انتقال اور ممتاز مفتی کی وفات ان کیلئے بہت بڑے صدمے تھے اور سب سے بڑا صدمہ

بانو کی بیماری ہے۔ 1987ء میں جب میرے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ پر فالج کا حملہ ہوا تو اشفاق بھی اس زمانے میں بہت پریشان تھے۔ بانو ہسپتال میں زیرِ علاج تھیں۔ اشفاق کے گلے میں گلٹی نکل آئی تھی اور اس کا آپریشن بھی اسی زمانے میں ہوا لیکن اشفاق میں جو حوصلہ اور ہمت ہے اس کے باعث اس نے یہ صدمات بھی جھیل لئے۔ اشفاق ایک پیار دوست' ایک کھرا ساتھی اور ایک عظیم ادیب تھا جس کی وفات نے ایک دور کا خاتمہ کر دیا ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

گمشدہ لوک دانش کا کھوجی

ڈاکٹر سلیم اختر

اشفاق احمد کی تخلیقی شخصیت متنوع جہات کی۔حامل تھی۔عوام نے تو ان کے ڈرامے دیکھے اور خواص نے افسانے پڑھے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت کے یہ خارجی مظاہر تھے۔ اصل اشفاق احمد ان سب کے پردے میں روپوش ایسا بازیگر تھا جو بیک وقت ہوا میں کئی گیندیں اچھال رہا ہوتا ہے۔تمام گیندوں کو سنبھالے رکھتا ہے اور جب تک چاہے ان گیندوں کو اچھالتا رہتا ہے۔

اشفاق احمد وسیع المطالعہ انسان تھے۔اگر ایک طرف سائنس اور سائنس فکشن سے دلچسپی تھی تو دوسری طرف تصوف سے بھی ذائقہ شناس تھے۔ان کے ڈراموں میں کم کم مگر بعض افسانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے۔اگرچہ انہوں نے ایک محبت سو افسانے اور منچلے کا سودا جیسے ڈراموں سے عوامی مقبولیت حاصل کی مگر ذاتی طور پر مجھے ان کی ڈرامہ سیریز ''حیرت کدہ'' بہت پسند تھی۔اگرچہ اشفاق احمد جیسے متنوع جہات کے حامل افراد کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا مگر جہاں تک میں انہیں سمجھ سکا ہوں، اشفاق احمد بنیادی طور پر بے حد ذہین بھی ہو تو یہ ذہنی جستجو علم کے ہفت خواں طے کرانے کا باعث بنتی ہے۔اشفاق احمد نے عمر علم کی تپسیا میں بسر کی البتہ یہ ہے کہ شاید وہ اپنے تمام علم کا ڈراموں اور فکشن کی بجائے اپنی گفتگو میں نسبتاً زیادہ روانی سے اور بہتر طور پر اظہار کر سکے' اس ضمن میں ان کے ''بابوں'' نے بھی خصوصی شہرت حاصل کی۔اشفاق احمد مروج تعلیمی نصاب اور انگلش میڈیم سکولوں کے برعکس لوک دانش کے قائل اور رسیا تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ ایک بڑے پروفیسر کے کتابی مطالعہ کے مقابلہ میں ایک موچی' ماشکی' جمعدار' خوانچہ لگانے والا' ہل چلانے والا صاحب دانش ہو سکتے ہیں تو۔لہٰذا ان کی تقاریر میں ''بابا'' اس لوک دانش کی علامت کے طور پر آتا ہے سکولوں اور کالجوں میں دی جانے والی تعلیم کی وجہ سے اس سے ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔اشفاق احمد دراصل دانش کی اسی گم شدہ میراث کی تلاش میں تھے۔یہی نہیں بلکہ گم شدہ لوگ دانش کے وہ

خود ہی سب سے بڑے امین تھے اور اقبال کے الفاظ میں یہی سب سے بڑی متاع فقیر تھی جو وہ سب میں تقسیم کرنے میں کوشاں رہے۔

اشفاق احمد کی دلچسپ گفتگو محض فقرہ بازی، معاصرین پر تبرے اور ادبی سیکنڈلز کے برعکس دانش آموز ہوتی تھی۔ اس حد تک کہ اپنے کردار کی مند وہ خود بھی تلقین شاہ بن کر رہ گئے۔ لیکن ہماری قوم کو بھلا دانش وبصیرت' اخلاق اور پسندیدہ اطوار سے کیا لینا۔ اسلئے ان کے ڈراموں سے بھی لطف اندوز ہوتے سکرین پر تالیاں بجاتے مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔ اشفاق احمد سیلف میڈ تھے اسی لئے عملی انسان بھی تھے۔ انہوں نے بھرپور تخلیقی زندگی بسر کی مگر کمال یہ ہے کہ جس شعبہ میں بھی کام کیا وہیں انفرادیت کے نقوش مرتسم کئے۔ اردو سائنس بورڈ کی سربراہی سے جب فارغ ہوئے وہ ایک مثالی ادارہ بن چکا تھا۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے تلقین شاہ 39 برس تک مسلسل نشر ہوتا رہا۔ اس کے رائٹر یا اداکار' ہدایت کار اور پروڈیوسر سب کچھ خود اشفاق احمد ہی ہوتے تھے۔ ہر ہفتے نیا کھیل لکھنا اور پروڈیوس کرنا آسان کام نہیں اس کھیل کا خطاب دراصل پاکستانی عوام سے تھا اور دلچسپ مکالموں کے ذریعہ سے عوام میں سیاسی سماجی اور اخلاقی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ منچلے کا سودا میں یہ پیغام روحانیت کے حوالے سے دیا گیا تھا۔ ان کا ٹی وی پروگرام زاویہ تو تھا ہی لوک دانش کے ابلاغ کے لئے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

10 ستمبر 2004ء

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ڈاکٹر انور سدید

اشفاق احمد نے غیر نظریاتی افسانے لکھے انہوں نے کسی ''ازم'' (Ism) کی تبلیغ نہیں کی، اپنے کرداروں کے ہاتھ میں سرخ پھریرا پکڑانے اور انقلاب زندہ باد کہہ کر بھوک افلاس اور اقتصادی پامالی قبول کرنے کی تلقین نہیں کی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے جس انسان کو اپنے افسانوں میں چلتے پھرتے، بولتے اور سماجی واقعات پر اپنا تاثر ظاہر کرتے دکھایا وہ آج کا حقیقی انسان تھا چنانچہ اشفاق احمد کے افسانوں میں زندگی کی رمق آج بھی موجود ہے اور ان کے ابتدائی دور کے افسانے جو 1940ء کی دہائی کے آخری سالوں میں تخلیق ہوئے اپنا گہر تاثر چھوڑتے ہیں، میں یہاں ان کے افسانے ''توبہ''..... ''امی''..... ''اجلے پھول''... ''گل گڈریا'' ..... ''شب خون'' کا حوالہ دے سکتا ہوں جو گزشتہ نصف صدی سے میری لوح دماغ پر نقش ہیں۔

1977ء کے لگ بھگ میں نے اپنی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں تو اشفاق احمد کو حلقہ ارباب ذوق کے ایسے افسانہ نگاروں میں شمار کیا تھا جنہوں نے فن میں ترقی پسندوں کی تقلید کی برعکس اجتہاد کو فروغ دیا تھا انہوں نے پاکستان کے نئے معاشرے میں ان قدروں کی مجتمع کرنے اور افسانے کے پورے ماجرے اور کرداروں کے عمل سے ان کی داخلی حقیقت آشکار کرنے کی کوشش کی جن کے فروغ کیلئے برصغیر سے کاٹ کر ایک آزاد وطن حاصل کیا گیا تھا انہوں نے افسانے کا مواد زندگی کے خارج سے حاصل کیا جہاں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی آہ و بکا جاری تھی۔ اس دور میں اشفاق احمد نے محبت کی شمعیں روشن کیں اور ایسے افسانے تخلیق کئے جو انسانی محبت کے مرکزی نقطے پر گردش کرتے تھے۔ ان کا افسانہ ''گڈریا'' نقوش کے افسانہ نمبر میں شائع ہوتے ہی کلاسیکی درجہ حاصل کر چکا تھا۔ رسالہ ''لیل ونہار'' کی ادارت اور ''اردو سائنس بورڈ'' کی نظامت ان کی زندگی کے دو اور قابل ذکر واقعات ہیں داستان گو کے نام سے انہوں نے ایک انوکھا رسالہ بھی جاری کیا تھا

اشفاق احمد اظہار کی بے پناہ وسعت کے افسانہ نگار تھے وہ کہانیاں تخلیق نہیں کرتے تھے بلکہ کہانیاں ان پر سہل ممتنع اشعار کی طرح غیب سے اترتی تھیں اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے خود کو ایک مکینک قرار دیا تھا لیکن ان کی میکنزم میں ''اتحاد'' کا خطیر عنصر موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے معاشرے کے اخلاقی انحطاط کی اصلاح کیلئے ریڈیو پروگرام ''تلقین شاہ'' شروع کیا تو یہ برسوں ریڈیو پاکستان کا مقبول ترین پروگرام ثابت ہوا۔ ٹیلی ویژن پر ''لیکن .... ''ایک محبت سو افسانے'' .... ''حیرت کدہ'' .... ''اچے ...ج لاہور دے .... ''منچلے کا سودا'' جیسے سیریل لکھے اور ان کی پروڈکشن کی نگرانی بھی کی تو ان کو بے پناہ داد ملی۔ 1965ء کی جنگ میں انہوں نے ''داود لوہار'' کے نام سے ایک کردار تخلیق کیا جو ریڈیو پر ہر شام ہر محاذ پر لڑنے والے جوانوں کی ہمت افزائی کرتا اور یوں انہوں نے مقبول نغمہ نگاروں سے زیادہ خود اپنی آواز اپنے سکرپٹ سے قومی خدمات انجام دیں۔ زندگی کا آخری زاویہ ان کی تصوف کی طرف رغبت تھی ابتداء میں انہوں نے واصف علی واصف کا دامن پکڑا لیکن پھر ان کا اپنا باطن روشن ہو گیا اور وہ خود دکھی انسان کو فلاح کا راستہ دکھانے لگے۔ ان کا مقبول پروگرام ''زاویہ'' ٹی وی پر ہر ہفتے نشر ہوتا تو لاکھوں لوگ اسے دیکھتے اور اشفاق احمد کو بھی ''باباجی'' کہنے لگے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

ٹاہلی دے تھلے، کھڑیا وٹیا

ڈاکٹر شہباز ملک

اشفاق احمد دوجے نوں ترقی کردا ویکھ کے خوش ہوندے سن۔ سگوں محنت تے استحقاق نال مرتبہ حاصل کرن والے دی حوصلہ افزائی کردے سن تے شاباش دین توں سنکوچ نہیں سن کر دے۔ ایس دا ثبوت میں اپنے حوالے نال پیش کرنا آں کہ جدوں میں 1982ء وچ پاکستان وچ پنجابی دی پہلی پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی توں کیتی تے اونہاں اپنی شاباش سے خاص ڈھنگ دے تحت ایک روپے دے کرنسی نوٹ اتے "شاباش شہباز ملک" لکھ کے مینوں دتی۔ اوس موقع اتے اونہاں دسیا کہ ایس ڈھنگ دی شاباش اونہاں ہن تیکر صرف محمد قوی خان تے عظمیٰ گیلانی نوں دتی اے۔ میں ایس نوں اشفاق احمد ایوارڈ قرار دیناں آں۔ اشفاق احمد ہوراں آپ جو پنجابی وچ لکھیا اوہ وی سونے دے تول تکن دے لائق اے "ٹاہلی دے تھلے (1960ء) بارے اوہ آپ لکھدے نے۔ "ایہہ ڈرامے پلاٹ دے ڈرامے نہیں چھوٹیاں چھوٹیاں کیریکٹر سٹڈیاں نیں" ڈرامے نہیں ڈرامیاں نیں اک مقام تے اک تھاں رنگ رنگ دے لوک تے آپو اپنی سوچ دے بندے مل لیندے نیں یا اتفاقاً مل جاندے نیں۔ اونہاں دیاں جذبیاں سوچاں محبتاں نفرتاں تے خوشیاں دے ٹاکرے ہوندے نیں تے فیر اوہ آپو آپ ای راہ تے ٹر جاندے نیں" اشفاق احمد ڈرامے دے بندے سن اونہاں "ٹاہلی دے تھلے" دے حوالے نال ایس نکی جنی گل بات وچ اتناں دیاں ڈونگھیاں گلاں کر دیتاں نیں۔ "ٹاہلی دے تھلے" سنن ویکھن یاں پڑھن تو مگروں آپ مہارے ایہہ گل نتر تے نکھر کے سامنے آجاندی اے کہ اینہاں ڈرامیاں دی اثر پذیری مسلم اے ایس حوالے نال ایہہ کامیاب ڈرامے اکھوا سکدے نیں، پہلے پہل ایہہ ڈرامے ریڈیائی تکنیک نال لکھے گئے جدوں پاکستان وچ ٹیلی ویژن آیا تے اینہاں ڈرامیاں نو ٹیلی ویژن ڈرامے دی تکنیک نال ری رائٹ کر کے ٹیلی کاسٹ کیتا گیا اینہاں وچوں کئی ڈرامے 1965ء دی پاکستان بھارت جنگ سے موقع تے ٹیلی کاسٹ ہوئے تے بلاشبہ ناظرین دے مورال نوں اچا کرن دا قومی فرض انجام دیتا۔

اشفاق احمد ہوراں اپنی کتاب کھڑیا وٹیا (1988ء) وچ جدید احسا دی شاعری کیتی اے اُنج اوہ ڈرامہ نگار دے نال نال پنجابی شاعر وی بن گئے اونہاں دی کتاب پھلکاری 1991ء

کردار تلقین شاہ دی لفظالی وچ لکھی افسانیاں دی کتاب ہے ایس نوں اک حوالے نال پنجابی دے خانے وچ وی پایا جاسکدا اے۔ میں اونہاں نوں پنجابی زبان تے ادب دے محسناں وچ گناں گا ایس لئی کہ پنجاب یونیورسٹی وچ شعبہ پنجابی دے اجرا' نصاب سازی تے تدریس وچ اونہاں عملی طور تے حصہ لیا' اونہاں دے لکھے ڈرامے ''ٹاہلی دے تھلے'' 1960ء ہن تیکر ایم اے پنجابی تے سی ایس ایس (پنجابی) دے نصاب وچ شامل نیں ایہہ ای نہیں اونہاں مرکزی اردو بورڈ تے سائنس بورڈ دے ڈائریکٹر ہون دی حیثیت وچ پنجابی زبان تے ادب بارے جو کم کروائے اوہ وی پنجابی ادب وچ میل پتھر دا درجہ رکھے نیں۔ ایہناں وچ اردو پنجابی لغت 1974ء (مرتبہ ارشاد پنجابی) پنجابی اردو لغت 1989ء مرتبہ تنویر بخاری تے اردو کے خوابیدہ الفاظ 1972ء مرتبہ اشفاق احمد ذکر دے قابل نیں۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

(LITERATURE)

ادبی ایڈیشن

رنگین لاچا، کرک ڈگلس، والٹن کیمپ اور پیر کامل

اے حمید کی کتاب ''داستان گو'' سے چند اقتباسات

وہ مجھے پہلی بار 1948ء میں لاہور میں ملا تھا ظاہر ہے پاک ٹی ہاؤس میں یا اس کے آس پاس کہیں کافی ہاؤس کی قریب ہی ملا ہوگا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا، تو مجھے مشہور امریکی ایکٹر کرک ڈگلس یاد آ گیا تھا۔ وہی چوڑا چکلا چہرہ، مضبوط جبڑا، فراخ ماتھا، چوڑے کندھے، سرخ و سفید رنگ.... اس کے چہرے پر ایک تاثر تھا کچھ اس قسم کا تاثر جیسے وہ کوئی شرارت کر کے آ رہا ہے دوسری بات جو میں نے پہلی ملاقات میں نوٹ کی یہ تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا ہے دلچسپ باتیں کرتا ہے اور اس میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔

ماضی کے دھندلکوں پر نظر ڈالتا ہوں تو کچھ جھلکیاں سی ابھرتی ہیں۔ جیسے موسلا دھار بارش کے بعد بادلوں میں دور کبھی کبھی بجلی چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب مشرقی پنجاب سے مہاجرین کے لٹے ہوئے قافلے پاکستان میں آ رہے تھے تو وہ والٹن کیمپ میں موجود رجسٹر پر مہاجرین کے نام وغیرہ درج کیا کرتا تھا پھر وہ ملتان چلا گیا اور وہاں مہاجرین کیمپ میں کام کرتا ہے مگر وہاں دیر اس کا قیام نہ رہا اور وہ لاہور آ گیا۔ انیس نمبر ایک مزنگ روڈ والا مکان الاٹ ہو چکا تھا اس مکان کی تین چار منزلیں تھیں اور ایک زینہ ہر منزل سے ہوتا اور اوپر والی منزلیں تک جاتا تھا۔ اس اوپر والی منزل میں اشفاق احمد کا اپنا سٹوڈیو نما کمرہ تھا۔ ان دنوں وہ پینٹنگ بھی کرتا تھا۔ کمرے میں کتابیں' تصویروں کے فریم' رسالے ہر قسم کی چیزیں ہوتی تھیں۔ ایک ایزل تھا جس پر ایک کینوس پر ایک آئل پینٹنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ تجریدی آرٹ تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ بعد میں یہی تصور ممتاز مفتی کی کتاب ''اسمارائیں'' کے ٹائٹل پر نظر آئی۔ یعنی ''اسمارائیں'' کتاب کا سرورق اشفاق احمد نے بنایا تھا۔ جب اشفاق مجھے اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ دکھا رہا تھا تو مجھے یاد ہے کہ کمرے میں بڑا حبس اور گرمی تھی۔ مجھے یہ گرمی اور حبس آج تک یاد ہے۔

پرانی یادوں کے سٹیج کا پردہ ایک بار پھر گرتا ہے۔ بادلوں میں دھیمی دھیمی بجلی چمکتی ہے پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے اس بار منظر گورنمنٹ کالج لاہور.... نہیں نہیں.... پنجاب یونیورسٹی کے

پائیں باغ کا بے میں چھوٹے سے پائیں باغ کی روش پر سے ہوتا ہوا اشفاق احمد کی طرف بڑھتا ہوں۔وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔کتاب اسکے ہاتھ میں ہے۔ سنہری دھوپ نکلی ہوئی ہے ہم دونوں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔اشفاق احمد کا سرخ وسپید چہرہ روغنی لگ رہا ہے۔وہ مسکرا رہا ہے۔اس کے دانت چھوٹے چھوٹے مگر ہموار اور سفید تھے۔میں نے اشفاق کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔''آؤ ٹولنٹن مارکیٹ چلتے ہیں مجھے پائپ کیلئے تمباکو خریدنا ہے۔

اس زمانے کے اشفاق احمد کی ایک اور تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے وہ بادامی رنگ کا گول گلے والا کرتا اور رنگین لاچا پہنے پاک ٹی ہاؤس میں دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا ہے۔قیوم نظر' شہرت بخاری اور دوسرے دوست بھی موجود ہیں چائے کا دور چل رہا ہے بڑی گرم جوشی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔اس روز اشفاق لاچا اور کرتا پہن کر پاک ٹی ہاؤس آ گیا تھا اور ماجھے کا خوبرو جٹ لگ رہا تھا مجھے اس کا اس طرح کے لباس میں وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔

اشفاق احمد کے ساتھ میں نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے اس کی یادیں دھندلی نہیں پڑیں۔ہاں کہیں کہیں سے سلسلہ ضرور ٹوٹ گیا اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے لیکن جہاں جہاں وہ مجھے یاد ہے اس یاد کی پوری جزئیات کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔یہ ایک طرح ٹیکیو ہیں میری یادوں کے جن کی تصویریں بنا کر میں اس کتاب میں چسپاں کرتا جا رہا ہوں۔

ہماری محفلیں زیادہ تر پاک ٹی ہاؤس میں لگتی تھیں۔لیکن کبھی کبھی ہم کافی ہاؤس چلے جاتے تھے میں اس لئے کافی ہاؤس جاتا کہ وہاں فضا میں رچی ہوئی کافی کی خوشبو مجھے جنوب مشرقی ایشیاء کی فضاؤں میں لے جاتی تھی۔خاص طور پر مجھے رنگون' کولمبو اور مدراس کے ریستوران یاد آ جاتے جہاں اپنی آوارہ گردی کے دوران بیٹھ کر میں کافی پیا کرتا تھا۔لاہور کے کافی ہاؤس میں زیادہ تر صحافی' وکلاء اور سیاستدان ہی بیٹھتے۔شاعروں میں ریاض قادر اور ناصر کاظمی وہاں اکثر دیکھے جاتے تھے۔مولانا چراغ حسن حسرت' ریاض قادر' سردار صادق اور بٹ کافی ہاؤس کی محفلوں میں سب سے نمایاں نظر آتے تھے۔یہ لوگ جس میز پر بیٹھتے ہوتے وہاں دوسرے لوگ

بھی کرسیاں کھینچ کر آ بیٹھتے اور ان لوگوں کی سیاسی ادبی اور دلچسپ باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور ا
ن کی لطیفہ بازیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ میں اور اشفاق احمد دیوار کے ساتھ والی ٹیبل پر جا کر
بیٹھ جاتے۔ ہاتھ ملا کر لوگوں سے علیک سلیک کرتے اور کافی پیتے ہوئے اپنی باتیں کرنے لگتے
سبھی ادیب اور شاعر ہمارے دوست تھے۔ سب ہم سے ملتے تھے مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے
زیادہ قریب آ گئے تھے۔ ہماری بڑی پکی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اشفاق
بڑا اچھا لگتا۔ اس کی باتیں بڑی اچھی لگتیں۔ وہ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا تو میں ہاتھ اشارے
سے اسے اپنے پاس بلا لیتا اور ہم خوب گھل مل کر مزے مزے کی باتیں کرتے۔ اسی زمانے میں
اشفاق احمد نے اپنا مشہور افسانہ بلکہ طویل مختصر افسانہ ''گڈریا'' لکھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ
گئی۔ میں نے افسانہ پڑھا تو مجھے اشفاق سے اور زیادہ محبت ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نامور
افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بمبئی سے لاہور واپس آ چکے تھے اور مسعود پرویز کے ساتھ مل کر ایک پنجابی
فلم بنا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اشفاق احمد کا افسانہ ''گڈریا'' پڑھ لیا تھا اور اس سے بڑے متاثر
تھے۔ منٹو صاحب لکشمی مینشنز کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک بار میں اور اشفاق احمد ان سے
ملنے گئے تو منٹو صاحب نے اشفاق کے افسانے کی تعریف کی۔ اشفاق جھینپ گیا۔ چہرہ سرخ ہو
گیا اور بولا۔

''وہ منٹو صاحب بس.....''

منٹو صاحب نے عقابی آنکھوں سے اشفاق کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بس کیا اچھا افسانہ
لکھا ہے تم نے اور کہا پھر منٹو صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا ''تم بکواسی ہو۔ کھمبے کو دیکھ کر
رومانٹک ہو جاتے ہو میں نے محسوس کر لیا تھا کہ منٹو صاحب اشفاق احمد کو زیادہ پسند کرتے ہیں اس
سے میرے دل میں رشک یا حسد کا جذبہ بالکل پیدا نہیں ہوا تھا۔

اشفاق احمد نے بانو قدسیہ سے شادی کر لی تھی اور وہ سمن آباد کے مکان میں رہنے لگا تھا۔
اب وہ نمبر ایک مزنگ روڈ والے مکان سے چلا گیا تھا اس کا سمن آباد والا پہلا مکان چھوٹی مارکیٹ
میں سنٹرل ماڈل سکول کے سامنے تھا اس مکان پر بڑے شیشے لگے تھے اور اسے شیشوں والا کوارٹر
کہتے تھے یہاں اشفاق نے تھوڑا عرصہ ہی قیام کیا اور دوسرے مکان میں چلا گیا۔ دوسرا مکان بھی

سمن آباد میں گراؤنڈ کے سامنے تھا اب یہ گراؤنڈ ایک باقاعدہ باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس زمانے میں ابھی یہاں مٹی اڑتی تھی۔

میں پیدل چلتا سخت گرمی میں اشفاق احمد کے گھر پہنچ گیا یہ این ٹائپ کا مکان تھا۔ میں چھوٹی سی گلی میں سے گزر کر مکان کے عقبی صحن میں گیا۔ بانو قدسیہ باورچی خانے چوکی پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں میں اور اشفاق احمد دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بانو قدسیہ آئس کریم لے آئی مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس وقت مجھے آئس کریم کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں سہ پہر تک اشفاق کے ساتھ رہا۔ ہم دونوں مکان کے برآمدے میں بیٹھے خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ اب وہ باتیں مجھے یاد نہیں ہیں ہمارے سامنے سڑک پر ٹاہلی کے درخت گرمیوں کی گرم سہ پہر میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔

اب اشفاق احمد نے ایک سائیکل خرید لی تھی۔ وہ سائیکل پر سمن آباد سے پاک ٹی ہاؤس اور ریڈیو سٹیشن آتا۔ ہم دونوں ریڈیو پاکستان لاہور کے ساتھ بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک ہو چکے تھے۔ میرا مکان ان دنوں فلیمنگ روڈ پر تھا۔ میں لاہور ہوٹل والی سڑک پر سے ہوتا ہوا قلعہ گجر سنگھ سے نکل کر ایبٹ روڈ پر آتا تو یہاں کبھی کبھی اشفاق سے ملاقات ہو جاتی وہ سائیکل پر سوار ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا ہوتا۔

پرانے ریڈیو سٹیشن کا زمانہ ہماری یاری دوستی کا بڑا خوبصورت اور بتدائی زمانہ تھا۔ لباس کے بارے میں وہ لاپرواہ رہا ہے مگر اس کی شخصیت میں بڑی کشش ہوا کرتی تھی۔ بدکاٹھ بھی مضبوط تھا۔ خوبصورت بھی تھا بطور افسانہ نگار مشہور بھی ہو گیا ہوا تھا مگر لڑکیوں سے محبت کرنے کے معاملے میں وہ بہت پیچھے تھا۔ میں دیکھا کرتا کہ عورتوں کے ساتھ خاص طور پر لڑکیوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا۔ یعنی وہی ہدایتیں اور تلقین....! ایک لحاظ سے یہ اچھی بات بھی تھی۔ کم از کم وہ عشق کی بک بک سے بچ گیا تھا۔

اشفاق احمد نے ریڈیو پر "تلقین شاہ" کی سیریز شروع کر دی۔ ایک تو وہ بڑا اچھا ادیب تھا۔ دوسرے اس نے تلقین شاہ کا کردار خود ادا کیا۔ یہ سونے پر سہاگہ والی بات ہو گئی پہلے براڈ کاسٹ پر ہی تلقین شاہ مشہور ہو گیا۔ اشفاق نے اپنے پنجابی لہجے میں روہتک حصار کا لہجہ شامل کر لیا تھا۔ جو لوگوں میں بڑا مقبول ہو گیا۔ ایک بار اشفاق نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اسے روہتک حصار کا لہجہ سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ ہوشیار پور کے گرد و نواح کا لہجہ ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اشفاق احمد جب اس لہجے میں ریڈیو پر بولتے تو تلقین شاہ کا کردار زندہ ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔

زندگی کے درخت پر تصوف کا پھل عام طور پر عمر کے آخری حصے میں جا کر لگتا ہے۔

نوجوانی کے زمانے میں مجھے نہیں یاد کہ اشفاق احمد نے مجھ سے تصوف کے موضوع پر کوئی بات کی ہو۔ یہ زمانہ ہنسنے کھیلنے اور موج اڑانے کا ہوتا ہے البتہ درمیانی عمر میں آ کر اشفاق نے تصوف کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ یہ باتیں کسی ایسے سالک کی نہیں تھیں جو حقیقت کی تلاش میں نکلا ہو بلکہ ایسے پیر باصفا کی باتیں ہوتی تھیں جس نے حقائق و معارف کی منزل پالی ہو۔ نفسیاتی طور پر وہ کسی ایسے پیر کامل کی تلاش میں تھا جو اسے اپنا مرید بنانے کی بجائے پیر کامل بنا دے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

وہ صوفی تھا
اپنی چادر خود بنتا تھا

اعجاز رضوی

وہ صوفی تھا
اپنی چادر خود بنتا تھا
اس کی چادر رنگ برنگے پھولوں سے ملتی جلتی تھی
وہ صوفی تھا
ہر دم اپنی چادر کے پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا
وہ صوفی تھا
وہ صوفی تھا
اس کی چادر کے پھولوں سے لاکھوں گلشن مہک رہے ہیں
اس کے حرف پرندے بن کر دنیا کے ہر اک گوشے میں
چہک رہے ہیں
پر وہ یوں خاموش ہوا ہے
جیسے اک افسانہ کہہ کر
اک افسانہ سوچ رہا ہو۔

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور
10 ستمبر 2004ء

ایک ''دنیادار درویش'' کی رحلت

صدیق اظہر
(کافی ہاؤس)

جنہوں نے کلیات منیر کے دیباچہ کا مطالعہ نہیں کیا' میری ان سے درخواست ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں فرانز فینن کی عالمی شہرت یافتہ ''افتادگان خاک'' کے دیباچہ کے بعد جسے ژاں پال سارتر نے تحریر کیا تھا اور جس کے بارے میں یورپ کے انسان دوست ادیبوں نے کہا تھا کہ یہ آزادی کیلئے جد جہد کرنے والے افریشائی نوجوانوں کی بائبل ہے یہ شاید واحد کتاب ہے جس کا دیباچہ کتاب کے مندرجات کی روح سے آشنا ہے۔ منیر نیازی کی شاعری کا سارا تحیر اور اسکی دلکشی کا سحر اس دیباچہ میں موجود ہے۔

میں جناب اشفاق احمد خان کا مداح نہیں رہا۔ مجھے ہمیشہ ان کے نظریات سے اختلافات رہا۔ 1977ء کے مارشل لاء کے بعد خصوصاً لیکن سارے اختلاف کے باوجود میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی ان کا احترام کیا اور اس کا سبب ان کی درویشانہ طبیعت تھی۔ وہ سلوک کے آدمی تھے کبھی کسی کے ساتھ نفرت کا تعلق انہوں نے قائم نہ کیا۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں فیض صاحب کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ اس روز اشفاق صاحب نے فیض صاحب کے حوالے سے جو مضمون پڑھا وہ ان تمام لوگوں کیلئے باعث حیرت تھا جو اشفاق صاحب کو نہیں جانتے غالباً دو برس قبل وہ حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس کی صدارت کیلئے انہوں نے گہرے رنگ کا کرتہ (غالباً سیاہ رنگ تھا) سفید شلوار اور دیسی جوتی پہنی ہوئی تھی۔ بہت بھلے لگ رہے تھے اجلاس شروع ہوا عامر فراز سیکرٹری تھے۔ انہوں نے کارروائی پڑھی اور کارروائی پر ہی بحث کا آغاز ہو گیا۔ بعض احباب شاید کچھ اور چاہتے تھے۔ اشفاق صاحب نے ایک زبردست منتظم کا روپ دھار لیا۔ نظم اور مضمون پر خوب بحث چلی اور اس بحث کے دوران سرکاری میڈیا استعمال کرنے والے ادیبوں کے حوالے سے بھی جملہ بازی ہوئی یہاں اشفاق صاحب کا رویہ پھر صوفیانہ ہوا۔ ایک

محبت آمیز گفتگو کی کہ آدمی اس میں بہتا چلا جائے۔

اشفاق صاحب نے جو لکھا وہ بھی اضافی رو کی مد و جزر میں بہہ کر لکھا۔ اشفاق صاحب اور آپا بانو قدسیہ کی جوڑی ادبی تاریخ کی ایک بے مثال جوڑی تھی۔ اگر اشفاق احمد کے گڈریا کے دھوم مچی تو آپا قدسیہ کے ''راجہ گدھ'' نے اردو ادب کو ایک لازوال ناول عطا کیا۔

دونوں کی زندگی میں صوفیانہ پن بھی ایک قدر مشترک تھی۔ جو آخر تک قائم رہی۔ اشفاق صاحب نے اپنے ہم عصر ادیبوں کی طرح گروپ بازی کبھی نہیں کی۔ اور نہ ہی اپنے گرد ''حلقہ اشفاقیہ'' قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ ترقی پسندوں اور روایت پسندوں میں یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے انہوں نے زندگی کو سیاسی جھمیلوں سے دور رکھا۔ لیکن قومی معاملات پر اپنی رائے پر وہ سختی سے قائم رہتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر انکی محبت کا اس وقت تجربہ ہوا جب آج سے تین برس قبل میں جراحت قلب کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

اشفاق صاحب کے ساتھ میرے تعلقات ایسے گہرے کبھی نہ تھے البتہ ان سے احترام کا تعلق بہت مضبوط تھا جس زمانے میں وہ تلقین شاہ کا کردار ریڈیو پاکستان پر ادا کرتے تھے۔ کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرحوم پروفیسر اشفاق علی خان، مرحوم فیض احمد فیض اور میجر اسحق محمد کے درمیان انتہائی ادب سے مجھے بھی بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ میں نے بہت جھجک جھجک کر بات کی۔ اشفاق صاحب نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ اس کے بعد ان سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی تو وہ بہت شفقت سے ملتے۔

میرے بائی پاس کی خبر ان تک پہنچی تو انہوں نے اپنے بھانجے P.I.C کے چیف ایگزیکٹو ڈاکٹر جواد ساجد خان سے کہا کہ یار اس غریب ''علامہ'' کا خیال رکھنا۔ آپریشن کے بعد ڈاکٹر جواد نے مجھے بتایا کہ اشفاق صاحب نے مجھے سفارش کی تھی اشفاق صاحب سے مجھے ملے ہوئے بہت عرصہ گزر گیا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے یاد رکھا۔ وہ دنیاوی معاملات اور تعلقات کو کبھی فراموش نہ کرتے تھے۔ اس لئے میں انہیں مثبت معنی میں دنیا دار درویش کہتا ہوں۔ وہ ہم سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔

روزنامہ پاکستان لاہور

10 ستمبر 2004ء

بڑا انسان، سچا مسلمان

علی اصغر عباس

(خواب زار)

آج کا کالم اس شخص کی تعزیت میں ہے جو تمام عمر مردہ دلوں اور خوابیدہ روحوں کو جگانے، جھنجوڑنے اور زندہ کرنے کے جتن کرتا رہا دم توڑتی معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا نوحہ خواں اشفاق احمد جسے سب داستان گو کا نام دیتے ہیں گزشتہ روز منگل کی شام "داستان سرائے" سے نکل کر عازم شہر خموشاں ہوا تو ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں پر لوگوں کا ایک ہجوم امڈ آیا ان میں شاعر بھی تھے فنکار بھی، جج بھی تھے، وکیل بھی، اپنے بھی تھے پرائے بھی، حکومت بھی تھی اور اپوزیشن بھی۔

ہر کوئی دل گرفتہ اور اداس تھا، سحر طراز اشفاق احمد جو محفلوں میں اپنی گفتگو کے جادو سے ہر کسی کو بت بنا دیتا تھا آج خاموش تھا سامعین کو اپنی دلپذیر اور دل نشیں باتوں کے حصار میں لے کر ہنسانے اور رلانے والا آج اپنی خاموشی سے سب کو رلائے دے رہا تھا لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے والا چاہنے والوں کے کندھوں پر سوار آنسوؤں کے جلو میں منزل دائمی کی طرف رواں دواں تھا۔

داستان سرائے میں آگ کا الاؤ سرد پڑ چکا تھا جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ میں دبی چنگاریاں غم کی آگ سلگا رہی تھیں۔ شام کے جھٹپٹے میں قبرستان میں آنے والا لوگوں کا ہجوم ایک ایسے شخص کو اس کی آخری آرام گاہ تک چھوڑنے آیا تھا جس کے پاس زندگی کرنے کا ہنر سب سے زیادہ تھا اس نے جس سلیقے اور ڈھب سے زندگی گزاری اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

وہ ایک صاحب طرز ادیب اور منفرد انداز کا براڈکاسٹر تھا بہترین انشائیہ پرداز اور اعلیٰ پائے کا قلم کار تھا اس کے ڈراموں کے مکالمے بہت سوں کے سروں پر سے گزر تے تو بہت سے دلوں میں اتر اتر جاتے تھے وہ روح کے گھاؤ اور بدن کے زخموں کو الفاظ کے مرہم سے درست کرنے کا فن جانتا تھا۔

کہانیاں اس کے الفاظ کے قالب میں ڈھلنے کیلئے بے قرار رہتی تھیں تو داستانیں اس کے پیرائیہ اظہار میں آنے کیلئے بے تاب' اسے ڈراموں کے کردار ڈھونڈنے کی ضرورت تھی نہ افسانوں کے پارٹ سوچنے کی صعوبت جھیلنا پڑتی تھی یہ سب اس کے ذہن رسا میں از خود آتے تھے وہ انہیں جب چاہتا' جہاں چاہتا اور جیسے چاہتا استعمال کرتا' لکھتا' بولتا یا الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا دیتا کوئی خیال ایسا نہیں تھا جو اس کے گرفت سے اس کی مرضی کے خلاف آزاد ہو گیا ہو۔ وہ صوفی تھا درویش تھا مبلغ تھا' مصلح تھا' مگر ان سب سے بڑھ کر وہ زندگی سے بھرپور' درمند مخلص وفا شعار اور محبت کرنے والا انسان تھا اور اس سے بھی بڑھ کر ایک پکا اور سچا مسلمان۔

وہ کہا کرتا تھا اچھا انسان ہونا تو ابتداء ہے' مسلمان ہونے تک پہنچنا بڑی لمبی دوڑ ہے۔ پتہ نہیں آدمی وہاں تک پہنچ پاتا بھی ہے یا نہیں جب تک آدمی اچھا مسلمان نہ ہو اس وقت تک اس کے سارے رویئے ساری سوچیں بے سمت رہتی ہیں۔ اچھا مسلمان ہونا ہی انسانیت کی معراج ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ تقریباً پندرہ یا شاید اس سے کچھ اوپر سال گزرے میرے دوست ڈاکٹر افتخار فیصل نے بہاولپور سے آنے والی اپنی ایک ادب شناس عزیزہ سے مجھے ملوایا اور کہا کہ انہیں بڑے ادیبوں شاعروں سے ملنے کا بہت شوق ہے آپ ان کی مدد کریں میں موصوفہ کو لے کر کشاں کشاں جناب احمد ندیم قاسمی کے دفتر فنون واقع میکلوڈ روڈ گیا ندیم صاحب نہایت شفیق' مہربان اور محبت کرنیوالی شخصیت ہیں مگر نہ جانے کیوں اس دن ان کے رویے میں کچھ سرد مہری سی تھی جسے اس خاتون نے بری طرح محسوس کیا اور کچھ دلبرداشتہ سی ہو کر مجھے باہر چلنے کا اشارہ دیا میں اجازت لے کر باہر آیا اور اسے ندیم صاحب کے رویے کے جواز پیش کرنا شروع کر دیے۔ مگر وہ مطمئن نہ ہوئی اسی اثناء میں ہم اردو سائنس بورڈ کی عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے اطلاع بھجوائی تو اشفاق صاحب نے ہمیں فوراً اندر بلا لیا میں نے خاتون کا تعارف کرانے کے بعد اس کی آمد کی غرض وغائت بیان کی اور ساتھ ہی ندیم صاحب کے ساتھ سرسری ملاقات کا تذکرہ کر دیا۔ اشفاق صاحب نے نہایت شفقت کے ساتھ خاتون کی طرف دیکھا اور اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے جناب احمد ندیم قاسمی کے حق میں جو بولنا شروع کیا تو مسلسل ایک گھنٹے تک

ان کی تعریفوں کے پل باندھتے رہے انہوں نے جناب قاسمی کی شخصیت' محبت اور ایثار کے اتنے قصے سنائے کہ جب ہم ان سے رخصت ہوتے تو وہ خاتون سب کچھ بھول کر دونوں حضرات کی گرویدہ ہو چکی تھی۔

اپنے ایک ہم عصر ادیب کی عدم موجودگی میں اس کی ایک مداح کی دلآزاری کا سدباب کر کے اس کے ملال کو خوشی میں تبدیل کرنا ایک بڑے انسان اور سچے مسلمان کا ہی خاصہ تھا اور اشفاق احمد بلاشبہ عمدہ اور نفیس انسان تھے آج ہم میں کون ہے جو اس روایت کو آگے بڑھائے۔

اشفاق احمد کے جنازے میں شرکت کے بعد واپسی پر الحمد پبلیکیشنز کے صفدر حسین نے ڈاکٹر انور سدید کو علامہ اقبال ٹاؤن میں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑتے ہوئی سوال کیا کہ سر! ڈاکٹر سلیم آختر بھی تو آپ کے نزدیک رہتے ہیں ان سے ملاقات تو رہتی ہوگی۔ تو ڈاکٹر انور سدید نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا وہ میرے نزدیک تو رہتے ہیں میرے قریب نہیں آتے۔ میں نے بار ہا ان سے ملاقات کی کوشش کی مگر وہ مجھے یہ اعزاز دینا نہیں چاہتے ہو مجھے خیال آیا کہ جنازے کی جلوس میں شامل جناب احمد ندیم قاسمی کے چہیتے خالد احمد نے جس ادب اور احترام کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کو سلام کیا تھا اس کا مظاہرہ شاید ڈاکٹر سلیم آختر نہیں دیکھ سکے وگرنہ وہ ضرور اشفاق احمد کے جسد خاکی کی برکت سے وقوع پذیر ہونیوالی اس اہم ملاقات سے ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرتے کہ یقیناً ہم سب کو آخر ایک دن یہ دنیا چھوڑ جانا ہے چند روز عارضی زندگی میں اپنے ہم پیشہ اور ہم عصر لوگوں کے ساتھ چشمک کا فائدہ؟ بقول اشفاق احمد ہمیں اللہ تعالیٰ سے ایک دوسرے کیلئے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق طلب کرنی چاہیے، واللہ تو ہر شب آسمان سے دنیا پر آ کر آواز لگاتا ہے کہ کوئی بھلائی کا طلب گار جسے میں بھلائی عطا کروں ہے کوئی خیر کا طلب گار جس کی جھولی خیر سے بھر دوں' کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ کوئی ہے؟

روزنامہ پاکستان لاہور

10 ستمبر 2004ء

داستان سرائے کا داستان گو بھی رخصت ہوا

حمید اختر

(پرسش احوال)

تیس بتیس برس قبل کرشن چندر کی رحلت پر میں نے اپنے مضمون کا آغاز کیا اس فقرے سے کیا تھا کہ "آج اردو افسانے کی سب سے مدھر آواز خاموش ہوگئی ہے" اشفاق احمد کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے بعد میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ برصغیر میں داستان گوئی کی روایات کا آخری امین ہم سے بچھڑ کر اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے۔

اشفاق احمد بلاشبہ ایک طوطئی شریں مقال تھا۔ تحریر ہو یا تقریر، وہ لفظوں کی جادوگری پر قادر نظر آتا تھا، اس نے بہت خوبصورت افسانے لکھے، ڈرامہ نگاری میں نام پیدا کیا، اداکاری (تلقین شاہ) کے جوہر دکھائے اور ہر شعبے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے، مگر اس کے اندر کا داستان گو ہمیشہ اس پر غالب رہا، داستان گوئی اس کے خون میں شامل تھی، اس لئے جب اس نے ایک ادبی پرچہ نکالا تو اس کا نام "داستان گو" رکھا اور جب گھر بنایا تو اس کے باہر "داستان سرائے" کی تختی نصب کی۔ اسی داستان سرائے (فانی) سے 7 ستمبر کو آخرت کا سفر کیا جن لوگوں کو اس کی محفلوں میں بیٹھنے اس کی باتیں سننے اور اس سے مکالمہ کرنے کا کبھی موقعہ ملا ہے وہ ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ داستان سرائی میں اس کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا، وہ معمولی سے معمولی واقعہ میں اپنے حسن بیان سے چار چاند لگا دیتا تھا۔ یہی حسن اسکی تحریروں میں بڑی فراوانی سے موجود تھا۔ جذئیات نگاری میں اس کے کامل فن کا مقابلہ اس کے ہم عصروں میں کوئی دوسرا نہ کر سکتا تھا۔ قلم سے اس کا جو تعلق زمانہ طالب علمی سے قائم ہوا وہ زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا ،سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا شمار اردو کے گنتی کے ان چند ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے جنہوں نے قلم کی کمائی ہی کو ذریعہ معاش بنایا اور اس کے سہارے پوری زندگی گزار دی، مجھے یاد ہے ایک ملاقات میں اس نے مجھے بتایا کہ یہ ریفریجیٹر جو سامنے رکھا ہے یہ ٹی وی کے فلاں سیریل کی آمدنی

سے خریدا، ائرکنڈیشنز خریدنے کا ذریعہ فلاں سیریل بنا۔ اس طرح اس نے اپنے گھر کے کمروں، چھتوں اور غسل خانوں کی تعمیر کے سلسلے میں اپنی مختلف ٹی وی سیریلز کے نام گنوائے۔

اشفاق احمد کے الیکٹرونک میڈیا سے رجوع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی افسانہ نویسی کا دور جلدی ہی ختم ہوگیا۔ یہ المیہ اس عہد کے بہت سے لکھنے والوں کا ہے کہ انہیں روٹی روزگار کیلئے خالص ادبی میدان چھوڑ کر دوسرے شعبوں کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر اشفاق نے کم مدت میں بھی جتنے افسانے لکھے وہ اس کا نام اردو افسانے کی تاریخ میں زندہ رکھنے کیلئے کافی ہیں۔ ڈرامہ نگاری میں بھی اس نے بہت کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اس کے ٹی وی ڈرامے بھی یقیناً اس کی ادبی صلاحیتوں کا اظہار ہیں۔ ان سے اکثر کتابی شکل میں چھپ کر نقادان ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آخری دنوں میں 'زاویئے' کے عنوان سے اس نے ٹی وی سامعین سے گفتگو کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس سے بھی اس کی سحر بیانی پھوٹی پڑتی تھی۔

انسانی زندگی، میل جول، معاشرتی ذمہ داریوں اور مذہبی امور کے بارے میں اس کے اپنے علیحدہ نظریات تھے جن پر وہ سختی سے قائم رہا لیکن اس نے اپنے نظریات کسی پر ٹھونسنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہمارا اس سے نظریاتی اختلاف ہمیشہ رہا لیکن اس کی وجہ سے انسانی سطح پر دوستی اور محبت کے رشتوں میں کبھی کوئی رخنہ نہیں پڑا۔ وہ محبت کا آدمی تھا اور مسرتوں اور محبتوں کی تقسیم میں امتیاز روا رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ ہم نے اپنے کالموں میں کئی دفعہ 'بابوں' سے اس کے شغف کا مذاق اڑایا مگر اس نے کبھی برا نہیں مانا بلکہ ہمیشہ فون کر کے کالم کی تعریف کی وہ اگر تصوف کی راہ پر گامزن تھا یا صوفیا کی پیروی کرنا ضروری سمجھتا تھا تو اس کا ثبوت بھی اپنے عمل سے مہیا کرتا تھا۔ تین چار برس سے ہمارے اور اس کے درمیان مذاق کا ایک دلچسپ سلسلہ جاری تھا' ہم نے کچھ عرصہ قبل تک اپنے طور پر یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ عمر میں ہم سے بڑا ہے۔ اسکے حالات زندگی پر اے حمید کی کتاب میں اس کی تاریخ پیدائش دیکھی تو پتہ چلا وہ ہم سے ایک سال چھوٹا ہے۔ ہم نے اسے فون کیا اور کہا "بھائی یہ ریش مبارک بڑھا اور بزرگوں کی طرح دانائی کی باتیں کر کے تم نے ہمیں دھوکہ دیا ہم یہی سمجھتے رہے کہ تم ہمارے بزرگ ہو' اب معلوم ہوا تم ہمارے برخوردار ہو" اس

کے بعد ہم نے اسے اپنی کتاب بھجوائی تو اس پر یہ فقرہ لکھا ''عزیزی اشفاق احمد کیلئے' محبت اور خلوص کے ساتھ'' اس نے فقرے کا بہت مزہ لیا اور فون کر کے داد دی۔ افسوس کہ اب ہمارے پرانے دوستوں میں سے چند ایک ہی باقی رہ گئے ہیں۔ گزشتہ چار پانچ سال میں صفدر میر' قتیل شفائی' احمد راہی اور عبداللہ ملک جیسے قریبی دوست ساتھ چھوڑ' اب اشفاق بھی چلے گئے۔ ہر دوست کے بچھڑنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے جسم و جان کا کچھ حصہ ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا ہے۔ سیف مرحوم نے اس صورتحال کا نقشہ کتنی خوبصورتی سے کھینچا ہے۔

قدم قدم پہ جدائی کا داغ دے کے مجھے
اتر گئے مرے کتنے ہی یار قبروں میں

نہ صحن باغ میں سبزہ، نہ پھول شاخوں پر
جلی ہے پھر مری ساری بہار قبروں میں

کدھر گئے وہ مرے اشک پونچھنے والے
کہاں چھپے ہیں مرے غم گسار قبروں میں

مرا وجود کسی اک مقام پر ہو گا
ملے گی روح مگر بے شمار قبروں میں

یہ دوستوں کو رہے یاد میری موت کے بعد
کہ سیف دفن ہوا تھا ہزار قبروں میں

ڈیلی ''ایکسپریس'' لاہور
10 ستمبر 2004ء

وہ کہ اک شخص تھا شاداب بہاروں جیسا

ڈاکٹر شفیق الرحمن

(آج اور کل)

جناب اشفاق احمد وفات پا گئے۔ شہر لاہور آسانیاں بانٹنے والے ایک نابغہ روزگار سے محروم ہو گیا۔ نور بصیرت اور روشن ضمیر رکھنے والے اس درویش کے دم قدم سے شہر کا جلال و جمال اور وقار قائم تھا۔ وہ اسلامی فہم و تدبر اور مشرقی اقدار و ثقافت کی زندہ تصویر تھے۔ ان کی باتیں دلوں کے تار ہلا دینے اور ذہنوں کو جگا دینے والی تھیں۔ ان کے چھتر تلے علم و ادب اور فن و ثقافت پناہ لئے ہوئے تھے۔

جناب اشفاق احمد کے جانے سے دنیا ویران نہیں ہوگئی' لیکن عقل حیران ضرور ہے کہ شہر لاہور کیسی کیسی گراں مایہ ہستیوں کو اپنی فضاؤں میں سمیٹے رہا ہے۔ کیسے کیسے بلند پایہ لوگوں کے فیضان نظر سے یہاں کے ذہن روشن اور دل بیتاب ہوتے رہے ہیں۔ اشفاق صاحب کا افسانہ و ڈرامہ' نثر یے اور تقاریر بھلا کون بھول سکتا ہے؟ ان کا آسانیاں بانٹنے اور اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر کرنے کا سبق ذہنوں سے آخر کس طرح محو ہو سکتا ہے؟ دنیا بھر کے فلسفوں' علم و ادب سے روشنی پانے اور تصوف میں ڈوب جانے والے اشفاق صاحب زندگی کے اسرار و رموز سے بہت سادہ اور دل نشین انداز میں لوگوں کو آگاہ کرتے رہے۔ ان کا وجود اہل فکر و نظر کے لئے صبح کاذب کی سی آسودگی لئے تھا۔ ان کے افکار فہم و شعور کی پھوار' ان کا لہجہ انگور کے رس کی طرح شیریں اور ان کا اسلوب پھول کی پنکھڑی پر ٹھہری ہوئی شبنم کی طرح فرحت انگیز تھا۔

جناب اشفاق احمد کے ادب اور فن پر بہت کچھ اظہار خیال ہوگا' بہت کچھ لکھا جائے گا' لیکن اگر ہم ان کی ایک ہی قومی خدمت کو لے لیں تو ان کا وزن اپنے معاصر سے کہیں زیادہ نظر آتا ہے۔ ان کا ریڈیو فیچر تلقین شاہ' جس میں انہوں نے خود تلقین شاہ کا کردار (آواز کی صورت میں) ادا کیا' بالخصوص ستمبر 1965ء کی جنگ کے دوران اس فیچر نے قوم کے اذہان و قلوب کی جس طرح

ترجمانی کی اور اسے جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی، قومی سطح پر اس سے بڑھ کر شاید ہی کسی دوسرے ریڈیو پروگرام کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

1966ء کے دوران میں اسلامیہ کالج فیصل آباد (اس وقت لائل پور) کے میگزین کا ایڈیٹر اور بزم ادب کا صدر تھا۔ بزم ادب کے تحت ہم نے جناب وزیر آغا، شورعلیگ اور ایسی ہی کچھ شخصیات کے ساتھ شام منانے کا اہتمام کیا۔ جناب اشفاق احمد کی بے پناہ مقبولیت کے پیش نظر انہیں بھی مدعو کرنے کی امنگ دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اپنے اساتذہ اور پرنسپل صاحب کی وساطت سے انہیں دعوت نامہ بھجوایا۔ یہ معلوم کر کے ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ ہماری دعوت قبول کر لی گئی ہے اور جناب اشفاق احمد ہماری تقریب میں ''میں اور میرا فن'' کے موضوع پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ یہ بات ہمارے لئے اور بھی زیادہ انبساط کا باعث تھی کہ ''تلقین شاہ'' میں ہدایت اللہ بننے والے نذیر الحسینی بھی ان کے ہمراہ ہوں گے۔ میں ان دنوں لائل پور کے روزنامہ ''عوام'' میں طلبہ کا صفحہ بھی مرتب کیا کرتا تھا اور کالم لکھتا تھا۔ اس اخبار کی اشاعت ایک دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اس میں تین سطر کی چھوٹی سی خبر دے دی: ''تلقین شاہ لائل پور میں آ گئے''۔

ہم نے کالج کے مین ہال میں تقریب کا اہتمام کیا تھا، جس میں لگ بھگ دو ہزار افراد کے بیٹھنے کا اہتمام تھا۔ ہم ابھی لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا انتظام ہی کر رہے تھے۔ طلبہ بھی نہیں پہنچے تھے، لیکن دیئے گئے وقت سے ایک گھنٹہ قبل ہی شہر کے لوگوں نے آ کر ہال کی تمام کرسیوں پر قبضہ کر لیا۔ مہمان خصوصی وقت مقررہ پر کالج پہنچ گئے۔ ان کے ہمراہ نذیر الحسینی بھی تھے، لیکن اس وقت تک دس ہزار سے زیادہ افراد ہال کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ ہر کوئی تلقین شاہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے چین تھا، جب کہ ہزاروں کی تعداد میں نئے لوگوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگوں نے دھکم پیل میں ہال کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ اس صورت کے پیش نظر پرنسپل صاحب نے مجھ سے کہا میں سٹیج سنبھالوں اور اعلان کروں کہ تلقین شاہ نہیں، بلکہ افسانہ نویس اشفاق احمد ہماری تقریب میں تشریف لا رہے ہیں۔ میں ایسا اعلان کرنے سے کترا رہا تھا، لیکن کالج انتظامیہ کے اصرار پر

بالآخر میں نے مائک پر آ کر کہا: ''حضرات! ہمیں افسوس ہے کہ جناب تلقین شاہ اس تقریب میں تشریف نہیں لارہے''۔ ایک دم حاضرین کی طرف سے نعرہ بلند ہوا: ''جھوٹ جھوٹ'' میں پھر عرض کیا: ''حضرات گرامی! ہمیں افسوس ہے کہ بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہماری آج کی تقریب کے مہمان خصوصی ممتاز افسانہ نگار جناب اشفاق احمد ہیں...... جواب میں پھر...... جھوٹ جھوٹ...... کا شور بلند ہوا۔

یہ دیکھ کر ہم نے فوری فیصلہ کیا اور دس منٹ کے اندر اندر کالج کے وسیع و عریض ہاکی گراؤنڈ میں انتظام کر کے مہمان خصوصی کو کھلے میدان میں لے آئے۔ اب تک اشفاق صاحب کی جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب لوگوں کی تعداد بیس ہزار سے زائد ہو چکی تھی۔ اشفاق صاحب نے نہایت پر اثر مضمون پڑھا۔ فضا تالیوں سے گونجتی رہی۔ جونہی انہوں نے مضمون ختم کیا' لوگ ان سے ہاتھ ملانے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر اس نے اشفاق صاحب سے ہاتھ نہ ملایا تو شائد اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ بہت سے لوگوں نے اشفاق احمد زندہ باد! تلقین شاہ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے اشفاق صاحب کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ انہوں نے لاہور روانگی کے لئے ریلوے سٹیشن پہنچنا تھا۔ پر جوش لوگوں نے ایک بہت بڑے جلوس کی صورت میں نعرے لگاتے ہوئے انہیں ریلوے سٹیشن تک پہنچایا۔ بازاروں میں لوگ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ جو انہیں دیکھنے میں کامیاب ہو جاتے' ان میں سے اکثر کے خوشی سے آنسو نکل آتے۔

یہ منظر قومی محسنوں سے اہل وطن کی محبت و عقیدت کے اظہار کا ناقابل فراموش منظر تھا۔ میں 1967ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے لئے لاہور آ گیا اور خود کو بے حد خوش قسمت پایا کہ یہاں اشفاق صاحب کے علاوہ بہت سے دوسرے مشاہیر کو بھی ملنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اشفاق صاحب سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ بے حد نرم خو اور مہربان طبیعت کے مالک ثابت ہوئے۔ انہوں نے کسی سلسلے میں اختلاف بھی کیا تو نہایت عمدہ انداز میں۔ مجیب الرحمٰن شامی صاحب کی محفلوں میں تو ان سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ بھلا میں ان

سے اس ملاقات کو کیسے بھلا سکتا ہوں۔ اب ایک تقریب کے اختتام پر شاہی صاحب نے حکم دیا کہ ہم اشفاق صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے جائیں گے اور واپسی پر میں شاہی کو ان کے گھر پہنچاؤں گا۔

میرے پاس شاہی صاحب ہی سے رعایتی قیمت پر خریدی ہوئی سوئفٹ گاڑی تھی (جواب بھی ہے)' وہ گاڑی کلمہ چوک سے کچھ پہلے اچانک بند ہوگئی۔ سخت پریشانی کا عالم تھا کہ ایسے بزرگوں کی موجودگی میں اس بدبخت کو اسی وقت بگڑنا تھا...... اشفاق صاحب نے گاڑی سے اتر کر آستینیں چڑھائیں اور کہا ''میں اور شاہی دھکا لگاتے ہیں' آپ سٹارٹ کریں''۔ میں نے ایسی گستاخی کا ارتکاب سے انکار کیا تو انہوں نے زبردستی مجھے گاڑی میں بٹھا کر دھکا لگانا شروع کر دیا۔ شاہی صاحب کی سانس تو پھولنا ہی تھی لیکن اشفاق صاحب کا ہانپتے ہانپتے کہیں برا حال تھا۔ میں نے ایک بار پھر عرض کیا کہ یہ مناسب نہیں' لیکن اکھڑی ہوئی سانسیں بحال کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ شاہی صاحب سے مل کر دھکا لگایا اور گاڑی کو کلمہ چوک تک لے گئے۔ یہاں فٹ پاتھ پر زرد یونیفارم میں پگڑیاں سروں پر باندھے ڈھول بجانے والے لوگوں کی ایک ٹیم موجود تھی۔ ان کے پاس پہنچ کر اشفاق صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا: ''او بھائی ثقافت والو! ذرا ہماری مدد کرو''۔ ان ثقافت والوں نے ایک زوردار دھکے سے گاڑی سٹارٹ کرا دی اور میں سوچتا رہ گیا کہ ثقافت اور اشفاق صاحب کا کتنا گہرا تعلق ہے۔ شاید اتنا ہی' جتنا سادگی و انکساری اور عظمت و فضیلت کا!

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

ایک بے مثال جوڑی

آسناتھ کنول

(خواب اور انقلاب)

دنیا میں ہزاروں لاکھوں نامور اور بے مثال عورتیں گزری ہیں۔ بہت سی عورتوں کو آئرن لیڈی کا خطاب بھی ملا۔ مضبوط دل و دماغ کے حوالے سے بھی عورتوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک بڑا نام' ایک مضبوط دل و دماغ اور اعلیٰ خیالات کی مالک خاتون رائٹر بانو قدسیہ کا ہے۔ ایک ایسا نام' ایک ایسی شخصیت جس کا احترام کرنے کو دل کرتا ہے۔ ایک ایسی عورت جس نے کام اور نام کے حوالے سے خود کو ایک مثال بنا دیا۔ ایک مثال ہے کہ ہر عظیم مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ ہر عظیم عورت کے پیچھے بھی ایک عظیم مرد کا ہاتھ ہوتا ہے...... ایک اکیلا ہوتا ہے اور دو گیارہ۔ سو بانو قدسیہ اور اشفاق احمد دو نہیں' ایک اور ایک مل کر گیارہ بنتے تھے...... وہ ایسے ہی لوگ تھے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

بانو قدسیہ کو لوگ محبت سے اور احتراماً بانو آپا کہتے ہیں اور ان کا یہ لقب اتنا مشہور ہے ایک دن اشفاق احمد صاحب نے اپنی گفتگو میں اس بات کا اظہار کیا' بلکہ اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی بانو قدسیہ کو بانو آپا کہنا چاہتا ہوں۔ محبت' مروت' خلوص اور نیک نیتی سے گندھی ہوئی عورت' جس کا شوہر بھی اس کے لئے دل میں اپنائیت اور حسرت رکھتا تھا۔ محبت کا تو خیر بہت اونچا مقام ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر جب اشفاق احمد کی وفات کی اندوہناک خبر سنائی گئی' اس محبوب شخص کے لئے آنسو دل پر گرنے لگے' زیادہ اس محترم خاتون کے لئے جو گیارہ سے ایک پر آ گئی' اکیلی ہو گئی' لیکن بانو آپا نہیں جانتیں کہ وہ اکیلی نہیں ہیں۔ ہزاروں دل ان کے دل کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ دنیا تو مسافر خانہ ہے' کوئی پہلے' کوئی بعد میں...... انسان جگہ خالی کرتے ہیں' نئے آنے والوں کے لئے...... سو نظام زندگی ایسے ہی قائم و دائم ہے۔

بانو آپا تعزیت کے لئے آنے والے لوگوں سے بڑی ہمت' حوصلے اور وقار سے ملتی رہیں۔ اتنی مضبوط عورت بہت کم دیکھنے کو ملے گی' جس میں اپنے محبوب شوہر سے بچھڑنے کے بعد بلند حوصلہ اور ہمت دیکھنے کو ملے۔ وہ ایک قابل رشک خاتون ہیں۔ ناول نگار' افسانہ نگار اور

ادیب...... ان کے ناول "راجہ گدھ" نے بڑے بڑے ناقدوں کے منہ بند کر دیئے۔ وہ لوگ جو یہی کہتے رہتے ہیں کہ عورت اچھی لکھاری نہیں ہو سکتی اور اپنا سارا زور بیان اسی بات پر صرف کر دیتے ہیں وہ بھی انگشت بدنداں تھے کہ اب کیا کہیں' عورت کو کس کس میدان میں شکست دیں؟..... کہ وہ جب کسی عزم کو لے کر چل پڑتی ہے تو اس کے راستے کی دیواریں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔

سماجی رویوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا ایک جہاد ہے اور بانو قدسیہ' اشفاق احمد کے ساتھ برابر اس جہاد میں شریک رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے ایک ٹرینڈ سیٹ کیا۔ وہ سارے پاکستان کی عورتوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ایک ایسی عورت' جس پر عورتیں ہی نہیں مرد بھی رشک کرتے ہیں۔

خانگی زندگی کے حوالے سے آج کے پر آشوب دور اور نامساعد حالات میں' جہاں لوگ چند سال بطور میاں بیوی گزار لیں تو حیرت ہوتی ہے' وہاں اس بے مثال جوڑے نے ازدواجی زندگی کے 50 خوبصورت سال ایک ساتھ بتائے اور ایک مثال قائم کی۔ دانشوری صرف مرد ہی کی میراث نہیں' عورتیں بھی دانشور ہیں' اس کی مثال بانو آپا ہیں' جن کے شوہر نے انہیں تسلیم کیا تو سارے جہاں نے انہیں تسلیم کیا۔ جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں اور یہ جوڑی واقعی آسمانوں بنی۔ کاش! سارے مرد اشفاق احمد جیسے اور ساری عورتیں بانو قدسیہ جیسی ہوں...... رحمت کے فرشتوں جیسے لوگ' جن کی اس ملک اور قوم کو بہت ضرورت ہے۔

دنیا کی تمام نامور اور عظیم عورتوں کو خود کو تسلیم کروانے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' لیکن اس میں ہمت ہارنے کی بات نہیں' بلکہ اور زیادہ قوت ارادی سے حوصلہ پکڑنے کی بات ہے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ماریہ سعید کا انٹرویو سن رہی تھی۔ وہ خاتون جو پاکستان میں پہلی مرتبہ ایئر ٹریفک کنٹرولر بنی ہیں۔ ایک باہمت اور پر اعتماد عورت بیک وقت کتنے ہی جنگی ایئر کرافٹ' بلکہ ہر طرح کے ایئر کرافٹ کو وہ خاتون ہینڈل کرتی ہے تو مردوں کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ عورتیں کیا کیا کچھ کر رہی ہیں۔ ایک سوال کے جواب انہوں نے کہا کہ ایک ایسی فیلڈ جہاں صرف مردوں کی اجارہ داری تھی' اب اس میں عورتیں بھی اپنی صلاحیت منوا رہی ہیں۔ جہاں تک عزت کروانے کی بات ہے تو انسان خود اپنی عزت کرتا ہے اور اگر سمجھتا ہو تو اس کے اندر کا احساس اسے دوسروں سے بھی عزت کروانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ انسان کے اپنے ہاتھ میں تو بہت کچھ ہے' لیکن اسے مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا رہے اور یہ چیز خواتین پر امپوز کی جاتی ہے۔

خواتین کی اس کمزوری کے حوالے سے بھی بانو آپا نے عورتوں میں ایک جرات اور حوصلے کو پروان چڑھایا۔ پردے اور سادگی کے حوالے سے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ کبھی کسی نے ان کے سر پر دوپٹہ ڈھلکتے نہیں دیکھا۔ ان کا انداز گفتگو نہایت سادہ' پر منفرد اور پر معنی۔ الفاظ کا چناؤ اور ٹھہراؤ' ان کی شخصیت میں بہت کچھ ہے جو سیکھا جاسکتا ہے۔ عورتوں کے لئے ایک۔ مثالی عورت' ایک مثالی بیوی' جس کے شوہر کو کبھی اس سے کوئی شکایت نہیں رہی۔ دھیمے سروں میں بولتی اور دل و نگاہ کو شفاف کرتی ہوئی عورت' جو خود ایک کہانی ہے۔

مادر ملت فاطمہ جناح ...... دشمن بھی جن کا نام احترام سے لیتے تھے' عورتوں میں عظمت کی ایک مثال رہیں۔ وہ ماں نہیں بنیں' مگر لوگ انہیں مادر ملت کہتے ہیں۔ بہت سی عورتوں نے پاکستان بننے کے دوران اپنی ہمت' جرات اور شجاعت کی داستانیں رقم کیں۔ ادا جعفری شاعری میں ایک عظیم نام' ناول نگاری میں قرۃ العین حیدر' خدیجہ مستور' حاجرہ مسرور' عصمت چغتائی' کشور ناہید' پروین شاکر اور بہت سی خواتین رائٹرز ہیں جنہوں نے اپنے حرف و صوت سے ایک دنیا کو حیران کئے رکھا ہے' مگر ان میں سب سے معتبر نام بانو قدسیہ کا ہے۔ اس نام کے بغیر پاکستانی ادب کی تاریخ ہمیشہ سونی رہے گی۔ میری دعا ہے' بلکہ تمام دنیا کی عورتوں کی یہ دعا ہے کہ خدا بانو آپ کو پہاڑ جیسا یہ غم اپنے سینے پر اٹھانے کا حوصلہ عطا فرمائے اور جیسا کہ اشفاق احمد صاحب اپنے پروگرام کے آخر میں کہا کرتے تھے کہ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے' ہم سب کی یہ دعا ہے کہ خدا آپ سب کو آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بانو آپا! ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں' خدا آپ کی حفاظت کرے۔ آمین!

روزنامہ "پاکستان" لاہور
10 ستمبر 2004ء

داستان سرائے کا مسافر۔ اشفاق احمد

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

(بے نیازیاں)

اشفاق احمد اتنا بڑا آدمی تھا کہ بڑائی ان پر ناز کرتی ہے۔ وہ اپنے اندر نکھرتا ہوا آدمی اپنے باہر بکھرتا ہوا آدمی تھا۔ اور جو بکھرتا نہیں وہ نکھرتا نہیں۔ ہمیں کوئی الجھن ہوتی' کوئی مشکل ہوتی تو ہم ان کے پاس چلے جاتے تھے۔ اب ہماری بےقراریوں کو سرشاریوں میں کون ڈھالے گا۔ فریب کو دلفریبی کون بنائے گا۔ وہ اجڑے ہوئے دلوں کو کھلکھلانے والی اور پرانے زخموں پر نیا درد جگانے والی گفتگو کے آخر میں ہر دفعہ کہتا تھا کہ خدا آپ کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق عطا کرے۔ ہم جو مشکلوں کے عادی بھی نہیں ہوتے۔ اب ہمارا کیا بنے گا۔

مشرق و مغرب کی دانش پر اس کی نظر تھی مگر مشرقی علوم کا ایک ہجوم اس کے لہو میں ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ وہ صاحب علم آدمی تھا مگر علم کو واشگاف انداز میں بیان کرنا اس کا شیوہ نہ تھا۔ وہ بات کرتا تو لگتا تھا کہ جیسے علم ایک راز ہے اور راز دو آدمیوں کے پاس نہیں ہوتا۔ بس یہ کہ وہ دوستوں کو اور دوسروں کو ہمراز کر لیتا تھا۔ اس نے دوستوں اور دوسروں میں فرق مٹا دیا تھا۔

اس کے بہت بڑے جنازے میں ہزاروں لوگ تھے کہ میں جنہیں نہیں جانتا تھا۔ ان سے بھی کبھی اشفاق صاحب بھی نہ ملے ہوں گے۔ انوکھا والہانہ پن تھا۔ عجب وابستگی تھی جو وارفتگی بنتی چلی جاتی تھی۔ یہاں میں نے مجید منہاس کو دیکھا تو مجھے عشق رسولؐ کی خوشبو میں لحہ بہ لحہ کھلنے والے حفیظ تائب یاد آئے۔ انہوں نے اپنی خاموشی سے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کیا تھا۔ اشفاق احمد نے سرگوشی جیسی سرسراتی اور جگمگاتی ہوء باتوں سے لوگوں کے دلوں میں بھولی ہوئی راتوں کو جگا دیا تھا۔ اشفاق احمد کا آخری دیدار میں نے نہ کیا۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو ان کا زیر لب مسکراتا چہرہ نظر آتا ہے۔ یہ چہرہ میری آنکھوں میں پھر گیا ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کی طرف سے اشفاق احمد کے لئے ایک پروگرام ہو رہا تھا۔ طارق احمد اشفاق احمد صاحب کے لئے گہری اداسی میں

ڈوبے ہوئے تصور کو تصویر کر رہے تھے۔ لاٹھی ٹیکتے اشرف عظیم دکھی دل کے ساتھ خود نگرانی کر رہے تھے پروگرام میں ایک صوفی منش اداکار فردوس جمال نے کیا راز بھری بات بھرائی ہوئی آواز میں کی کہ اشک آموز کیفیتیں رقص کرنے لگیں۔ ایسے موقعوں پر رقص اور وجد میں فرق مٹ جاتا ہے۔ وجد بھی تو وجود کی ایک ادا ہے۔ ہم نے اشفاق صاحب کی زبان سے ادا ہونے والی باتوں کو رقص کرتے وجد کرتے دھمال ڈالتے دیکھا۔ یہ دھمال سننے والے کے اندر بھی پڑتا تھا۔ میرے اندر دھمال پڑنے لگ گیا۔ فردوس جمال کہہ رہا تھا۔ اشفاق صاحب سے ملاقاتیں کم کم ہوتی تھیں۔ اب زیادہ ہوں گی فردوس سے گزارش ہے وہ ان ملاقاتوں میں مجھے شامل کرنا نہ بھولنا۔ بلھے شاہ کا یہ شعر یوں بھی ہے۔

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی حور

بلھے شاہ تو عشق مستی کی میں ارائیں بن گیا مگر ایک پٹھان اشفاق احمد خان تو شاہ بن گیا۔ بادشاہ بن گیا۔ تلقین شاہ یہ بادشاہوں میں پھر کب پیدا ہوگا جس نے ایک بار اشفاق احمد کو سنا۔ پھر نجانے اسے اپنے دل میں کیا کیا سنائی دیتا رہا۔

نے تاج و تخت میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

وہ اپنے ازل سے آشنا تھا اپنے ابد سے آشنا تھا۔ وہ ازلی وابدی آدمی پھر ہماری اجڑی پچھڑی دنیا میں نہ آئے گا۔ وہ گلی کوچوں میں پڑے خاک نشیں عام آدمیوں کی بات کرتا تھا اور بات کو اتنی بلندیوں پر لے جاتا کہ سننے والا ہر آدمی اپنے آپ کو سر بلند محسوس کرنے لگتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ سکول ماسٹر میرا آئیڈیل ہے۔ دور افتادہ جگہوں پر ڈیرا لگانے والے بابے اس کے ہمسفر تھے۔ وہ نور والے بابے کی باتیں کرتا تھا اور اس کی آنکھیں نظر کے آنے والے نور سے بھیگ جاتی تھیں۔ اس نے مذہب کی بات تخلیقی انداز میں کی۔ دین و دانش کو رلا یا ملا۔ دانش اور لوگ دانش کو

ملایا جلایا۔ وہ صوفی تھا۔ ملامتی صوفی۔ اس نے اپنے خراب حال زمانے میں خیر کی خیرات تقسیم کی۔ لوگوں کی عزت نفس کی حفاظت کرنے پر زور دیا۔ وہ صاحب کمال صاحب خیال اور صاحب حال آدمی تھا۔ وہ ہمارے حال کی خبر رکھتا تھا۔ وہ باخبر ہونے سے زیادہ اہل خبر میں سے ہونے والوں کی بات کرتا تھا۔ نجانے کتنے سمندر اس کے اندر موجزن تھے۔ وہ تلاطم ترنم، تبسم اور تکلم کی طاقت کو توازن دینے والوں میں سے تھا۔ اس کے لفظوں میں سانولی مٹی کی خوشبو تھی۔ اجلے بدن کی خوشبو بھی یکجائی سے یکتائی کا راز پانے والا خود ایک راز کی طرح ہو گیا۔ کون اس راز سے پردہ اٹھائے گا

جنازے میں کسی ٹی وی چینل والے نے مجید نظامی سے پوچھا تو انہوں نے کہا وہ بڑا آدمی تھا اور مختلف آدمی تھا۔ سچی بڑائی کے لئے اس سے بڑی بات کیا ہے۔ دینی باتوں کو روحانی پیرائے میں بیان کرنا صرف اس آدمی کا کام تھا۔ جس کے لئے سجاد میر نے کہا کہ وہ اپنی مٹی کی روح تھا جس میں میری صدیوں کی بصیرتیں چھپی ہوئی ہیں۔ سجاد میر کو معلوم ہے کہ روحانیت اور رومانیت کو اپنے اندر یکجان کرنے والے کا کیا مقام ہے۔ ذوالفقار چیمہ اور شہباز شیخ اولڈ راوین ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک بڑا ریفرنس کرنے والے ہیں۔ دیر سے ملنے والے محبوب خط کی طرح ملتے تھے۔ کس سادگی اور آسودگی، شگفتگی اور کشادگی سے بولتا تھا جیسے ہواؤں میں بنے ہوئے دروازے کھولتا تھا لوگ بے تحاشا بے ساختہ اور بے قابو ہو کر ہنستے تھے اور نم دیدہ ہو جاتے تھے۔ انہیں دیر میں پتہ چلتا تھا اور پھر وہ دور تک سوچتے جاتے تھے کہ یہ ہمارے ساتھ کیا واردات ہوئی ہے۔

نواز شریف بڑے بڑے عہدوں پر گیا مگر اشفاق صاحب کے گھر بھی گیا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ شہر کی گلیوں میں گھومنے والا وزیر اعظم بن گیا۔ اسے تو تقریر کرنا بھی نہیں آتی۔ اشفاق صاحب نے کہا کہ اب لیڈر وہی ہوگا جسے تقریر کرنا نہ آئے مگر اسے کام کرنا آئے۔ وہ نواز شریف کو پسند کرتے تھے۔ نواز شریف کے ایک محبت کرنے والے میاں محمود اسی خوشبو کے تعاقب میں اشفاق صاحب کو دیکھنے گئے۔ وہ مجھے روتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ان کے مرنے پر لگتا ہے کہ موت زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ میں نے سیدھے سادھے شخص کی طرف دیکھا جسے علم و ادب سے

کوئی واسطہ نہیں مگر جیسے اس نے موت وحیات کی سرحد پر کھڑے کسی زندہ تر آدمی سے ملاقات کی۔ موت زندہ آدمی کو زندہ تر کر دیتی ہے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیئے گا
کرتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

ٹی وی پر دیپی باتوں میں روحانی راز تلاش کرنے والے اشفاق احمد کے پروگرام کا نام ''الف'' ہے۔ ''تینوں اک الف درکار'' مگر لوگوں کو روحانیات کی ''الف ب'' اچھی لگتی تھی جو اشفاق صاحب کی باتوں میں ابجد اور امجد کا فرق مٹا دیتی تھی بانو آپا سے کس طرح تعزیت کریں کہ تعزیت اور تعظیم ایک ہو جائیں۔ وہ عظیم خاتون جو اندر سے قدیم ہے اور باہر سے جدید ہے۔ اس نے جدید و قدیم کے سنگھم پر بہت وقت اشفاق احمد کے ساتھ گزارا ہے۔ وزیراعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی کی طرف سے سیکرٹری اطلاعات اور ڈی جی پی آر اشفاق احمد کے گھر پانچ لاکھ روپے لے کر گئے تو انہوں نے انکار کر دیا جیسے اقرار کیا جاتا ہے۔ زیادہ زور دیا تو کہنے لگے۔ تمہاری بانو آپا نہیں مانتی۔ بانو آپا کے پاس گئے تو وہ کہنے لگیں۔ اشفاق صاحب نہیں مانتے۔ میرے بھائی پروفیسر محمد اکبر خان نیازی نے میانوالی سے فون پر میرے ساتھ تعزیت کی تو مجھے پھر سے خیال آیا کہ میں تو اشفاق احمد خان کا رشتہ دار ہوں۔ رابطہ رشتے سے بڑا ہوتا ہے اور موت کے بعد رابطہ بڑھ جاتا ہے۔

اشفاق احمد کے لئے کئی کالم لکھے جا سکتے ہیں مگر اس نشاط کو کہیں ختم نہیں ہونا ہے۔ نشاط ملال کے اعلیٰ ترین مقام کا نام ہے۔ مجھے ابھی روحانی دانشور اور اسلام آباد میں دردمندوں کی پناہ گاہ نسیم انور بیگ کا فون آیا ہے۔ انہوں نے بانو آپ کو لکھا گیا تعزیتی مکتوب مجھے پڑھ کر سنایا۔ آپ بھی سن لیں۔

''بانو آپا۔ بندھے ہاتھوں سے تعزیتی سلام قبول کریں۔ شہاب صاحب کی یاد سے اشفاق صاحب کی یاد تک ایک سفر ہے جو ختم ہی نہیں ہوتا۔ شہاب صاحب حکم ربی پر لبیک کہتے ہوئے چلے گئے پھر انشا جی' مفتی جی اور اب اشفاق بھائی' اتنے ستارے بجھ گئے کہ یوں لگتا جیسے آسمان میں اندھیرا سا ہو گیا ہو۔ پھر صدقہ اک ذرہ خاک پائے رسولؐ کی خیرات ہوئی۔ بخشش

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اشفاق احمد خان سے میری ملاقات چند مہینے پیشتر سردار سوز کی دو کتابوں کی تقریب رونمائی میں ہوئی، سردار سوز امریکا سے آتے ہیں تو احباب کو کسی نہ کسی بہانے جمع کر لیتے ہیں۔ پرل کانٹی نینٹل میں وہ شام بھی ایسی تھی جس میں نمایاں شخصیت اشفاق احمد خان کی تھی اور ان کی اہلیہ بانو قدسیہ عقب پر موجود تھی دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ اور بلا کا اعتماد یہ ظاہر کرتا تھا کہ زندگی کے سفر میں ایک جیسے تجربوں سے گزر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ آئینہ یک دگر تھے دونوں کے ہاں ایک جیسے الفاظ کا ہونا، احباب کیلئے ایک جیسی گنجائش مروت اور محبت کا ہونا قابل رشک زندگی گزارنے کی روشن دلیل تھی۔ بانو قدسیہ کا اشفاق احمد خان کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے وقت یہ کہنا کہ ایک نہ ایک دن تو ساتھ چھوٹنا ہی تھا، اشفاق بہترین ہمسفر تھے خدا کا شکر ہے کہ ان کے ساتھ پچاس سال بسر کئے۔ ان چند لفظوں میں بہت بڑی بات کہی گئی ہے جہاں اس جملے میں بنیادی حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ایک دن جدائی کا ذائقہ کسی ایک کو چکھنا ہے وہاں اپنے شوہر کو بہترین ہمسفر قرار دینا کامیاب زندگی بسر کرنے کا اعلان بھی ہے۔ یہ خوش نصیبی ہے کہ پچاس سال کی رفاقت میں کہیں کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا حوصلہ اسی شخص میں ہو سکتا ہے جو زندگی میں رجائیت کے فلسفے کا علمبردار ہو اور غم کی حقیقت کو سمجھتا ہو کہ۔

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

غم خوشی کی تانے بانوں سے
زندگی کا لبادہ • بنایا گیا

اس لئے اشفاق احمد خان کے انتقال پر ہم سب غمزدہ ہیں۔ وہ ایسے انسان تھے جو بہت کچھ کہنا چاہتے تھے، انہوں نے بہت کچھ لکھا اور کیا، لیکن اتنا لکھنے اور کہنے کے باوجود کچھ باتیں ان کہی رہ گئیں۔ وہ بحیثیت پاکستانی ادیب جتنا لکھ سکے اسے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ان کی موت پر رسمی باتیں ہوئیں مگر مجھ سمیت کتنے لوگ ہیں جو دعوے کر سکیں کہ انہوں نے بالاستعاب وہ سب کچھ پڑھا جو اشفاق احمد نے لکھا یقیناً ان کا گھرانہ بہت پڑھا لکھا ان کا گھر داستاں سرائے ان کی گفتگو تہ در تہ اور ان کا زاویہ نظر معنویت سے بھرپور پایا، مگر وہ جو کچھ کہتے رہے ہم نے سنا اور لطف

اٹھایا۔ ہم سے وہ جس نوع کا تقاضا رکھتے تھے وہ پورا نہ ہو سکا۔ انہیں وسعت نظری، کشادہ دلی اور عالی ظرفی عزیز تھی مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہی تین خصوصیات ناپید ہیں۔ تنگ نظر، گھٹن اور کم ظرفی جیسی منفی صفات در آئیں، ہم نے اپنے قومی تشخص کو اپنے کردار سے مسخ کر دیا۔ اشفاق احمد خان پرانی قدروں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ مہمان نوازی، بزرگوں اور احترام فنون لطیفہ سے شغف اور کہانی کے حوالے سے بدی اور نیکی کی آویزش میں خیر کی خوبصورتی کو نمایاں کرنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ وہ عہد شباب میں شاعری اور موسیقی سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں شاعری انسانی پاکیزہ جذبوں کا اظہار اور موسیقی نہ صرف روح کی غذا تھی بلکہ آداب زندگی سکھانے، محفل میں زانوئے ادب تہ کرنے اور فنکار میں چھپی صلاحیتوں کو ذوق سماعت کی بدولت نکھارنے کا وسیلہ قرار پائی۔ مگر آج کل اچھل کود، جسمانی خطوط کی نمائش محض شاعری بلکہ تک بندی کی بھونڈی صورت نظر آتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ محفل موسیقی میں بھی لوگ باوضو بیٹھتے یا کم از کم شائستگی اور قرینے کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ اشفاق احمد خان نے جس محفل موسیقی کی طرح ڈالی اسے دوبارہ زندہ کیا جانا ضروری ہے۔ ارباب نشر و اشاعت کا فرض ہے کہ اشفاق احمد خان کے ساتھ اپنی عقیدت کے پیش نظر ان کے پروگراموں کو دوبارہ ٹیلی کاسٹ کریں اور جو بنیاد انہوں نے فراہم کی اسی پر عظیم عمارت اٹھائی جائے۔ پاپ گانے سن کر ذوق سماعت پست ہو چکا ہے غزل کی گائیگی اور اس سے وابستہ فنکاروں کی حق تلفی کا ازالہ بھی ہونا چاہیے اور اشفاق احمد خان کی نظامت کی یاد تازہ کرنے کیلئے فرشی نشست کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بہت پہلے امریکا کے توسیع پسندانہ عزائم کو بھانپ لیا تھا اور ان کے میڈیا سے متعلق دو لفظوں میں یہ کہہ کر ہمیں چونکا دیا تھا کہ وہ ہمارے گھروں کے روشن دانوں سے جھانکنا شروع کر چکے ہیں۔ اسی طرح ان کا ایک کردار بابا ایسا فرد باشعور ہے جو باصفا بھی ہے اور جس کے پاس ہر درد کی دوا ہے در اصل وہ بابا ان کا ہمزاد ہے جو قدم قدم پر ان پر انکشاف کے مراحل طے کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وہ ایک استعارہ ہے جسے آدمی کی وجدانی قوت کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشفاق احمد خان پاکستان کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے تھے انہوں نے اردو افسانے اور ڈرامے کو پاکستانی سماج کے ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تخلیقات میں اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی نمائندگی کی ان کے ہاں فکر کی گہرائی اور خیال کی پہنائی کے ساتھ واقعاتی حقائق نے افسانوں اور ڈراموں کو عوام میں مقبول بنا دیا، وہ اپنے کرداروں سے کام لینے کا ہنر آزمانے میں کامیاب رہے یہی وجہ ہے کہ جن

اداکاروں کو یہ کردار سونپے گئے وہ اشفاق احمد خان کی تحریروں کی بدولت زندگی پا گئے' خصوصاً فردوس جمال نے نہایت عمدہ اداکاری سے ان کے کرداروں کو زندہ جاوید بنا دیا، اشفاق احمد خان کے بعض ڈرامے ایسے بھی پڑھنے اور دیکھنے کو ملے جو علامتی ہونے کے باعث قدرے تفہیم کے معیار سے بلند ہیں ایسے ڈراموں کی گرفت مستقبل کے قاری پر مضبوط ہوگی میں جتنی پذیرائی ملی اس سے کہیں زیادہ مستقبل میں ملی' غالب فہمی کا زمانہ وہ نہیں تھا جو غالب کو میسر آیا بلکہ وہ یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ۔

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

کچھ یہی کیفیت اشفاق احمد خان کے بعض افسانوں کہانیوں اور باتوں میں نظر آتی ہے کہ وہ ایسی گفتگو بھی کرتے رہے جو ان کے سامعین سمجھ نہ پائے ہم یقیناً ایک صوفی صاحب طرز افسانہ نگار عظیم دانشور اور ٹمیل ناک کے ماہر سے محروم ہو گئے۔ وہ داستان طراز تھے ہماری دھرتی کے سپوت' وفا پرور' انسان دوست اور دردمند انسان تھے انہیں موت کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی، ان کا شعلہ حیات بجھنے کے قریب تھا لیکن ان کی حوصلہ مندی کا یہ واقعہ بھی یادگار رہے گا کہ اپنے بیٹے انیق احمد کو یہ کہہ کر امریکا بھجوا دیا میں بالکل تندرست ہوں۔ وہ اپنے والد کی خرابی صحت کی خبر سن کر پاکستان آئے ہوئے تھے اور گزشتہ کئی دنوں سے یہاں لاہور میں ہی مقیم تھے۔ تو وہ 6 ستمبر کو یہاں سے روانہ ہوئے اور اگلے روز صبح 9 بجے اشفاق احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی تمام زندگی داستان گوئی میں گزری' ان کی مثال محفل میں قصہ سنانے والے اس شخص کی سی تھی جو ماہر نفسیات بھی تھا اور لوگوں کو ہمہ تن متوجہ رکھنے کا ہنر جانتا تھا، وہ کانی کے تار و پود بنتا رہا جہاں تک کہ وہ قصہ در قصہ بیان کرنے اور مرکزی کہانی کو آگے بڑھانے لگا' ابھی سننے والے جاگ رہے تھے کہانی ناتمام رہ گئی' کردار خاموش ہو گئے' بابا کسی ویرانے میں تنہا سر جھکائے بیٹھا رہا' رات ڈھلنے لگی ستارہ سحری جھلملانے لگا' خواب بے تعبیر ہو گئے ''زاویہ'' خاک بسر اور گڈریا'' اپنی بھیڑوں سے بے خبر ہو گیا۔ وہ کہانی جسے بڑے شوق سے سنا جا رہا تھا ادھوری رہ گئی اور اس کہانی کار اشفاق احمد خان کی آنکھ مند گئی۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
داستان سو گئے داستان کہتے کہتے

داستان سرائے کے پردوں پر ایک تصور آویزاں ہے جو ہم سے پوچھ رہی ہے مجھے بھول تو نہ جاؤ گے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

11 ستمبر 2004ء

داستان سرائے کا داستان گو!

ڈاکٹر سلیم اختر

7 ستمبر کو بے حد گرم اور شدید حبس والی سہ پہر کو ماڈل ٹاؤن ڈی بلاک کی بھاپ چھوڑتی گھاس پر اہل لاہور کا اژدحام...... ادیب' شاعر' صحافی' میڈیا سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کے ساتھ نوجوانوں اور طلبہ کی بھی کثیر تعداد۔ ہم سب اس ہستی کو آخری سفر پر محبت' عقیدت' اور احترام کے جذبات کے ساتھ الوداع کہنے آئے تھے جو ویسے تو اشفاق احمد نام رکھتا تھا مگر دنیا اسے دانشور' صوفی' درویش' تلقین شاہ' خان صاحب اور بابا جی کے نام سے جانتی اور مانتی تھی۔ جنازہ دیکھا تو میں نے تاسف سے سوچا کہ موت نے کیسے خوش گفتار شخص کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

اشفاق احمد ان ادیبوں میں سے تھے جو خوش اسلوب نثر کے ساتھ خوش آہنگ لہجہ میں گفتگو اور تقریر بھی کر سکتے تھے۔ جن اصحاب نے ان سے گفتگو نہ کی یا ان کی تقریر نہ سنی وہ اشفاق احمد کی خوش بیانی اور خوش الحانی کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔

اشفاق احمد بنیادی طور پر مصلح تھے اسی لیے وہ پاکستانیوں کو عمل خیر کی تلقین کرتے رہتے تھے ان پاکستانیوں کو جن کے لیے عمل شر ہی عمل خیر ثابت ہوا کرتا ہے اشفاق احمد بنیادی طور پر بے حد مذہبی تھے مگر مذہب کو انہوں نے صوفیاء کی تعلیمات کے توسط سے حاصل کیا اسی لیے ملا کی پسندیدگی کے باوجود وہ خود نہ تو ملا بنے اور نہ ہی ملائیت پر مبنی بنیاد پرستی کو شعار زیست بنایا۔

اشفاق احمد کی شخصیت' خیالات' تصورات میں بظاہر تنوع نظر آتا' ایسا تنوع جس نے ڈراموں اور افسانوں کی صورت میں تخلیقی سطح پر اظہار پایا لیکن اس تمام تنوع کی فکری اساس تصور واحد پر استوار تھی۔ عمل صالح' عمل خیر' وہ معلم اخلاق تھے اور اسی لیے تلقین شاہ!

مگر تلقین کے لیے تلقین شاہ نے چوب خشک ملا کا خشونت اسلوب نہ اپنایا بلکہ اس مقصد

کے لیے انہوں نے لوک دانش کا سہارا لیا۔ اس لوک دانش کے مظہر ان کے معروف بابے تھے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اشفاق صاحب صاحب حال بزرگوں کی تلاش میں رہتے تھے اگر کسی پہنچے ہوئے شخص کے بارے میں علم ہوتا تو دور افتادہ علاقوں اور پسماندہ گاؤں تک اس سے ملنے کے لیے جانے میں کوتاہی نہ کرتے۔ مجھ سے ایک مرتبہ کہا۔

''سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے جہاں زیب بلاک میں زبردست شخص رہتا ہے۔''

میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بڑی دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

یادوں کی محفل میں بعض اوقات اس پر بحث ہوتی کہ کیا واقعی بابوں کا وجود ہے؟ بعض اسے تسلیم نہ کرتے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے قطرہ قطرہ جو علم حاصل کیا اس نے ان کی شخصیت میں رنگ آمیزی یوں کی کہ وہ خود ہی لوک دانش کی علامت بن گئے۔ یعنی بابا!

اشفاق احمد ہم پروفیسروں کو لتاڑتے کہ تم لوگ علم کے بجائے گریڈوں کے پیچھے دوڑتے ہو۔ وہ مروجہ تعلیم اور تعلیمی نصاب اور نظام کے سخت خلاف تھے کہ ان کے بموجب پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان تعلیم یافتہ افراد نے پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں ان کی یہ دلیل تھی کہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اسلام آباد میں آباد ہیں اور یہی لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر پاکستان کے مسائل اور عوارض کا باعث ہیں ''پڑھا لکھا'' ہونے کی وجہ سے میں ان کی یہ بات درست تسلیم نہ کرتا مگر میں ان سے بحث نہ کر سکتا کہ گفتار کے اس غازی کو بحث میں دلائل و براہین سے قائل کرنا ناممکن تھا۔

اشفاق احمد بھی ہماری ہی طرح ایم اے اُردو تھے۔ دو برس تک دیال سنگھ کالج میں اُردو کے لیکچرار بھی رہے مگر پھر انہیں اٹلی جانے کا موقع مل گیا جہاں اُردو کی تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید فلم سازی کی تکنیک سے واقفیت پیدا کی۔ گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی میں فلم میں واقعیت نگاری کی روش کے سلسلہ میں اٹلی سرفہرست تھا اور نیو ویو فلموں کا گرو وٹاروڈی سکا تھا جس کی ''بائیسکل تھیف'' اب کلاسک میں شمار ہوتی ہے اشفاق صاحب نے اس سے فلم سازی

کے گر سیکھے۔ ان ہی ایام میں ماضی کی مشہور ایکٹرس انگرڈ برگمین اور اس کے فلمساز شوہر سے بھی ان کے روابط رہے یوں جب اشفاق احمد واپس آئے تو وہ فلم سازی کے جدید تصورات سے آگاہ اور جدید تکنیک کے رمز شناس تھے اور اسی انداز پر انہوں نے خود بھی ایک فلم پروڈیوس کی لیکن یہ فلم کمرشل کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

فلم کے بعد اشفاق صاحب اور بانو آپا نے مل کر جدید انداز و اسلوب کا ایک ادبی جریدہ ''داستان گو'' کا اجراء کیا جس نے بہت جلد ادبی حلقوں میں اپنی ساکھ بنالی اس حد تک کہ اس میں شائع ہوتا ادیب کے لیے سٹیٹس سمبل قرار پایا۔ وہ معروف ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے بھی مدیر رہے اور ان دونوں پرچوں کی ترتیب میں ان کی شخصیت کی چھاپ واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

اشفاق + بانو...... اُردو ادب کی معروف اور بے حد پسندیدہ جوڑی تھی۔ ان کی داستان سرائے دراصل مہمان سرائے تھے' ہم دوست وقت بے وقت آتے' چائے پیتے گپ کرتے اور اشفاق صاحب کی باتوں سے رس حاصل کرتے۔ یہ دونوں منفرد قسم کی پارٹیاں دیا کرتے تھے' ایک مرتبہ طرح طرح کے ملا لوگ بلا کر ہم دس بارہ دوستوں کو ان سے ملایا یہ کہہ کر کہ ''ہم لوگ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن ذرا مکالمہ تو کر کے دیکھیں'' چنانچہ ہم لوگوں کی دلچسپ گفتگو رہی۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک میجک ماسٹر کو بلایا اور ہم سب نے ان کے پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ ان کی کوٹھی کے لان میں جادو کے کھیل تماشے دیکھے اور کوئی نصف صدی بعد میں نے اپنے اندر کے بچے کو خوشی سے تالیاں بجاتے پایا۔

اور پھر داستان سرائے کا بوڑھا دانش مند داستان گو خاموش ہو گیا!

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

10 ستمبر 2004ء

شاعری

اشفاق صاحب کے لیے

خالد عیاض

اور اک عہد گزر گیا
اور ایک خواب مر گیا
روایتوں کے قافلے کا راہ رو بچھڑ گیا
پھر اک اداس شام ہے
دکھوں کا اژدہام ہے
اور تلخیوں کا جام ہے
کہ مسکراہٹیں لیے
امید نو کا آفتاب
کرن کرن سمیٹ کر
اُفق کو پار کر گیا

روز نامہ ''جنگ'' لاہور
10 ستمبر 2004ء

روشنی کر جانے والا چراغ!

توفیق بٹ

(حسب توفیق)

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

ممتاز مفتی' قدرت اللہ شہاب' نصرت فتح علی خان' ملکہ ترنم نو جہاں' دلدار پرویز بھٹی۔

بھول جانے کے لیے ہمارے پاس کم لوگ تھے کہ آپ بھی رخصت ہو گئے!

کیا کیا خوبصورت تحریریں اور کالم لکھے جا رہے ہیں آپ کے لیے' کیسے کیسے شاندار الفاظ میں یاد کیا جا رہا ہے آپ کو' اشفاق احمد صاحب! آپ سے بہتر کون جانتا ہے ہمارے ہاں جب بھی کوئی بڑا آدمی مرتا ہے ہم اسے ایسے ہی شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں' ہم کہتے ہیں وہ زندہ رہے گا' ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔ مگر مردہ دلوں میں کوئی کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟

آپ کو اپنی تعریف اچھی نہیں لگتی تھی ناں! مجھے یاد ہے ایک بار میں اور میرے محترم بھائی ڈاکٹر عامر عزیز آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ اس موقع پر دو بار آپ کی شان میں کچھ کہنا چاہا اور دونوں بار آپ نے گفتگو کا رخ موڑ دیا مگر اب آپ مجھے' ساری دنیا کو کیسے روک سکیں گے۔ اب تو ہر کوئی آپ کو خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔ آپ کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے ہیں کس کس کو چپ کرائیں گے' کس کس کا ہاتھ پکڑیں گے آپ؟

مگر میرے پیارے اشفاق احمد صاحب! بس دو چار روز کے لیے اور ہمیں برداشت کر لیں' پھر حسب معمول' حسب روایت ہم آپ کو بھول جائیں گے بالکل اسی طرح جس طرح ممتاز مفتی کو بھول گئے' قدرت اللہ شہاب' نصرت فتح علی خان' ملکہ ترنم نور جہاں اور دلدار پرویز بھٹی کو بھول گئے۔

ہمیں یاد ہی نہیں کہ یہ لوگ بھی کبھی ہماری زندگی کا حصہ تھے اور جس زمین پر ہم رہتے ہیں وہ کھا گئی آسمان کیسے کیسے!

اور بانو آپا' آپ کو کیسے بھول سکتی ہیں؟ اس شاندار عورت نے تو اپنا اوڑھنا' بچھونا اپنی زندگی اپنا سب کچھ آپ کے لیے وقف کر دیا تھا وہ خود ایک بڑی عورت ہے مگر اپنے آپ کو صرف اور صرف آپ کے نام کی نسبت سے بڑا تصور کرتی رہی اس عورت نے آپ کے لیے شاندار ادب تخلیق کیا وہ کتاب کی طرح آپ کی حفاظت کرتی تھی یقین فرمایئے آپ جنت میں جائیں گے تو اس کی ایک وجہ ہماری پیاری بانو آپا بھی ہوگی آپ کتنے خوش قسمت تھے جو آپ کو بانو قدسیہ جیسی بیوی ملی جس نے ثابت کر دیا کہ واقعی ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ اور ساتھ ہوتا ہے! وہ ایک عورت ہی نہیں ایک ادارہ بھی ہے آپ اس ادارہ کے سربراہ رہے کتنا بڑا اعزاز ملا آپ کو۔ ہم اس اعزاز کی نسبت سے بھی آپ پر فخر کرتے ہیں! دلدار پرویز بھٹی کہا کرتا تھا بانو قدسیہ نہ ہوتی تو آپ بھی نہ ہوتے' آج آپ نہیں ہیں اللہ بانو قدسیہ کا سایہ ہمارے سروں پر سدا اسلامت رکھے!

میرے پیارے اشفاق احمد! آپ کو یاد ہوگا ہم سخن ساتھی کی کوئی تقریب آپ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی میرا سر بلند کرنے میں بہت بڑا کردار تھا آپ کا۔ میرے کالموں کے پہلے مجموعے میں میرے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا اس سے واقعی میں خود کو ایک بڑا کالم نگار تصور کرنے لگا تھا مگر یہ صرف اور صرف آپ کا بڑا پن تھا مجھے تو ٹھیک طرح سے پڑھنا بھی نہیں آتا لکھنا کہاں سے آئے گا؟ پھر میری کتاب کی تقریب رونمائی تھی میں نے آپ سے صدارت کی گزارش کی تو آپ نے فرمایا صدارت کے لیے بہت دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے اور میری صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی میں ویسے حاضر ہو جاؤں گا۔ یہ کام تم کسی اور سے کروالو پھر آپ نے اس ضمن میں خود جناب احمد ندیم قاسمی کا نام تجویز کیا مگر میری بدقسمتی کہ وہ بھی ان دنوں بہت بیمار تھے لہٰذا یہ ''کڑوا گھونٹ'' نوابزادہ نصر اللہ خان کو بھرنا پڑا چند روز کے بعد ایک تقریب میں آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے فرمایا اس روز طبیعت بہت خراب تھی اس لیے تمہاری بانو آپا نے مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیا۔ اب میں تمہاری دوسری کتاب کی تقریب رونمائی کی صدارت کروں گا!

میرے پیارے اشفاق صاحب! میں کتنا بدقسمت ہوں میری دوسری کتاب آئی نہیں اور آپ چلے گئے۔ بانو قدسیہ آپ کو بہت سی جگہوں پر جانے سے روک دیا کرتی تھیں اب انہوں نے آپ کو کیوں جانے دیا؟ اب وہ آپ کو کیوں نہیں روک سکیں' آپ کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ سکیں؟ ادبی و ثقافتی تقریبات کی صدارتوں کے لیے کتنا بڑا نام تھا ہمارے پاس اب ہم اپنی صدارتیں کس سے کروایا کریں گے؟ میں روایتی طور پر نہیں کہہ رہا یقین کیجئے' آپ کے جانے کے بعد جو خلاء پیدا ہوا ہے اسے کوئی بھی پر نہیں کر سکتا۔ مجھے تو کوئی شخص آپ کے قد کے برابر دکھائی نہیں دیتا ایسا کون

ہے جس کے پاس بات کرنے اور بات منوانے کا فن ہو جو داستان گو ہو کسی کا دل نہ دکھائے انسانوں کی عزت نفس کی بات کرے۔ لوگوں کے لیے ہمدردی دردمندی کے جذبات رکھتا ہو جسے چھوٹوں سے محبت اور بڑوں کا احترام ہو جس نے پیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ کی ہو جسے رشتوں کی پہچان ہو جو بچوں بڑوں میں یکساں مقبول ہو جس نے ادب کی بے پناہ خدمت کی ہو کسی کی ''بے ادبی'' کا کوئی تصور بھی جس کے ذہن میں موجود نہ ہو اتنا بڑا دانشور اتنا بڑا ادیب' اتنا بڑا شاعر' اتنا بڑا داستان گو اور اتنا بڑا انسان آپ کے بعد ہمیں تو کہیں دکھائی نہیں دیتا ہم آپ کو دیر تک دیکھنا چاہتے تھے آپ اتنی جلدی ہماری آنکھوں سے اوجھل کیوں ہو گئے؟ ہماری محبتوں ہماری عقیدتوں کا یہ صلہ دیا آپ نے؟

نہیں! نہیں اشفاق صاحب! آیئے آپ کی جدائی ناقابل برداشت ہے آپ کے بغیر بانو قدسیہ کا نام اُدھورا ہے ''داستان سرائے'' کے مسافر نے اپنی منزل ڈھونڈ لی اور نہ چاہنے والوں کو راستے میں چھوڑ گیا یہ کیسا انصاف ہے؟ آپ تو ایسے نہ تھے' آپ نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا تھا پھر رشتہ توڑ کر کیوں چلے گئے لوٹ آیئے اشفاق صاحب لوٹ آیئے میں اور امجد ثاقب آپ کی خدمت میں پھول پیش کرنا چاہتے تھے آپ ہمیں معاف کر دیں کہ ہمیں ذرا دیر ہو گئی' ہم یہ پھول آپ کی قبر پر چڑھانے کا حوصلہ نہیں رکھتے' آپ کی خواہش تھی کہ آپ کی قبر کچی ہو اور جہاں ایک ڈھولچی ڈھول بجاتا رہے آپ کی یہ تمام خواہشیں پوری ہوں گی' مگر ہم اشفاق احمد کے زمانے میں زندہ بلکہ زندہ تر رہنے کی خواہش رکھتے ہیں اس اشفاق احمد کے زمانے میں کہ جو ہوا کے ہوتے ہوئے روشنی کر جانے والا چراغ تھا ہماری خواہش کیسے پوری ہو گی کچھ تو سوچئے' میرے پیارے اشفاق احمد صاحب!

ہوا کے ہوتے ہوئے روشنی تو کر جائے
میری طرح سے کوئی زندگی تو کر جائے

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

11 ستمبر 2004ء

بانو قدسیہ کے اکلاپے کے نام

کشور ناہید

بانو آپا!

آج سے بیس برس پہلے جب مجھے اکلاپے کی تحریر ملی تھی تو آپ نے مجھے بیٹھ کر، کبھی واصف علی واصف کے ساتھ اور کبھی اشفاق احمد کے ساتھ سمجھایا تھا کہ مقدر کیا ہوتا ہے اور موت کتنی بڑی حقیقت ہے جس کو ہم مسلسل نہ ماننے پہ مصر ہیں۔

بانو آپا!

آپ کی اور میری سوچ میں بڑا فرق تھا۔ آپ تھیں اور ہمیشہ رہیں پتی ورتا' ایسی پتی ورتا کہ اُردو ادب میں کبھی اور کہیں ایسی مثال نہیں ملتی ہے۔ اشفاق احمد نے جو کہا وہ آپ کے لیے سچ ہی نہیں ایمان کا درجہ رکھتا تھا۔ میں کہتی تھی' مرد اور شوہر کو دوست بناؤ۔ آپ کہتی تھیں کہ دیوتا بناؤ۔ اس کا حکم بجا لاؤ۔ اس کو ماتا دو۔ جرابوں سے لے کر آستین کے بٹن تک بند کرو۔ تب اشفاق احمد جیسا بچہ قابو میں آتا ہے مگر بانو آپا! آپ نے عجب طرح سے اشفاق احمد پر اپنا عکس ڈالا تھا۔ صرف اشفاق صاحب پر نہیں قدرت اللہ شہاب' ابن انشاء اور ممتاز مفتی' سبھی آپ کی ریت میں بہتے پانی کی طرح' تلاش میں رہتے' آپ سر پر دوپٹہ اوڑھے' دھیمے لہجے میں گفتگو کرتیں۔ خان صاحب میری طرح اونچے لحن کے ساتھ یوں گفتگو کرتے جیسے قصہ چہار درویش سنا رہے ہوں۔

بانو آپا!

میں نے آپ کو سمن آباد والے چھوٹے سے گھر سے لے کر ''داستان گو'' کی چھوٹی چھوٹی پلیٹیں چمٹی سے لگا کر' سکھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب سے گورنمنٹ کالج میں 1948ء میں پہلی ایم اے اُردو کلاس میں آپ لوگوں کے پڑھنے اور بخاری صاحب کا زبردستی ایم اے اُردو گورنمنٹ کالج میں شروع کرانے کی ساری داستان سنی ہے اور آپ کی پہلی تحریروں کا احوال بھی سنا ہے۔

بانو آپا!

آپ کے ساتھ تو نجانے کیا طوفان ٹوٹا' میری تو 44 سال کی شفقت چلی گئی۔ اس زمانے میں میری کئی دفعہ خان صاحب سے لڑائی ہوئی۔ وہ جب غیر عوامی حکومتوں اور سیاسی منظر نامے پہ اپنی تحریروں کا دلاسہ دیتے جاتے تھے تو میں ناراض ہو جاتی تھی۔ وہ عجب شخص تھا۔ میری ناراضگی پہ برا ہی نہیں مانتے تھے۔ میں کہتی مجھے آپ کے جاہلوں سے پیار کرنے کے فلسفے سے سخت چڑ ہے۔ وہ کہتے میں بھی تمہارے اندر کی عورت کو جانتا ہوں۔ وہ اگر روایتی نہ ہوتی تو سارے زمانے کے سیاپے نہ کہتی۔

بانو آپا!

یاد ہے جب انہوں نے ایک ڈرامے میں عورت کو تھپڑ مارتے دکھایا تھا اور میں نے آپ کے گھر آ کر طوفان اٹھا دیا تھا کہ یہ حق آپ کو کس نے دیا کہ یوں عورتوں کو ذلیل کریں۔ بانو آپا' آپ کچھ نہیں بولی تھیں۔ البتہ آپ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلا رہی تھی۔ مجھے اس دن ڈراموں میں کراتی عظمیٰ گیلانی اور روحی بانو کے سارے کردار یاد آ گئے تھے میں نے بانو آپا! آپ کے اندر جھانک لیا تھا۔

بانو آپا!

وہ بھی کیا دن تھے جب قدرت اللہ شہاب' ممتاز مفتی' آپ کے گھر آ کر ٹھہرتے تھے۔ ہم سب مل کر گپ لگاتے تھے۔ اسی زمانے میں' میں نے آپ کے اوپر والے سٹوڈیو میں شہاب صاحب کا وہ انٹرویو کیا تھا جس میں انہوں نے کشمیر کے حوالے سے بہت سی باتیں پہلی دفعہ بتائی تھیں۔

جب ابن انشاء کا لندن میں انتقال ہوا تھا۔ تو ہم سب دوستوں کو اکٹھا کرنے کے لیے اور انشاء کے لیے فاتحہ کروانے کے لیے اشفاق صاحب نے اُردو سائنس بورڈ کے گلبرگ والے دفتر میں ختم قرآن کروایا تھا۔ مجھے یاد ہے فیض کو سیپارہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر کچھ کم ہوش لوگوں نے کہا تھا ارے فیض صاحب کو عربی آتی ہے۔ وہ قرآن شریف پڑھ سکتے ہیں۔ وہ تو کمیونسٹ ہیں ان بے علم لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ فیض صاحب نے پہلے عربی میں ایم اے کیا تھا۔ پھر انگریزی میں

ماسٹرز کیا تھا۔ وہ تو شاید ان کی شاعری بھی نہ سمجھ پائے ہوں گے۔

بانو آپا!

آپ کو یاد ہے جب میں نے انہیں کہا تھا کہ آپ کی پہلی مشہور کہانی ''گڈریا'' میں تو وہ بابا موجود ہے۔ جو آج کل اور اس عمر میں آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ خاں صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے اور کہنے لگے ''خدا تجھے خوش رکھے' میرے اندر اور باہر' دونوں جانب ایسے باعلم بابے ہیں جو پڑھے لکھوں سے زیادہ دانشمند ہیں۔ بس پھر ہماری لڑائی شروع ہو جاتی۔ مگر اس لڑائی نے کبھی تلخی' کینہ یا دشمنی کا رنگ نہیں لیا تھا۔ البتہ وہ مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔ بھلا کب جب ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے اُردو سائنس بورڈ کا ڈائریکٹر لگایا گیا تھا۔ دراصل اُردو سائنس بورڈ کو انہوں نے بے نامی سے مکمل وجود کی حیثیت میں پہنچایا تھا یہ سچ ہے ان کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ انہیں وہاں تاعمر رہنا چاہیے تھا۔ مگر اچھا ہوا' وہ عزت سے چلے گئے' ورنہ دیکھا آپ نے کم ظرف افسروں نے قاسمی صاحب کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

بانو آپا!

میں آپ کے ساتھ باتیں کیے جا رہی ہوں مگر ایک لفظ بھی تعزیت کا نہیں کہا نہ کہوں گی۔ وہ تو آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے اپنی بیماری کو بھول کر ان کی مسلسل خدمت کی۔ آپ کو ان سے پہلے جانے کا شوق تھا اور انہیں آپ سے پہلے۔ عجب پیارا سا یہ ہنسوں کا جوڑا تھا۔ بہت کم ادیبوں میں ایسی محبت اور وہ بھی دونوں اپنی مثال آپ ہوں مگر آپ میں ایک بڑائی تھی اور رہے گی۔ آپ نے خان کی انا کو پہچان کر اس کی ہر خواہش کو پورا کیا۔

یہ آخری سفر بھی ان کی خواہش کے مطابق تھا!

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

11 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد مرا نہیں......!

علامہ عبدالستار عاصم

میرے بچپن کے چند آئیڈیل اور سحر انگیز خیالات' واقعات اور مشاہدات میں سے ایک بصری مشاہدہ ریڈیو پاکستان پر برسوں پہلے براڈ کاسٹ ہونے والا طنزیہ پروگرام ''تلقین شاہ'' بھی تھا۔ اچھے مزاح' تعمیری طنز اور قومی درد سے لبریز ذومعنی گفتگو پر مبنی یہ پروگرام 30 سال تک چلتا رہا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ جوں ہی اناؤنسر ''تلقین شاہ'' پروگرام کے آن ایئر جانے کا اعلان کرتے تو ایک مستقل ''پراسرار'' میوزک کے بعد اشفاق احمد اپنے مخصوص انداز میں تلقین شاہ کے لہجے میں یوں گویا ہوتے'' ...... ہدایت اللہ ...... جی شاہ جی (ہدایت اللہ جواب دیتا ہے) ...... پائی (بھائی) میماناں (مہمان) دی دیکھ پال (بھال) کرو...... اونہاں توں پچھو ...... کیا کھاؤ گے' کیا پیو گے...... آخر میمان نوازی بھی کوئی چیج اے (آخر مہمان نوازی بھی کوئی چیز ہے) وغیرہ وغیرہ۔

اس فیچر میں کل پانچ کردار تھے جو ہر سننے والے کے ذہن پر نقش ہو جاتے تھے اور یہ پروگرام پاکستان کے تقریباً ہر دوسرے گھر میں بڑی فرمائش اور دلچسپی سے سنا جاتا تھا۔ اس پروگرام کے کئی مکالمے کئی کئی سال تک لوگوں کی زبانوں پر رہتے اور گلی' محلوں' ہوٹلوں' چوراہوں پر گونجتے سنائی دیتے رہے۔ میرے دل میں یہی خواہش تھی کہ ''تلقین شاہ'' کو دیکھوں' ان سے باتیں کروں' کچھ پوچھوں اور یہ تجسس وخواہش اس وقت پوری ہوتی جب میں (نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کے دفتر واقع لاہور میں) ایک علمی وادبی تقریب میں شریک تھا۔ اشفاق صاحب اس تقریب میں اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ میرا دل بلیوں اچھلا کہ آج میں اس کریکٹر سے بات کر سکتا ہوں جسے کبھی صرف دیکھنے کو متجسس رہا کرتا تھا۔ بہر حال معانقہ کے بعد میں نے نہایت ادب سے اپنا تعارف کروایا۔ اشفاق صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور شفقت وخلوص کے ساتھ قریب والی نشست پر بٹھا لیا۔ فرمانے لگے' ابھی آپ نوجوان ہیں...... آپ کو بڑا آدمی بننا ہے۔ بڑے لوگوں

کی سوانح عمری پڑھیں' ان کی زندگیوں کا مشاہدہ کریں' ان کے حالات زندگی کا تجزیہ کریں۔ آپ جس عمر میں آج کل ہیں' اس میں بڑے لوگوں کی عملی داستانیں پڑھ کر جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

ایک مرتبہ محترم اشفاق احمد صاحب لاہور کے ایک ہوٹل میں ایک صحافتی و علمی حلقہ احباب میں جلوہ افروز تھے۔ مجھے ایک میرے صحافی دوست نے فون کے ذریعے مطلع کیا۔ بس پھر کیا تھا میں تمام مصروفیات چھوڑ کر فوراً ہوٹل پہنچ گیا۔ اب تو صورتحال یہ تھی کہ مجھے اشفاق صاحب کی صورت میں ایک دوست استاد مل گیا تھا جو بڑے فلسفیانہ اور تجزیاتی انداز میں مجھے کچھ نہ کچھ بتا دیتا ہو۔ ملاقات ہوئی' حسب روایت مجھے اپنے مخصوص مخلصانہ انداز میں ''تلقین'' فرمانے لگے ''کبھی غور کیا ہے...... انسان کیا ہے...... ایک پانی کے قطرے کی پیداوار ہے...... بنی نوع انسان کی تخلیق مجازی یہی قطرہ کرتا ہے۔ جاپان' چین' کوریا کے پانی کے قطرے ہم سے مختلف کیوں ہیں؟ ہم 1947ء میں غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوئے تھے۔ جاپان' چین' کوریا ہمارے بعد آزاد ہوئے تھے' مگر وہ ترقی میں ہم سے آگے نکل گئے۔ ہمارے اور ان کے درمیان کیا تفریط ہے...... میرا خیال ہے...... فرق صرف یہ ہے کہ وہ اپنا ہر کام آج اور آنے والے کل کے لیے کرتے ہیں' جب کہ ہم اپنا ہر کام صرف آج کے لیے کرتے ہیں۔''

اسی طرح کراچی میں بھی محترم اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنے ایک شاعر دوست محترم سید امین گیلانی کی کتب ''امید و یاس' فنون و حکمت عملی' سوئے مقتل' دامان خیال' بخاری کی باتیں' ہمارے دور کے چند علمائے حق' مشتاقان حرم اور سرمایہ درویش'' کا ایک سیٹ تحفہ میں اشفاق احمد کو دیا۔ انہوں نے بھی اپنی چند ذاتی تصانیف سے اپنے دستخطوں کے ساتھ نوازا۔ میں احساس تفاخر سے سرشار ہو گیا۔ حسب روایت دانشوری کے پھول کھلاتے ہوئے یوں کہنے لگے ''زندگی ایک لمحہ ہے۔ اس ایک لمحے میں صدیوں سے بڑا کام کر جاؤ کیونکہ انسان ایسا کر سکتا ہے' یہی اس کی عظمت ہے' شاید اسی لیے اسے سجدہ کروایا گیا تھا۔

اشفاق احمد جب بھی ملتے محبت' خلوص' دانش اور فلسفہ کا پیکر نظر آتے۔ بڑی باریک بینی اور نکتہ وری سے نہ صرف عقل و خرد کی گتھیاں سلجھاتے بلکہ جنون و بے خودی کے کوہ سرمست کی

سیر بھی کروا لاتے۔ قوم اور محبت' امن اور ایمان کی چاہت ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ ان کی پوری زندگی مسرت وشادمانی سے عبارت ہے۔

یہ بھی قدرت کا ایک عظیم احسان ہے اشفاق احمد نے جوانی میں جس لڑکی کو حاصل کرنے کا خواب دیکھا' وہی لڑکی تعبیر بن کر ان کے آنگن میں آ گئی۔ اس پر مستزاد خوش بختی یہ کہ بانو آپا ایک مکمل اور مدلل رائے رکھنے والی باشعور اور قلمکار خاتون کے باوقار روپ میں سامنے آئیں۔ مگر پچاس سال تک قوم کے اس عظیم فلاسفر اور ہمدرد کی زوجیت میں اس طرح گزارے کہ جس طرح کوئی کنیز اپنے آقا کی خدمت میں سرنیاز خم کیے رہتی ہے۔

منگل کے دن 7 ستمبر 2004ء کو صبح کے وقت عالمی میڈیا پر جب یہ خبر نشر ہوئی کہ 22 اگست 1925ء کو مکسر ضلع فیروز پور (بھارت) میں ایک ویٹرنری ڈاکٹر محمد خان کے گھر پیدا ہونے والا عہد حاضر کا عظیم محقق' دانشور' ادیب' سفرنامہ رائٹر' تجزیہ نگار' مبصر' اداکار' صداکار' تخلیق کار' شاعر' استاذ' فنکار' براڈ کاسٹر' کمپیئر' مصنف' افسانہ نگار' نقاد' مصلح ادب و معاشرت' قانع' متوکل' شاکر' صابر' سخی' مہذب' مخلص' شفیق' نیک دل' ہمدرد' انسانوں سے محبت کرنے والا' محبت کے قابل ملامتی صوفی' رجل بے ریا' اچھا خاوند' اچھا باپ' اچھا بیٹا' ایک مہذب اور محب وطن پاکستانی اشفاق احمد خاں کافی عرصہ پتے کے کینسر جیسی موذی مرض میں مبتلا رہنے کے بعد 79 برس کی عمر میں اپنی ادبی زندگی کی ساتھی بیوی اور عظیم عورت بانو قدسیہ اور تین بیٹوں کو سوگوار چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو گیا ہے' تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ بلاشبہ یہ خبر پاکستان کے تمام علمی و ادبی حلقوں کے لیے بڑے صدمے سے کم نہیں۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اشفاق احمد جیسا بڑا آدمی اب مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اشفاق احمد مرا نہیں' اس کے مکالمے' تجزیے' تحریریں' افسانے' ڈرامے' کہانیاں اور داستانیں آئندہ کئی زمانوں کو جلا بخشتی رہیں گی اور کئی قومی و معاشرتی مسائل کے حل کی راہ دکھاتی رہیں گی۔

روزنامہ ''دن'' لاہور

11 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد نے نظریہ پاکستان کو داستان کے انداز میں پیش کیا

ایس ایم ظفر

مرحوم بہت بلند علمی مقام رکھتے تھے۔ ان کے جانے سے لاہور خالی ہو گیا۔

حمید اختر' انتظار حسین

اشفاق احمد ایسے تناور درخت تھے جن کی چھاؤں میں ہر آدمی بیٹھتا تھا۔

فرخندہ لودھی' اجمل نیازی' کنول فیروز

ادب کا سورج غروب ہو گیا' سردار جاوید' وہ آسانیاں بانٹنے والے دانشور تھے۔ اظہر جاوید

بہت بڑا خلا پیدا ہو گا۔ احمد فراز' حقیقتیں بیان کرنیوالا چلا گیا۔ شعیب بن عزیز

لاہور (ادبی رپورٹر) اشفاق احمد مرحوم خود ایک تاریخ تھے۔ ان سے ہماری ثقافتی، علمی اور اخلاقی بنیادوں کی پوری تاریخ کا عہد ختم ہو گیا۔ انہوں نے نظریہ پاکستان کو داستان کے انداز میں دلکش بنا کر پیش کیا۔ یہ بات ممتاز قانون دان اور دانشور ایس ایم ظفر نے ''پاکستان'' سے گفتگو کرتے ہوئے کہی۔ ترقی پسند ادیب اور کالم نگار حمید اختر نے کہا کہ اشفاق احمد مجھ سے ایک سال چھوٹے تھے اس ناطے سے میں انہیں عزیز کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علمی اعتبار سے وہ بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ دی ٹرسٹ سکول والے طاہر یوسف نے کہا کہ ان کے چلے جانے سے لاہور خالی ہو گیا ہے۔ اب ایسے آدمی کہاں سے آئیں گے۔ افسانہ نگار انتظار حسین نے کہا کہ ان کا جانا میرا ذاتی نقصان بھی ہے اور ادب کا بھی۔ ان کے لئے باتیں ہوتی رہیں گی۔ فرخندہ لودھی نے کہا وہ ایک چھتنار درخت تھے جس کے سائے میں سب بیٹھتے تھے دانش کا ایک باب ختم ہو گیا۔ کالم نگار ڈاکٹر اجمل نیازی نے کہا کہ اشفاق احمد نے دانش اور دین کو ملا دیا تھا۔ وہ اتنے بڑے آدمی تھے کہ بڑائی بھی خود پر ناز کرتی تھی ڈاکٹر کنول فیروز نے کہا کہ وہ نابغہ روزگار تھے ان جیسی گفتگو کرنا

ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ پر مغز لیکن دلچسپ بات کرنے کا فن صرف وہ جانتے تھے۔ سید سردار جاوید نے کہا ایک سورج غروب ہو گیا جس کے دوبارہ طلوع ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ شاعر اظہر جاوید نے کہا کہ مرحوم آسانیاں بانٹنے والے دانشور تھے۔ نامور شاعر احمد فراز نے کہا کہ دوستوں اور سامعین کے لئے بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ڈی جی پی آر شعیب بن عزیز نے کہا کہ ہمارے اس داستان گو نے جو حقیقتیں بیان کیں کسی اور نے نہیں کیں۔ آنے والے دور میں پتہ چلے گا کہ وہ کس دنیا کے آدمی تھے۔ احمد عقیل روبی نے کہا مرحوم زندگی بھر نئی نسل کو دھند میں راستہ دکھاتے رہے۔ وہ ایک ادارہ ایک عہد اور ایک تہذیب تھے۔ قاضی جاوید نے کہا کہ لاہور شہر کے جسم سے روح جدا ہو گئی ہے اشفاق صاحب اس شہر کی رونق تھے۔ اصغر ندیم سید نے کہا کہ انہوں نے عام آدمی تک دانش کی روشنی پہنچائی ایسا بے مثال شخص پہلے آیا نہ آئے گا۔ اعزاز احمد آذر نے کہا کہ اشفاق احمد ایک اچھا موسم تھا جو دوبارہ نہیں آئے گا۔ ہم ان کی باتیں ان کا لہجہ کبھی نہیں بھول پائیں گے۔ افضال شاہد نے کہا کہ ان کی گفتگو ادب اور دانش کا رنگ لئے ہوئے ہوتی تھی ان جیسے شفیق بزرگ کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ شاعر اور نقاد ڈاکٹر علی ظہیر منہاس نے کہا کہ اشفاق احمد کے انتقال نے اردو ادب کو بے آسرا کر دیا ہے اب ان جیسے افسانے کون لکھے گا۔

(روزنامہ پاکستان لاہور۔
12 ستمبر 2004ء)

اشفاق احمد: بلبل ہزار داستان

جمیل احمد عدیل

(برجستہ)

''اور میں اپنی موت کے غم میں دکھ سے بھر گیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ یعنی مرنے کے بعد کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا...... باہر کے لوگوں کے بارے میں تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن لاہور کے لوگ اس کی کو ضرور محسوس کریں گے...... آخر میرا مر جانا اور ختم ہو جانا اور اس جہان سے چلے جانا کوئی معمولی بات تھوڑی ہوگی...... آخر فیصلہ یہ ہوگا کہ نو بجے والی خبروں کی تصویری جھلک میں ذرا سا حصہ اس پروگرام کا بھی دکھایا جائے جو لاہور ٹی وی نے میری یاد میں کیا تھا...... رات کو جب ریڈیو پر میرے انتقال کی خبر نشر ہوگی تو چوکی، جھنگ، ساہیوال، موڑ کھنڈا، عبدو کے علی اولکھ وغیرہ کے لوگ کہیں گے۔ ''لو جی ایہہ وی ختم ہو گیا۔ بڑا ایانا بندہ سی۔ کیا تلقین شاہ دا روپ بھریا سی...... رات کو جب ٹی وی پر خبر نامہ میں یہ خبر نشر ہوگی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہوگا۔ بہت سے ناظرین آرزو مند ہوں گے میرے کسی پرانے پروگرام کی ایک جھلک دکھا دی جائے...... پھر صبح ہوگی اور دکانیں کھلنے لگیں گی اور لوگ دفتروں کو جانے لگیں گے اور بچے مدرسوں کے لیے تیار ہوں گے اور عورتیں منہ دھونے لگیں گی۔ شاہ عالمی میں ایک کراکری مرچنٹ اخبار ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھی دکاندار کے پاس جا کر کہے گا۔ یار یہ دیکھا تم نے تلقین شاہ مر گیا بے چارہ...... حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور ذہین فنکار اور شو مین بزنس کے ایک کامیاب آرٹسٹ کی موت کے باوجود لاہور کا سارا کاروبار نارمل طریق پر چلتا رہے گا۔ شاہ عالمی سے لے کر میو ہسپتال کے چوک تک ٹریفک اسی طرح پھنسا رہے گا۔ کوچوان گھوڑوں کو اونچے اور قریبی کوچوان کو نیچے لہجے میں گالیاں دیتے رہیں گے۔ ہسپتال کے اندر مریضوں کو کھانا جاتا رہے گا۔ ٹیلی فون بجتا رہے گا۔ بجلی کا بل آتا رہے گا۔ فقیر سوتا رہے گا۔ چوڑھے ٹاکی مارتے رہیں گے۔ استاد پڑھاتے رہیں گے۔ ریکارڈنگ ہوتی رہے گی۔ قوال گاتے رہیں گے۔ رنڈی ناچتی

رہے گی۔ ڈاکیہ چلتا رہے گا۔ سوئی گیس نکلتی رہے گی۔ تقریریں ہوتی رہیں گی۔ غزلیں لکھی جاتی رہیں گی۔ سوئی میں دھماکہ پڑتا رہے گا۔ قتل ہوتا رہے گا۔ زچہ مسکراتی رہے گی' بچہ پیدا ہوتا رہے گا......!"

صاحبو! مذکورہ سطور کے خالق اشفاق احمد ہیں' جو 7 ستمبر کو سچ مچ مر گئے اور برسوں قبل ان کی تحریر ہوئی Fantasy اپنی حقیقت کا ایک بار پھر اعلان کر گئی۔ واضح رہے کہ ہم نے مختص تلخیص پیش کی ہے ورنہ کوئی 14 صفحات پر پھیلا ہوا یہ مضمون اُردو نثر اور لٹریچر کا ایک زبردست شاہکار ہے جسے دلچسپی ہو "سفر در سفر" میں پڑھ کر لطف اُٹھائے۔ دوستو! اس سے بڑھ کر اور بے رحم سچائی کیا ہوگی کہ جنہیں مرنا نہیں "چاہیے" ان کے مرجانے سے بھی زندگی کا نظام اپنی متعینہ ڈگر پر جاری و ساری رہتا ہے۔ غیر معمولی اشفاق صاحب بھی اس خالی دنیا سے بالآخر چلے گئے اور حیات اپنے معمول کے مطابق رواں دواں ہے۔ یہ ستم ہے یا ناقابل تبدیلی دستور' ہم نہیں جانتے بہر حال ہوتا یہی آیا ہے غالب خستہ کے بغیر دنیا کے کام بند نہیں ہو جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرنے والے کے متعلقین اپنی اپنی نسبت کی نوعیت سے دکھ' غم اور اداسی لازماً محسوس کرتے ہیں۔ مرحوم اشفاق احمد کی نسبتیں صرف تین بیٹوں اور ایک اہلیہ تک محدود نہیں تھیں۔ ان سے محبت کرنے والے اس دنیا میں لاکھوں نہیں کروڑوں عقیدت مند ہیں۔ بھلے لفظ و حرف اس گئے گزرے عہد میں وجہ عزت نہ رہے ہوں مگر اشفاق صاحب کی عزت و احترام کا سبب ان کے الفاظ ہی بنے جو کاغذ پر منتقل ہوئے۔ جو ان کی زبان سے ادا ہوئے۔

اشفاق صاحب کو جس رہنما کے ساتھ سنا گیا۔ کیا کسی دانشور کو سماعتوں کی ایسی یکسوئی نصیب ہوئی ہوگی۔ ہمیں تو ان کے ہم عصروں میں ایک بھی ادیب ایسا دکھائی نہیں دیتا جس کی آواز کان سے ٹکراتے ہی راہی کے قدم زمین تھام لیتی ہو۔ یہ اعزاز بس اشفاق صاحب کے حصے میں ہی آیا کہ ان کی بات اور شخصیت مخاطب کی ساری کی ساری توجہ ایک ہی آن میں جذب کر لیتی تھیں۔ اپنے اپنے حلقوں میں پروفیسر کرار حسین' حنیف رامے' سراج منیر' قیوم صاحب بلاشبہ خوبصورت گفتگو پر قادر مانے گئے ہیں لیکن اشفاق صاحب تو باتوں کے جادوگر تھے۔ بے نظیر ساحر'

ایسا کلامی ایسا بلبل ہزار داستان اب کیا کسی کو دیکھنا نصیب ہوگا۔ مرحوم صرف گفت وشنید کے میدان کے ہی شہسوار نہیں تھے تحریر پر بھی انہیں حیران کن قدرت حاصل تھی۔ ان کی 26 کے قریب کتب ادب عالیہ کا مستقل حصہ بن کر رہیں گی۔

باقی رہے ان کے نظریات تو اس خاکسار سمیت ان کا ہر مداح ذہنی تحفظات کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ ہمیں یاد ہے اب سے تقریباً 16/17 سال قبل جب ہم پنجاب یونیورسٹی اور مغل کالج میں طالب علم تھے۔ ہم سب کے محبوب ترین اُستاد جناب ڈاکٹر تحسین فراقی نے شعبہ اردو میں اشفاق صاحب کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا اور واحد مضمون نگار کے طور پر اس عاجز کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کے لیے پابند کردیا۔ ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کی صدارت تھی۔ راقم نے طویل مقابلہ پڑھا جس پر اشفاق صاحب نے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کی۔ خواجہ صاحب نے بعد میں شفقت آمیز پیرائے میں ہمیں سمجھایا کہ وہ ہمارے مہمان تھے۔ تمہاری تحریر قدرے سخت تھی۔ تصوف ان کی حیات کا مرکز ہے اور تمہاری تنقید میں لحاظ کا عنصر تمام موجود نہیں تھا۔ خیر وقت گزر گیا کچھ عرصے کے بعد ڈی پی آئی آفس کے قریب ایک روز دوپہر کے وقت اشفاق صاحب ہمیں مل گئے۔ انہوں نے ملیشیے کے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ پہچان لیا اور بولے' تمہارا وہ مضمون میں نے ''سیارہ'' میں پڑھ لیا ہے۔ سنا کم توجہ سے تھا۔ پڑھا زیادہ دھیان سے ہے۔ سچی بات ہے اپنے کھرے پن پر ان لمحوں میں ہم خفیف سے ہوئے' پھر بانو آپا کی نئی آنے والی کتاب ''مرد ابریشم'' کا ذکر ہوا۔ جب ہم نے بتایا کہ مکمل پڑھ چکے ہیں تو ان کے چہرے پر خوشگوار حیرانی نمودار ہوگئی کہ متذکرہ کتاب دو چار دن پہلے ہی مارکیٹ میں آئی تھی۔ اشفاق صاحب نے پیار سے ہمارا ہاتھ تھاما اور بولے:'' آئیں تینوں تیری بانو آپا نال ملواواں'' مال روڈ کراس کر کے جب ہم نولکشن مارکیٹ کے پاس پہنچے تو وہاں سفید رنگ کی عام سی سوزوکی کار میں بانو آپا موجود تھیں۔ اشفاق صاحب نے تعارف کروایا۔ پوچھنے لگیں بیٹا! کیا کررہے ہو؟'' ہم نے بتایا نوکری کے لیے انٹرویو دیا ہوا ہے۔ کہنے لگیں کوئی سفارش بھی ہے؟ ہم نے عرض کیا صرف ماں باپ کی دعائیں ہیں۔ بولیں: ''تمہیں نوکری مل کر رہے گی'' جب ہم نے سروس جائن کی تو پہلا کام

یہ کیا کہ بانو آپا کو خط لکھا۔ شکریہ ادا کیا اور ان کی نیک آرزو کے پورا ہونے کی اطلاع دی۔

اشفاق صاحب کی شخصیت سے تو ہم 1980ء سے ہی واقف تھے کہ انہیں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے TV ڈرامے غور سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ 1985ء میں ہم نے بورے والا سے ایک ننھا منا سا ادبی رسالہ جناب اے غفار پاشا کی ادارت میں شروع کیا۔ اس کی ایک کاپی ہم نے اشفاق صاحب کو بھی ارسال کر دی۔ ایک دن اشفاق صاحب کا پوسٹ کارڈ ملا جس میں انہوں نے اتنی شاباش دی کہ ہم شرابور ہو گئے۔ وہ خط ہم نے لیمینیشن کروا لیا آج بھی وہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔

قیام لاہور کے دوران اشفاق صاحب سے بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی بار انہیں ہم نے ریڈیو سٹیشن میں غالباً 1984ء میں دیکھا تھا تب انہوں نے بھی اپنے چہرے کو داڑھی سے مزید خوبصورت نہیں بنایا تھا۔ 1986ء میں جب قدرت اللہ شہاب فوت ہو گئے تو اشفاق صاحب باریش ہو گئے۔ وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں داڑھی خوب جچتی تھی۔ آخری بار اشفاق احمد کو ہم نے ایوان کارکنان تحریک پاکستان میں غالباً دو ایک سال پہلے سنا۔ تب ہمارے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ انہیں براہ راست دوبارہ دیکھنے کا زندگی میں پھر کبھی موقع نہیں ملے گا۔

اشفاق احمد بلاشبہ ان شخصیات میں سے ایک ہیں جن کے متعلق یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ ہم سے بچھڑ جائیں گی۔ لیکن ایسا ہونا ہوتا ہے اور وہ ایسا ہی ہونا ہوتا ہے کہ کوئی کتنا بھی اہم کیوں نہ ہو اس کے سینے میں ہونے والی سانس کی دستک بند ہوئی ہوتی ہے۔ اے کاش مجھے بھی اس منفرد ادیب کی طرح لذت سے لبالب فقرہ رقم کرنا آ جائے۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکے گا۔ کبھی بھی ہو نہیں پائے گا کہ اشفاق احمد ایک ہی تھا۔ اشفاق احمد کوئی دوسرا نہیں سکتا۔

روزنامہ "دن" لاہور

12 ستمبر 2004ء

تلقین شاہ: عالمی ریکارڈ یافتہ ریڈیو پروگرام کے پروڈیوسر سے کریکٹر تک سب کچھ اشفاق احمد تھے

1958ء میں "حسرت تعمیر" کے نام سے شروع ہونیوالا پروگرام 1965ء میں "تلقین شاہ" بن گیا 46 سال آن ایئر رہنے والا پروگرام صوفی دانشور اشفاق احمد کی رحلت سے ایک روز قبل تک جاری رہا پہلے نمبر پر یہ پروگرام بی بی سی وائس آف امریکہ اور کینیڈین ریڈیو سمیت دنیا بھر میں نشر ہوتا رہا اشفاق احمد اپنے گھر "داستان سرائے" پر خود ہی پروگرام کی ریکارڈنگ کر کے ریڈیو پاکستان کیسٹ بھجواتے رہے پروگرام میں بہرے کا کردار ایم اے رشید کو سونپا جو واقعی قریباً بہرے تھے" یہ ذہانت کا ثبوت ہے

منفرد اسلوب کے بانی ادیب اور صوفی دانشور اشفاق احمد مرحوم کا مقبول عام اور عالمی شہرت کا حامل پروگرام "تلقین شاہ" ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں طویل عرصہ تک جاری رہنے والا دوسرا پروگرام تھا۔ جو مسلسل اور بلا تعطل 46 سال تک آن ایئر جاتا رہا۔ مقبولیت کے اعتبار سے یہ پروگرام پہلے نمبر پر تھا اور اس انداز سے بھی یہ منفرد اہمیت کا حامل تھا کہ بی بی سی کے وائس آف امریکہ اور کینیڈین ریڈیو سمیت تمام عالمی براڈ کاسٹنگ سٹیشنوں سے یہ پروگرام نشر کیا جاتا رہا۔ اسی شہرت اور مقبولیت کی بناء پر "تلقین شاہ" کو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی شامل کیا گیا۔ تکنیکی اعتبار سے بھی یہ غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کہ اس پروگرام کا عملاً کوئی پروڈیوسر نہ تھا بلکہ مرحوم اشفاق احمد خود ہی اس کے ڈائریکٹر رائیٹر پروڈیوسر پریزنٹر اور کریکٹر تھے جبکہ یہ امر عام افراد کے لئے حیران کن ہو گا کہ کئی سالوں تک اشفاق احمد اس پروگرام کی ریکارڈنگ اپنے گھر "داستان سرائے" پر خود ہی کرتے رہے اور کیسٹ ریکارڈ کر کے ریڈیو پاکستان کے ٹیکنیشن کے

حوالے کر دیتے جو صرف اسے نشر کیا کرتا تھا۔

''یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں'' اشفاق احمد اور ان کے پروگرام ''تلقین شاہ'' کی کہانی بڑی پرانی اور مزیدار ہے جو اپنے اندر کئی نشیب و فراز جدید اور قدیم تہذیب کا حسین امتزاج' طنز و مزاح اور معاشرتی ناہمواریوں کی دل سوز داستانیں سموئے ہوئے ہے پروگرام ''تلقین شاہ'' محض ریڈیو پاکستان کا عظیم ورثہ ہی نہیں بلکہ یہ عام شہری کے دل کی آواز اور معاشرہ کا صحیح معنوں میں عکاس بھی تھا۔ جس کا آغاز 1958ء میں ہوا یہ وہ دور تھا جب سابق صدر ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا تصور پیش کیا اور سرکاری میڈیا ہونے کے ناطے ریڈیو پاکستان کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس نظام کو مقبول عام کرنے کیلئے کوئی نیا سلسلہ شروع کرے یوں ''حسرت تعمیر'' کے نام سے ایک پروگرام کا آغاز کیا گیا جو کہ اشفاق احمد کا تحریر کردہ تھا اس کے مرکزی کردار اشفاق احمد' نذیر حسینی اور فاطمہ بیگم وغیرہ ہوا کرتے تھے جبکہ پروڈیوسر آرگنائزر سلیم اقبال تھے اس پروگرام کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کرنے کے لیے ریڈیو پاکستان میں خصوصی طور پر ایک شعبہ نیشنل ری کنسٹرکشن سیکشن بھی قائم کیا گیا۔ پاک بھارت جنگ سے کچھ ہی روز قبل 1965ء میں اس پروگرام کا نام تبدیل کر کے تلقین شاہ رکھ دیا گیا جو کہ اشفاق احمد کی رحلت سے ایک روز قبل تک بغیر کسی وقفہ کے جاری رہا اس پروگرام کے مرکزی کرداروں میں اشفاق احمد (تلقین شاہ) نذیر حسینی (ہدایت اللہ) ایم اے رشید' عفت بیگ ناہید خانم اور ان کی دو بہنیں شامل تھیں۔ اس کی تحریر اور پیشکش سمیت سب کچھ اشفاق احمد ہی کے گرد گھومتا تھا جبکہ جن پروڈیوسروں کو یہ پروگرام پیش کرنے کی سعادت حاصل رہی ان میں جعفر رضا' عتیق اللہ شیخ الطاف الرحمن اور صفدر ہمدانی شامل ہیں۔ صفدر ہمدانی 1974ء سے 1979ء کے طویل عرصہ تک یہ پروگرام مسلسل پیش کرتے رہے۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگ تو پروگرام ''تلقین شاہ'' کے برائے نام پروڈیوسر تھے سارا کام تو اشفاق احمد خود ہی کیا کرتے تھے۔ وہ کرداروں اور جگہ کے انتخاب سے پروگرام کی تحریر اور پیشکش تک کے تمام مراحل خود ہی بخوبی انجام دیتے تھے ریڈیو پاکستان تو محض ایک

کنٹریکٹ تیار کر کے اس پر اشفاق صاحب کے دستخط کروالیتا تھا پھر اس کے بعد ہمیں کوئی فکر نہ ہوئی تھی کہ پروگرام کیسا اور کیسے نشر ہوگا صفدر ہمدانی کا کہنا ہے کہ اس وقت ملک کے معمر ترین آرٹسٹ نذیر حسینی ہیں وہ مسلسل اشفاق احمد کے ساتھ ہدایت اللہ کا کردار ادا کرتے رہے۔ اشفاق احمد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کیریکٹر کا انتخاب کرنا خوب جانتے تھے انہوں نے ایم اے رشید کو چنا وہ براڈ کاسٹنگ کا ایک بڑا نام ہے اسی طرح تلقین شاہ میں بھانجی کا کردار عفت بیگ سے کروایا اور اسے اشفاق صاحب نے امریکہ سے خصوصی طور پر بلوایا تھا اور اس کردار کے ذریعے انہوں نے امریکہ اور پاکستان کی تہذیب کے فرق کو واضح کیا۔ ایم اے رشید کو پروگرام میں بہرے کا کردار سونپا گیا تھا اور عام لوگوں کے لئے یہ بات بڑی حیران کن ہوگی کہ وہ واقعی قریباً بہرے تھے بہت زیادہ اونچا سننے والے کو بہرے کا کردار دینا کس قدر ذہانت کی بات ہے پروڈیوسر صفدر ہمدانی اور پروڈیوسر آفتاب اقبال کا کہنا ہے کہ پروگرام ''تلقین شاہ'' کوئی مزاحیہ پروگرام نہیں تھا بلکہ اس میں طنز ہوا کرتا تھا اس کا مرکزی خیال جدید اور قدیم تہذیب کا تقابلی جائزہ تھا' جس میں حالات حاضرہ اور عام شہری کی زندگی پر گفتگو ہوئی تھی جبکہ اشفاق احمد مرحوم کے بنیادی مسائل کو بھی اس پروگرام میں مرکزی حیثیت حاصل تھی وہ عام لوگوں کے مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں اجاگر کیا کرتے تھے مسٹر ہمدانی نے بتایا کہ اشفاق صاحب مرحوم نے کئی دفعہ پروگرام میں ''شٹ دی ڈور'' (Shut the Door) کا لفظ استعمال کیا جو کہ بہت مقبول ہوا یہ ان کے مشاہدے کی باتیں ہوتی تھیں انہوں نے ہمیں سنایا کہ میں ایک مرتبہ لندن گیا جہاں ''انڈر گراؤنڈ'' میں ملازم ہو گیا اس کے دروازے آٹومیٹک نہیں تھے اس لئے ایک گارڈ باہر کھڑا ہو کر آواز لگاتا تھا ''شٹ دی ڈور''۔ اشفاق احمد مرحوم نے اس گارڈ کے سٹائل اور آواز کو بھی موضوع بنایا تھا اسی طرح وہ اکثر ہدایت اللہ کو ''بے ہدائیتا'' کہہ کر پکارا کرتے تھے ان کا ہدایت کردار اس قدر رفت ہوتا تھا کہ اور یجنل معلوم ہوتا تھا۔ پروڈیوسر ہمدانی نے ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ 1975ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے الیکشن ہو رہے تھے یہ انتخابات 23 مارچ سے 25 مارچ تک ہونا تھا ریڈیو پاکستان نے اس حوالے

سے 23 مارچ 25 اپریل ڈبل مارچ پروگرام شروع کیا۔ یہ نام اور پروگرام کا آئیڈیا اشفاق احمد مرحوم کا ہی تھا۔ وہ ہمیں اس کے مختلف طریقے بتاتے تھے پروگرام میں سامعین کو بھی ایکشن کے حوالے سے مختلف ''گر'' سکھاتے۔ اشفاق صاحب مرحوم نے پروگرام میں یہ تک بتا دیا کہ حزب اختلاف کے جلسوں کو کس طرح تلپٹ کرنا اور ناکام بنانا ہے۔ انہوں نے اپوزیشن کے جلسوں میں ''بجریں'' چھوڑنے کا طریقہ بھی بتایا جسے ہر سطح پر بہت سراہا گیا تھا۔ صفدر ہمدانی کے مطابق ریڈیو پاکستان کا طویل ترین پروگرام ''حامد میاں کے ہاں'' تھا جو 1950ء میں شروع ہوا جس کے مرکزی کرداروں میں حامد میاں اور مسز قزلباش شامل تھے۔ یہ پروگرام 50 سال سے زائد عرصہ پر محیط ہے ایک مرتبہ ہیڈکوارٹر سے یہ ہدایت آئی کہ پروگرام ''حامد میاں کے ہاں'' چونکہ سندھ سے پیش ہوتا اور اس صوبہ میں زیادہ مقبول ہے جبکہ ''تلقین شاہ'' پنجاب سے پیش ہوتا اور اسی علاقہ میں زیادہ سنا جاتا ہے اس لئے ''حامد میاں کے ہاں'' پنجاب میں اور ''تلقین شاہ'' سندھ میں پیش کیا جائے لیکن 6 ماہ بعد ہی یہ تجربہ ناکام ہوگیا کیونکہ مقامی علاقہ' مقامی حالات اور ثقافت پروگرام کے حوالے سے بڑے اہم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پروگرام ''تلقین شاہ'' ریڈیو پاکستان کیلئے جسم میں دل کی حیثیت رکھتا تھا اس کی مقبولیت اس قدر تھی کہ ہر چھوٹا بڑا نہ صرف اس پروگرام کو جانتا تھا بلکہ تلقین شاہ اور ہدایت اللہ کے کرداروں کی نقل گلی محلوں میں بھی ہوتی تھی۔

روزنامہ پاکستان لاہور

12 ستمبر 2004ء

کون گلی گے شام......؟

بشریٰ رحمٰن

(چادر چار دیواری اور چاندنی)

میرے ساتھ انہوں نے ایک منفرد رشتہ استوار کیا تھا۔ اس رشتے کے فوائد تو بہت تھے مگر ایک نقصان بھی ہوا۔ ابتدا میں، میں نے ان سے فاصلہ رکھا۔ ملتی بھی رہی اور فاصلے پر بھی رہی...... ڈرتی بھی رہی...... باتیں کرتی بھی رہی...... بہو اور سسر کے رشتے میں ہمیشہ احترام پردہ بن جاتا ہے۔ پر ایک دن جب میں نے اپنے حق کو پہچان لیا تو وہ میرے شفو بھائی ہو گئے۔ وہ خود ایک چھتنار، پھل دار اور سایہ دار درخت تھے۔ مگر ان کے جلو میں ایک ٹھنڈی میٹھی ندی بہتی رہتی تھی ان کا سایہ جتنا گھنیرا ہوتا جاتا ندی اتنی روانی سے بہتی جاتی...... گنگناتی رہتی۔ یہ بھید کبھی نہ کھل سکا کہ مترنم ندی، چھتنار درخت کے قدموں تلے کیوں بہتی ہے۔ اسے سرسبز رکھنے کے لیے۔ اس کی پیاس بجھانے کے لیے یا اس لیے کہ گھمبیر، گہرا، گھنگھور درخت اس میں اپنا چہرہ دیکھتا رہے۔ وہ دونوں میاں بیوی اس شہر کا ہر دلعزیز ناقابلِ تقلید جوڑا بنے رہے۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ

محبت کی رسموں میں ایک رسم بہت ہی ظالم ہے۔ کہ چاہے کتنے ہی وعدوں اور ارادہ سے دو ہمسفر اپنی زندگی کی ابتدا کریں۔ ایک کو پہلے جانا ہوتا ہے۔ بانو آپا کو ہم کیسے سمجھائیں! کہ وہ بے وفا ہرگز نہ تھے۔ اشفاق احمد خان اپنی بانو قدسیہ کو اور اس ہرے بھرے شہر کو چھوڑ کر اس طرح چل دیئے جیسے انہوں نے ازل سے یہ پروگرام طے کر رکھا تھا۔ قسام ازل نے ان کو آواز، الفاظ اور راگ، افہام اور الہام سے گوندھ کر بھیجا تھا۔ حسن صورت بھی اور حسنِ کردار بھی عطا کیا تھا۔ عین عالم شباب میں گڈریا اترا اور سارے جنگل میں آگ لگ گئی...... پھر ایک محبت سو افسانے پھیلتے پھیلتے پوری صدی پر محیط ہوئے۔ پھر یہ نرالا خامہ بدوش رکا کب...... وہ تو سیل رواں تھے رکنے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے۔ وہ تو ایک صدی کی امانتیں اٹھائے پھرتے تھے۔ ایک صدی کے دل جیتنے

کے لیے اور ایک صدی کے اذہان میں اترنے کے لیے بنائے گئے۔ ان کو صرف اذن سفر ہی نہیں ملا تھا۔ نشان منزل بھی دیا گیا تھا۔ عجیب حلاوت تھی ان کی زبان میں ...... عجیب کشش تھی ان کے فلسفے میں' الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے' منتظر رہتے کہ کب گویائی ان پر ملتفت ہو اور وہ نطق کے سیزان پر چڑھیں وہ بولتے تو زمانہ سنتا...... میں اکثر ان سے کہتی تھی شتو بھائی! آپ جیسا اور کوئی نہیں ہوگا۔ گھبرا کر اپنی ذات سمیت لپٹتے جیسے کہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیئے۔ نہیں کڑیے ...... ایسا نہیں کہتے۔ ممتاز مفتی کے بعد وہ جب بھی مجھے پیار سے سرزنش کرتے ہمیشہ کڑیے کہتے۔ چل پڑے تو کہیں رکے نہیں۔ اونچی نیچی گھاٹیوں سے زندگی کا کارواں گزرتا رہا۔ زندگی کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے بندگی کی ہر ہر ادا اپنائی۔ دنیا کے نشیب و فراز دیکھے۔ عقبیٰ کے راز سمجھے' قلم کو ہمدم اور اللہ کی مخلوق کو ہم سخن بنا لیا۔ ان کی زندگی کی ایک کھلی کتاب بن گئی کوئی صفحہ کھولیئے ...... فال کے انداز میں کوئی لفظ چن لیجیے اور اپنا مسئلہ حل کر لیجیے۔

ہاں یہ درست ہے کہ انہوں نے سماعت اور فن گفتار کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ہاں یہ بھی درست ہے کہ آواز و آہنگ کے کلاسیکل رموز ان کی انگلیوں کی پوروں پر رہتے تھے۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ لگن میں رچے ایک ملنگ اُستاد تھے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ بندوں کی محبت نے انہیں انسانی نفسیات کی پیچ در پیچ گتھیاں سلجھانے کا ملکہ عطا کیا تھا۔ یہ بھی غلط نہیں کہ ان کے اندر ایک الوہی آگ روشن تھی جسے انہوں نے ہر حجرو کے میں بیٹھ کر تقسیم کیا۔ افسانہ' سفرنامہ' ڈرامہ' ریڈیو' ٹی وی' زاویہ' محافل میں گفتگو۔ مگر یہ کتنوں کو معلوم ہے کہ افلاطونی شرارہ کس شعلے سے نو نما اور کون بتاتا کہ اشفاق احمد نے ایک دایہ ماں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ یہ کون بتاتا کہ جب وہ اپنی والدہ ماجدہ کا دودھ پیتے تھے تو ان کی والدہ ماجدہ کے وجود سے اللہ ہو کے نغمے پھوٹتے تھے۔ یہ کتنے لوگوں کو معلوم ہے کہ تہجد گزار' مطہر اطوار' بلند کردار' ازلی وفا شعار اور مصلّی کی راز دار ماؤں کی گودیوں کی خوشبو لے کر نکلنے والے دل اور دنیا پر راج کرتے ہیں۔ اپنے افکار' اظہار اور اعمال سے برسوں چاندنیاں لٹاتے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں اس دنیا میں کوئی اللہ والا سچ کا پرچار کرتا ہے۔ ایک عظیم ماں کے دودھ کی خوشبو آنے لگتی ہے لیکن ماں کی یہ خوشبو اور ماں کا یہ فقر ساری اولاد

میں سے بس ایک خوش نصیب کا مقدر بن سکتا ہے اور یقیناوہ خوش نصیب اشفاق احمد ہی تھے جن کی زندگی میں لوگوں نے انہیں چاہا' انہیں سراہا' انہیں سننا چاہا' ان کے اقوال پر عمل کرنا چاہا اور ان کو اپنی محفلوں کا دلدار بنایا۔

کوئی اک پل جیسا یا اک صدی جیسا ...... دیکھنا ہے کہ کیا کر کے گیا ...... کوئی ایسا تھا کہ مشکل اور مصیبت میں لوگ اس کا گھر ڈھونڈ تے تھے۔ کوئی ایسا تھا کہ حدیث مبارکہ کے بموجب دوست اور دشمن کو صحیح مشورہ دیتا تھا۔ اپنا وقت لوگوں کے لیے وقف کرتا تھا۔ آرام تج کے لوگوں کی محفل سجاتا تھا۔ پُر امید لفظوں کی خیرات بانٹتا تھا۔ سخن کی بھیک دیتا تھا۔ دعا کا تبرک بانٹتا تھا۔ کوئی ایسا تھا کہ لفظ مرہم تھے اور محاورے راہبر تھے اور اک بانٹنا رہے۔ افکار بانٹتا رہا۔ آسانیاں تقسیم کرتا رہا تو سمجھ لو کہ اللہ کا مرغوب بندہ تھا۔ مرغوب بندے جاتے ہیں تو پیچھے ایک نہ پُر ہونے والا خلا چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ دلوں کو جوڑنے کا ہنر جانتے تھے۔ گھروں کو جوڑنے کا گُر سکھاتے تھے۔ منزلیں سر کرنے کا سودا عطا کرتے تھے۔ میں اکثر کہتی شفتو بھائی! میں آپ کے ساتھ خط و کتابت کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کی تحریروں سے کچھ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ چمکار کر کہتے۔ ابھی نہیں جی بڑھاپے میں خط و کتابت کریں گے۔ ابھی بہت کام ہیں کرنے کے ...... میں انہیں ٹیلی ویژن پر دیکھتی اور سوچتی ابھی شفتو بھائی بوڑھے نہیں ہوئے ابھی خط و کتابت نہیں ہو سکے گی انہیں بولتے دیکھ کر کون سوچ سکتا تھا کہ کنوآں اندر سے سوکھ رہا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں تھی شفتو بھائی ...... بوڑھا ہونے سے پہلے جانا اور وعدہ نبھائے بغیر جانا ...... دیالو بابا! ساری شامیں لوگوں سے پوچھتی پھرتی ہیں ......

سب کے کام بناتے بناتے
کون گلی گئے شام!

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

13 ستمبر 2004ء

بابا تلقین شاہ

ڈاکٹر احسن اختر ناز

(احساس)

گھر میں ریڈیو کی آواز گونجتی تھی' تو تمام اہل خانہ ہمہ تن گوش ہو کر "تلقین شاہ" سنا کرتے تھے۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد والد صاحب اس پروگرام پر تبصرہ کرنے کے علاوہ اشفاق احمد کی باتوں کی تشریح بھی کیا کرتے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ اس پروگرام کے اہم کردار "ہدایت اللہ" کو وہ نصیحتیں کرتے ہیں' دراصل ریڈیو کے ذریعے دلچسپ انداز میں وہ نصیحتیں ساری قوم کو کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ سماجی مسائل کو وہ کمال حکمت سے زیر بحث لاتے ہیں اور ان کا حل بھی وہ خود ہی تجویز کرتے ہیں۔ ہندوستان کے آکاش وانی ریڈیو کے ساتھ ریڈیو پاکستان کی نفسیاتی جنگ میں اس پروگرام نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ جو باتیں وہ علامتی انداز میں 47 نمبر والوں کو کہا کرتے تھے' وہ دراصل بھارتی حکومت اور اس کے جارحانہ اقدامات کا جواب اور ان کی مذمت ہوتی تھی۔ یہ غالباً ریڈیو پاکستان سے مسلسل نشر ہونے والا واحد پروگرام تھا اور دنیا میں تیسرے چوتھے نمبر پر تھا۔ 42 سال تک یہ سامعین کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنا رہا' اس کے ماسٹر مائنڈ صرف اشفاق احمد ہی تھے۔ یہ ان کے ہمہ جہتی اور تخلیقی ذہن کی پیداوار ہوتا تھا۔

1971ء میں جب پاک بھارت جنگ چھڑی تو ہم سکول میں پڑھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ ریڈیو پاکستان کے محاذ پر دشمن کے خلاف صف آراء تھے۔ "دادو لوہار" کا کردار انہوں نے ہی تخلیق کیا تھا اور اس کے ذریعے وہ مخالف پر کاری ضربیں لگا رہے تھے۔ ان کے کالموں میں پوری قوم کی ترجمانی کی جاتی تھی۔ جنگی ترانوں کے بعد جس پروگرام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی' وہ یہی پروگرام تھا۔ سقوط ڈھاکہ پر تو انہوں نے چپ سادھ لی تھی۔ نہ جانے اصلی دادو لوہار کے دل پر کیا بیتی تھی' لیکن انہوں نے اپنا تلقین شاہ والا کردار پھر بھی جاری رکھا۔ ملک کے اکثریتی عوام کا واحد ذریعہ ابلاغ اس وقت ریڈیو ہی تھا۔ اس کے ذریعے انہوں نے پوری قوم کی مایوسی دور

کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جب گھر سے باہر نکل کر دیکھا تو پتہ چلا کہ پورے گاؤں میں کئی جگہ لوگ اکٹھے بیٹھ کر تلقین شاہ کا پروگرام سنتے ہیں۔ اس سے نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہیں' بلکہ علم و حکمت کی بہت سی باتیں بھی سیکھتے ہیں۔ گاؤں سے جب لاہور آئے تو لوگوں کو ملنے اور دیکھنے سے یہ بات مشاہدے میں آئی کہ اشفاق احمد یہاں بھی ان گنت لوگوں میں پڑھنے سے اور اپنے ٹی وی ڈراموں کی وجہ سے دیکھے بھی جاتے ہیں۔ انہوں نے جو اپنے بارے میں خود لکھا تھا کہ میں قارئین' سامعین اور ناظرین کا محبوب ہوں' بالکل درست لکھا تھا۔

لاہور آ کر ان سے بہت مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ غالباً پہلی ملاقات شعبہ ابلاغیات میں ہوئی' جب ہم طالب علم تھے اور وہ آپا بانو قدسیہ کے ہمراہ وہاں خصوصی لیکچر دینے آئے تھے۔ اس وقت ابھی وہ بابے نہیں بنے تھے۔ تنومند جسم کے ساتھ جوان نظر آتے تھے۔ بڑے تجسس اور اشتیاق کے ساتھ ان کی باتیں سنیں' کیونکہ ان کو پہلی بار براہ راست دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ ہماری مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ کوئی بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

اس کے بعد جب انجینئرنگ یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران 1987ء میں' وہاں کے ایک ادبی رسالے ''معمار'' کے لیے ان کا طویل پینل انٹرویو اُردو سائنس بورڈ کے دفتر میں جا کر کیا تو ان سے بہت سی باتیں کرنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس وقت وہ اسلامی تعلیمات اور تصوف کی طرف بہت راغب ہو چکے تھے۔ اس ملاقات میں انہوں نے بہت سی کام کی باتیں کیں۔ ہماری بہت سی ذہنی الجھنوں اور اشکال کو انہوں نے حل کیا۔ اس پہلی تفصیلی ملاقات سے ہمیں ان کی ہمہ پہلو شخصیت کا کچھ ادراک حاصل ہوا۔ وہ انفارمیشن' سیاست اور پروپیگنڈے کی تمام نئی صورتوں سے بخوبی آگاہ تھے اور اسلام' پاکستان اور انسانیت کے حوالے سے ان تمام باتوں کو اپنی فلاسفی اور نقطۂ نظر سے دیکھتے اور بہت خوبصورت و دلنشیں پیرائے میں ڈٹ کر اس کا اظہار کرتے تھے۔ ہمارے اس ادراک کا آغاز ان کا افسانہ ''گڈریا'' پڑھنے سے ہوا تھا جو سکول لائف سے لے کر بار بار پڑھنے پر ایک نیا مزہ اور درس دیتا رہا۔

اس انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ امن کا جو سب سے بڑا سبق ملتا ہے' وہ جمہوریت ہے۔ آپ جمہوریت سے آگے نہیں سوچ سکتے' حالانکہ اب تک آپ کے ذہن میں یہ بات آ جانی چاہیے کہ لعنت ہے ایسی جمہوریت پر' جس نے ابھی تک ہندوستان جیسی بڑی جمہوری مملکت کے لوگوں کو سکون عطا نہیں کیا' لیکن آپ نہیں کہہ سکتے' کیونکہ آپ کا ذہن اس انفارمیشن میں بندھا ہوا ہے' جو دن رات آپ کو فیڈ کی جا رہی ہے۔ آپ اس کی جگالی کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے کہ آپ اس کے خلاف بولنے کی جرأت کر سکیں۔

انہوں نے کہا کہ نئی ایجادات کے ساتھ ان کا لٹریچر بھی آتا ہے۔ اسی طرح بہت ساری خوبیوں کے ساتھ کچھ خرابیاں بھی آئیں گی۔ مثلاً دیکھیں جب ہمارے گھر میں ریفریجریٹر آیا تو وہ پہلا موقع تھا کہ جمعدارنیاں ہمارے گھر سے گوشت حاصل نہ کر سکیں' تو اخلاقی اقدار تو سو گئیں' یہ تو فطری عمل ہے۔ مادی ترقی کے منفی اثرات کا مقابلہ کرنے کا حل انہوں نے یہ بتایا تھا کہ آپ کے سائنس دان اور علماء دونوں مل کر بیٹھیں اور اس مسئلے کا حل نکالیں۔ اسی طرح اخبارات جب سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے سپلیمنٹ نکالیں تو Ethics & Morality پر بھی خصوصی ایڈیشن شائع کریں' جب کہ ہمارے ہاں معاملہ الٹ ہے۔ ہم وہتر اوھتر سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف لگے ہوئے ہیں اور اقدار و روایات کی بات نہیں کرتے۔ یہ امریکی سوچ ہے۔

جب ہم نے یہ پوچھا کہ کیا سائنسی ترقی کے ساتھ ذہنی سکون میسر آیا ہے' یا بے چینی میں اضافہ ہوا ہے؟...... تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ گرم پانی سے نہانے اور ٹھنڈے کمرے میں بیٹھنے والا اشفاق احمد ضروری نہیں کہ پُرسکون اشفاق احمد ہوگا۔ یہ تو ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ بادشاہ بھی ہمیشہ فقیروں کے پاس ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے جنگلوں میں جاتے رہے۔ اگر سکون محلوں میں ہوتا تو بادشاہوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ فقیروں کے در پر حاضریاں دیتے پھرتے۔ سکندر اعظم بھی دیو جانس قلبی کے پاس گیا۔ کبھی کوئی فقیر بھی اٹھ کر کسی بادشاہ کے پاس ذہنی سکون کے لیے گیا؟............ ہاں یہ ممکن ہے کہ انسان اس معاملے میں اس قدر ترقی کر جائے کہ اسے ذہنی

سکون کی ضرورت ہی نہ رہے یا پھر ایسے الیکٹروڈز بنا لیے جائیں جو دماغ کی بیٹری سے فٹ کر دیے جائیں اور ذہنی سکون حاصل ہو سکے۔

اپنے پروگرام ''تلقین شاہ'' کی طوالت کے بارے میں انہوں نے کہا کہ جب میں جوان تھا تو میرا خیال تھا کہ میں ایک بات کہوں گا تو لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ دو تین تلقین شاہ پیش کروں گا تو تبدیلی آ جائے گی' لیکن میرا خیال خام ہی ثابت ہوا۔ لوگوں نے اس میں سے بامقصد باتیں لینے کی بجائے اس کو ایک اچھے مزاحیہ تفریحی پروگرام کے طور پر لیا تفریحی انہوں نے میری باتوں کا اسی طرح لطف اُٹھایا' جس طرح ایک مزاحیہ کالم پڑھتے ہوئے اُٹھایا جاتا ہے۔

آپ اپنے ڈراموں اور پروگراموں میں طویل خطبہ کیوں دیتے ہیں؟ ..... تو کہنے لگے کہ میں چونکہ نئی بات کرتا ہوں تو مجھے اپنی بات سمجھانے کے لیے تقریر تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ اگر میں بھی مروجہ پیار و محبت کے قصے سنا دوں تو آپ کو محسوس نہیں ہوگا' اس لیے کہ آپ اس کے عادی ہیں' لیکن اگر میں وہ بات کہوں' جس کے آپ عادی نہیں ہیں تو آپ ضرور مجھے کاٹنے کو دوڑیں گے۔ مثلاً میرے ایک کردار نے سی ایس ایس پاس کیا ہے' جب وہ جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نعیمیہ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ کون سی تعلیم ہے' جو میں نے حاصل نہیں کی۔ میں تین سال مدرسے میں بھی پڑھوں گا تو یہ بات آپ کے لیے نئی ہے۔ آپ کو عجیب محسوس ہوئی ہوگی۔

یاد رہے جب لفظ فنڈامینٹلسٹ کی اصلاح کا بہت چرچا تھا امریکہ اور مغرب کا پروپیگنڈہ زوروں پر تھا تو اشفاق احمد ان دنوں اپنی ہی تقریر میں کہتے تھے کہ میں فنڈامینٹلسٹ ہوں' اس لیے کہ میری جو ماں ہے' وہ وہی ہے جو بہت بوڑھی ہو چکی ہے' اس کے چہرے پر بہت سی جھریاں پڑ چکی ہیں' بڑھاپے کی وجہ سے اس کے ہاتھ کانپتے ہیں' لیکن میری ماں تو وہی ہے نا۔ الزبتھ ٹیلر تو میری ماں نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ہی ''ملا میرا آئیڈیل'' جیسی تحریر لکھ کر ایک نیا حوصلہ دیا۔ دوسرا وہ یہ بھی کہتے رہے کہ ہم وہ بات فوراً سچ مان لیتے ہیں' جو ٹائم یا نیوز ویک میں چھپ کر ہمارے سامنے آتی ہے یا اب بی بی سی اور سی این این پر دکھائی اور کہی جاتی ہے۔ ہمیں ان ذرائع ابلاغ سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشفاق احمد نے بہت سے لوگوں کو لکھنا اور

بولنا سکھایا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ کی ایک محفل میں انہوں نے کہا تھا کہ ایک استاد کو اپنی پوری توجہ تعلیم اور تحقیق پر مرکوز کرنی چاہیے بجائے اس کے کہ وہ دنیا جہان کی سیاست کرتا پھرے۔ اسی طرح ہم ایک فتح یاب قوم کی حیثیت سے اکیسویں صدی میں قدم رکھ سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہمارے بہت زیادہ اصرار پر انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی پنجابی نظم سنائی تھی جس میں بہت بڑا سبق اور پیغام موجود تھا۔ وہ نظم کچھ یوں تھی کہ:

جے ایڈا مشہور نہ ہوندا

ایڈی میری تیں نہ ہوندی

جے میری وچ "میں" نہ ہوندی

وادی دے میں گھر وچ رہندا

تتی روٹی کھاندا

چلیے موبرے بہندا

ان کی بہت سی تقریریں بہت سے پروگرام تحریریں اور واقعات یاد آتے ہیں۔ نہ وہ خود کبھی مایوس ہوئے نہ انہوں نے کبھی دوسروں کو مایوس کیا' بلکہ ہمیشہ ایک نئی ہمت' ایک نیا ولولہ اور ایک نیا راستہ دکھایا۔ اپنے پروگرام "زاویہ" کے آخر میں دی جانے والی دعا کے مطابق وہ واقعی خلق خدا میں آسانیاں تقسیم کرتے رہے۔ ان کی فکر کے اثرات' ہمارے معاشرے کے کبھی جھٹلوں پہ بہت گہرے ہیں' جنہیں ان کے "بابے" پسند نہیں تھے۔ انہیں ان کی پاکستان سے اٹوٹ محبت بہت پسند تھی۔ وہ واقعی سبھی کی آنکھ کا تارہ تھے۔ ان کی باتیں اب بھی دلوں کی گرہیں کھولتی ہیں۔ ان کو بار بار سامنے آتے رہنا چاہیے۔ اسی طرح "بابا تلقین شاہ" ہمیشہ زندہ رہے گا اور پوری قوم کو تلقین کرتا اور نیا راستہ دکھاتا نظر آئے گا۔ خدا انہیں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔

روزنامہ پاکستان لاہور

13 ستمبر 2004ء

کاش اشفاق احمد جیسی کوئی اور شخصیت ابھرتی نظر آئے

جمیل الدین عالی
(نقار خانے میں)

دوسری و آخری قسط

پھر ٹی وی ڈراموں میں تو اس نے (اور سچ کہ ساتھ ہی بانو قدسیہ نے) ایک طرح ہی نئی ڈالی' کیا؟ انہوں نے بہترین جی ہاں بہترین ''تفریحی'' یعنی عناصر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ مقصدیت آمیز کرنی شروع کردی۔ یہاں تک کہ ابن انشاء جو ایک زمانے میں اپنے کالموں کے حوالے سے مارک ٹوین M. TWIN کی ذہنی غلامی میں چلا گیا تھا (ٹوین کا مقولہ خبردار جو اپنی تحریر کو کسی مقصدیت سے آلودہ ہونے دیا) اشفاق اور قدسیہ کی ''مقصدیت زدگی'' پر معترض ہوتا۔ اثبات میں ہی گردن ہلاتا رہتا۔ اس کے ٹی وی ڈرامے نہ جانے کتنے ہو چکے تھے ساتویں دہائی میں تو ٹی وی اسکرین پردہ اور بانو قدسیہ ہی چھائے ہوئے تھے مگر بانو کے سیریل کم ہوتے تھے اشفاق کے زیادہ 1) ایک محبت سو افسانے' 2) اور ڈرامے' 3) طوطا کہانی' 4) منچلے کا سودا' 5) اُچے برج لاہور دے سیریل' 6) کارواں سرائے' 7) قلعہ کہانی' 8) حیرت کدہ' 9) ننگے پاؤں لانگ پلے' 10) تاہلی تھلے ریڈیو پروگرام' (35 سال تک چلنے والے ''تلقین شاہ'' کے علاوہ) 46 مکمل ڈرامے اور 329 فیچرز اور چھوٹے ڈرامے..... اور سب کے سب کوالٹی یعنی معیاری کہلاتے تھے۔ (میں نے سب نہیں دیکھے' سب نہیں سنے مگر سب سے یہی رائے سنی) اور اس کے اوائل تحریر ہی کی ایک عظیم تخلیق' محض ایک افسانہ ''گڈریا'' آج بھی اسی شوکت و عظمت اور پیغام کے ساتھ زندہ ہے۔ کیا پیغام........ وہی کہ ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' میں نے غالباً 51-1950ء میں خود منٹو صاحب کو اپنے خاص تیکھے سرپرستانہ انداز میں کہتے سنا او ئے اشفاق

احمد تو گذر رہا جیسے دو افسانے لکھ گیا تو تیرا حشر خراب کر دوں گا۔ اشفاق بہت ذہین آدمی تھا مگر ڈر گیا۔ ''کیوں سر کیا بات ہے؟'' ''اوئے پھر میرا کیا ہوگا' اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار تو میں ہی ہوں نا'' .... ''اس میں کیا شک ہے ہم دونوں نے بمشکل اپنے اپنے خوف کی چادر سے سر نکال کر کہا ....

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی شادی کب ہوئی یہ مجھے یاد نہیں۔ نہیں یہ بقول کسے ایک پسند کی شادی تھی۔ دونوں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مصروف تھے۔ ملے ایک دوسرے کو جانا پہچانا اور شادی کر لی۔ اشفاق فیروز پور کے ایک نامور پٹھان خاندان کا مہاجر تھا۔ بہت صحت مند۔ میں نے اسے غالباً 1951ء میں دیکھا ہے۔ اس وقت لاہور میں چار مشاہیر نوجوان خوبصورت ترین کہلاتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال' اشفاق احمد' منیر نیازی اور فلمی دنیا میں سنتوش کمار (مسلمان تھے مجھے ان کا اصل نام یاد نہیں رہا) لیکن ان سب میں اشفاق احمد طرح دار سب سے زیادہ تھا۔ مجھ ناچیز کو بھی اس پر سخت رشک آتا تھا۔ شاید اس سبب سے میری اس کی ملاقات دوستی میں نہ بدل سکی۔ یوں بھی وہ نثر کا آدمی' میں نام نہاد شاعر۔ مجھے ناصر کاظمی کی صحبت زیادہ اچھی لگتی تھی۔ منیر نیازی کی جوانی بھی افسانوی ہیروز کی یاد دلاتی تھی مگر ان میں اس وقت بھی ایک بجٹر تھا وہی آج بھی ہے۔ زبان اس وقت بھی نہیں رکتی تھی' آج بھی نہیں رکتی۔ جسے جب جو چاہے باآواز بلند کہہ دیتے ہیں۔ میں اور میری یاد میں کوئی ان کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔

اشفاق نے پاکستان میں بھی پڑھایا روم جا کر بھی اُردو پڑھائی اور اطالین میں ڈپلومہ لیا۔ پروفیسر الیزہ بوزانی اس سے بہت سینئر تھے مگر اُردو کے عاشق اور طالب علم۔ دونوں میں ایک لازوال دوستی قائم ہوگئی۔ (شاید پروفیسر صاحب اب بھی زندہ ہیں)۔ مجھ سے دوستی گلڈ نے کرائی۔ وہ ہمارے پہلے انتخابات میں (1950ء) میں مغربی پاکستان ریجن کا سیکرٹری منتخب ہوگیا۔ مگر اس نے میری توقعات کے مطابق کام نہیں کیا۔ شاید وہ مجھ جیسوں کے چھوٹے چھوٹے انتظامی مطالبات کو ذرا اہمیت نہیں دیتا تھا' پھر جلد ہی گلڈ کے اگلے انتخابات آ گئے یعنی تاسیس سے چھ مہینے کے اندر اندر اس وقت اس نے پروفیسر وقار عظیم صاحب کے لیے مخلصانہ نویسنگ کی اور

جب وہ منتخب ہوئے اپنا جریدہ ''داستان گو'' چلانے میں مصروف ہوگیا۔ ممکن ہے وہ اس وقت بھی تصوف کا آدمی ہو مگر مجھ پر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ ہم دوست نہ تھے اعزازی شرکائے کار تھے اور ہمارے درمیان جناب قدرت اللہ شہاب ایک مضبوط پل کے طور پر قائم تھے۔ ہماری بعض خاصی سخت زبانی آویزشیں ان کی موجودگی میں ہوئی ہیں مگر ان کا انجام ہمیشہ شہاب صاحب کی مشفقانہ مسکراہٹوں پر ہوا ہے۔ وہ چپ بیٹھے ہماری بحثیں سنتے رہتے۔ بانو چولھے کے آگے بیٹھ کر ہمارے لیے بیسنی پراٹھے پکاتی اور حسب فرمائش کھٹی میٹھی لسی پلاتی میری بیوی بانو کے خوبصورت بال گوندھتیں دونوں ظہر تا مغرب نمازیں ساتھ پڑھتیں اور ہماری لڑائی کا مذاق اڑاتیں ......

''داستان گو'' پر اس نے بڑی محنت کی مگر وہ تجارتی طور پر ناکام ہوگیا۔ پھر نہ جانے کس سال اس نے ایک تجارتی طور پر ناکام فلم بنائی جس کی دیدہ ور لوگ تعریف بھی کرتے رہے۔ پھر وہ چند مہینے مزید ہفتہ وار ''لیل و نہار'' رہا۔ وہ کسی خاص مکتب فکر سے وابستہ نہ تھا اس نے ''لیل و نہار'' (پاکستان ٹائمز گروپ مارشل لا کی زد میں آنے کے بعد) میں بھی مدیری کی اور مدتوں بعد بھٹو صاحب مرحوم کو گرا دینے والے مارشل لا کے دور میں کسی بوگس قسم کی سرکاری مشیری بھی کی مگر یہ سب سیاست سے اس کے غیر سنجیدہ رویوں کی نشانیاں تھیں۔ بنیادی طور پر وہ سیاسی آدمی نہیں تھا گو سیاسی ادیبوں کے عتاب کا نشانہ بنتا رہتا تھا ...... ہاں جواب کم کم دیتا تھا۔ وہ تو اپنے اس مرض الموت کو موت تک سے چھپا کر رکھتا تھا۔

اُردو بورڈ ایک کارنامہ

اُردو بورڈ لاہور 1962ء میں دراصل شریف تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے نتیجے میں قائم ہوا تھا جس کا مقصد لاہور میں فروغ اُردو کا ایک سرکاری ادارہ قائم کرنا تھا۔ اللہ بخش شریف صاحب وفاقی ایجوکیشن سیکرٹری بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے خوش نہیں تھے مگر ان سے لڑ بھی نہیں سکتے تھے (بابائے اُردو کے آخری ایام) وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُردو کے سب کام مولوی صاحب کی فوقیت اور ان کی مرضی کے مطابق چلیں میں نے ان کے تیور اور طاقت اور مولوی صاحب کی بڑھتی ہوئی ناطاقتی دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ ایک انجمن قسم کا سرکاری ادارہ لاہور میں بھی قائم

کردیں جس میں وہ اپنی پسند کے افسران لا سکتے ہیں۔ اس کی تائید مصالح ملکی کی بنا پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مرحوم نے بھی کی جو شریف کمیشن کے نائب صدر اور حیدر آباد کے شیخ الجامعہ تھے۔ ہم نے ڈھاکہ میں بھی بنگلہ اکادمی کے ہوتے ہوئے ایک بنگلہ بورڈ قائم کرنے کی سفارش کی تھی' زیادہ انجمنوں میں زیادہ تنخواہ دار کارکن بھی چھپ جاتے ہیں اور قسمت اچھی ہو تو زیادہ تعداد اچھے رضا کاروں کی بھی دستیاب ہو جاتی ہے۔ اس اُردو بورڈ کے پہلے ڈائریکٹر مخدومی کرنل مجید ملک بنائے گئے جو اس وقت سری لنکا میں ہمارے پریس منسٹر تھے مگر ناخوش۔ اعزازی صدر مسٹر جسٹس عبدالرحمن جن کی اُردو دوستی اور فضیلت کے بابائے اُردو بھی قائل تھے۔ بہر حال اُردو بورڈ (اب سائنس بورڈ) کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ بتاتا یہ ہے کہ 1967ء تک اس بورڈ نے کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ 1967ء کے اوائل میں جب شہاب صاحب اپنا جبر اور سفارت ختم کر کے ہالینڈ سے واپس آ کر وفاقی معتمد تعلیم بنے تو انجمن ترقی اُردو کے حالات خراب ہونے کے باوجود ہم (بہ سرپرستی مخدومی و معظمی جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اُردو) اُردو اقامتی کالج اب وفاقی اُردو یونیورسٹی کا کلیہ سائنس) بنانے میں مصروف تھے۔ میں نے شہاب صاحب سے عرض کی کہ جب اُردو بورڈ بن ہی چکا ہے تو اسے ایک توانا اور متحرک ٹیم دے کر اُردو کے کام کو اپنے ہم انجمن اُردو کے لیے صرف انجمن پر ہی آپ کی مالیاتی محدودات کی آزمائش نہیں کرنی چاہیں گے (وزارت مالیات آج کی طرح اس وقت بھی اُردو کو اس کا حق دینے پر تیار نہ ہوتی تھی مقتدرہ بنی نہیں تھی) شہاب صاحب اور اشفاق احمد کی دوستی معروف تھی مگر اشفاق احمد انہیں امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ شکر ہے کہ میں دونوں کی ہچکچاہٹ پر حاوی آیا اور اشفاق احمد نے اپنے اعزازی اور محترم پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کی عملی رہنمائی میں کمال پر کمال کر دکھایا۔ یقیناً اس نئے بورڈ کے بعض اراکین بڑے دانشمند اور فاضل لوگ تھے۔

پیر حسام الدین راشدی' ممتاز حسن' ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ اور.......... میں بھی حاضر تھا وہاں.......... مگر اشفاق کی محیر العقول محنت کے بغیر بورڈ بہترین کتابیں (بلوغ الارب فی لسان العرب از علامہ شکری آلوسی) تیج نامہ مفت زبانی لغت وغیرہ) چھاپنے کے باوجود وہ کچھ نہ بن پاتا جو وہ آج ہے۔ اشفاق نے وہ کیا جو کسی ایسے سرکاری ادارے سے آج تک ممکن نہیں ہوا ہے۔ اس نے کتابوں (زیادہ سائنسی کتابوں) کے منافع سے کسی سرکاری امداد کے بغیر لاہور میں پل کے نیچے ایک معقول عمارت کھڑی کر دی جس میں اب بورڈ واقع ہے' اس کام کی مشکلات اور اہمیت صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ایسی شدید محنت اور کامیاب منصوبہ بندی کے امتحان میں

شریک بھی ہوئے ہوں ورنہ باتیں بنانے کا حق تو بنیادی انسانی حقوق کی رو سے سب کو ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتداً عرض کیا تھا اشفاق کی تخلیقی صفات محققین اور سیرت کتابوں کی مستحق ہے۔ میرے تو جو منہ میں آیا کہہ گیا ہوں۔ وہ ایک حیرت انگیز طور پر ہمہ صفات تخلیقی شخصیت تھا۔ میں اس کے تصوف اور تبلیغی انداز کو یا تو سمجھتا نہیں تھا یا اسے سمجھنے کے قابل نہیں۔ (میرا مسئلہ اپنے اتنے بڑے محبوب محسن جناب قدرت اللہ شہاب صاحب کے ساتھ بھی یہی تھا جس نے مجھے ان کے معاملے میں گنگ کر رکھا ہے) میں شہاب' اشفاق اور ممتاز مثلث کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جان کر یقین کے ساتھ کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ تینوں اچھے انسان تھے انسانوں کا بھلا چاہتے تھے اور استطاعت بھر انسانوں کی خدمت بھی کرتے تھے۔ یہ ایک ضرورت سے زیادہ سادہ بیانی OVER SIMPLISTIC بیان ہے لیکن تا حال مجھ میں اس سے زیادہ کی مقدرت نہیں۔ اس کے نئے ٹی وی ہفتہ وار ''زاویے'' کے بارے میں بھی میری یہی رائے کہ زاویہ تلقین شاہ کی طرح لاکھوں کروڑوں بے چین ناظرین کو متاثر نہیں کر سکا تھا ایک وجہ یہ بدلتے ہوئے حالات اور فروغ پاتی ہوئی تشکیک بھی ہو گی مگر زاویے کی ذہنی (روحانی) افادیت میں کلام نہیں۔ کاش کبھی اس کی تمام تخلیقات میں اس کی کبھی ڈھکی چھپی کبھی کھلی روحانی مقصدیت پر گفتگو ہو سکے۔ جیا تو کبھی بانو سے پوچھ کر ان لوگوں کے اس پہلو پر بات کروں گا..... انشاء اللہ۔

اکثر دنیائے ادب و دانش میں بڑی شخصیات کی موجودگی میں ہی انہی کے مقلدانہ سہی انہی جیسی ایک نہ ایک شخصیت ابھرتی ضرور نظر آ جاتی ہے..... افسوس میں یا میری کم نظری کہ میں اشفاق احمد جیسی دوسری کوئی نوجوان شخصیت ابھرتے نہیں دیکھتا۔ کاش میرے جانے سے پہلے کسی قدر تو ابھر جائے۔ بانو قدسیہ تو یقیناً ان کی جانشین بھی ہے مگر میں مستقبل بعید کی بات کر رہا ہوں۔ اشفاق احمد یقیناً ایک بڑا آدمی تھا (میں دعا کرتا ہوں کہ مجھے اور بہت کچھ لکھنے کا موقع ملے)

روزنامہ ''جنگ لاہور''

14 ستمبر 2004ء

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

اصغر ملک

(ریڈیو کالم)

ریڈیو پاکستان نے تخلیق کاروں' فنکاروں اور صداکاروں کو جب مائیکروفون پر لا کر عوام میں متعارف کروایا تو ان کے علم وفن سے متاثر ہو کر عوام نے اُن کو اپنے ملک کا اثاثہ گردانا اور جو اُن کو نہیں جانتے تھے ان کو احترام سے ملنے لگ گئے ان کی شبانہ روز محنت' اخلاق اور محبت کو دیکھتے ہوئے اُن کے گرویدہ ہو گئے جہاں اور بہت سارے لاجواب اور اپنے علم وفن میں دسترس رکھنے والی ہستیاں ریڈیو سے وابستہ ہو کر خدمت انجام دیتی رہیں وہاں اشفاق احمد کا نام بھی سرفہرست ہے۔ اُنہوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے فیچر اور کہانیاں تحریر کیں جو شاید کسی دوسرے رائٹر کے حصے نہ آئیں ہوں۔ اشفاق احمد کو اُردو' پنجابی اور انگریزی لکھنے اور بولنے پر ملکہ حاصل تھا اور جس زمانے پرانی بلڈنگ میں ریڈیو کا دیہاتی بھائیوں کا پروگرام نشر ہوتا اس میں عبدالطیف مسافر اور نظام دین حصہ لیا کرتے تھے۔ عروج پر تھا میں عبداللطیف مسافر کی ہفتہ وار چھٹی پر اور اشفاق' نظام دین کی چھٹی والے دن شیخ جی کا رول ادا کرتے اور اُستاد سلطان کھوسٹ ان دونوں کی غیر حاضری میں نوردین بنا کرتے اور اس پروگرام کی مقبولیت کے انڈیا والے بھی معترف تھے اس وقت کے سٹیشن ڈائریکٹر آغا بشیر احمد کی خواہش تھی کہ اشفاق احمد دیہاتی بھائیوں کے پروگرام میں باقاعدہ حصہ لیں لیکن انہوں نے مستقل حصہ لینے سے معذرت کر لی اور انہوں نے ڈرامے لکھنے پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی پھر جب اُنہوں نے مال روڈ ریگل کے پاس دفتر لے کر داستان گو نکالا تو ایک پرچہ مجھے بھی دیا جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے ریڈیو پروگراموں کے علاوہ انہوں نے فلم میں بھی طبع آزمائی کی اور ایک فلم دھوپ اور سائے کے نام سے بنا ڈالی جس کا میوزک محمد طفیل نیازی نے دیا تھا اور ان کا یہ تجربہ اتنا کامیاب نہ رہا چونکہ وہ فلمی ماحول سے اتنی آگاہی نہ رکھتے تھے کہ آرٹسٹ پیسے لے کر وقت پر شوٹنگ میں حاضر نہیں ہوتے جس کی وجہ سے انہوں نے اب اپنے

آپ کو الیکٹرانک میڈیا تک محدود کرلیا تھا۔ٹی وی آیا تو انہوں نے اس کے لیے بہت سے کھیل تحریر کیے جن میں اُچے بُرج لاہور دے' نا بلی تھلے' طوطا کہانی' ایک محبت سو افسانے' من چلے کا سودا' شاہلا کوٹ' حیرت کردہ وغیرہ بے حساب ڈرامے لکھے اور وہ کامیاب رہے۔ آغا بشیر احمد بھی ریڈیو سے ریٹائر ہو کر پی ٹی وی لاہور سینٹر پر بطور جنرل منیجر تعینات ہو گئے۔ انہوں نے آتے ہی 65 منٹ کا میلہ ٹی وی شروع کر دیا جس کے لکھاری اور روح رواں اشفاق احمد تھے اور اشفاق احمد نے مجھے بھی چند پروگراموں کے لیے ساتھ لگا لیا اور پروگراموں کو اتنے کمرشل نہ مل سکے جتنی توقع تھی لہٰذا یہ پروگرام تین ماہ بعد بند کر دیا گیا۔ اشفاق احمد اپنی ہی سوچ اور طرز کا آدمی تھا جس کو انہوں نے ہر حال میں قائم رکھا اور کچھ عرصہ بعد ریڈیو ہفتہ وار اُردو پروگرام تلقین شاہ شروع کر دیا جسے وہ خود تحریر کر کے اس میں تلقین شاہ کا کردار خود روہتک اور حصار کا لہجہ اختیار کر کے بولتے اور یہ پروگرام عوام میں بہت مقبول ہوا اور وہ اس میں ملکی سماجی برائیوں کے خلاف جہاد کے علاوہ انٹرنیشنل مسائل پر بھی بات کر کے انہیں زیر بحث لاتے۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ خان صاحب بیکانیر والا لہجہ آپ نے کیوں اختیار کیا ہے جب کہ آپ اُردو' پنجابی اور انگریزی زبانیں بولنے پر دسترس بھی رکھتے ہیں؟ تو کہنے لگے اُردو' پنجابی اور دیگر صوبائی اور علاقائی زبانوں کے پروگرام تو ہر سٹیشن سے روزانہ نشر ہوتے رہتے ہیں لیکن جب میں اُوڈوں اور ان کی عورتوں کو سر پر روڑی اُٹھائے مزدوری کرتے دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں خیال آتا کہ ان غریبوں کے لہجے اور انداز گفتگو میں کوئی پروگرام نہیں ہوتا اس لیے میں نے ان کے لہجے میں تلقین شاہ بن کر ان کو ملکی اور غیر ملکی حالات سے آگاہی کے لیے یہ انداز اپنایا تاکہ یہ لوگ بھی جان سکیں کہ حکومت ان کے لیے کیا کر رہی ہے۔ دیارِ غیر میں مزدور کو کیا تحفظ حاصل ہیں اور جب یہ اُردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہو گئے تو اس کے چند ماہ بعد میں کسی کام کے لیے اشفاق احمد کے پاس گیا۔

تو پتہ چلا صاحب نئی بلڈنگ کی تعمیر کا معائنہ کرنے گئے ہیں لہٰذا جب میں وہاں پہنچا تو اشفاق احمد سیمنٹ کی الماریوں کی شلفوں کے درمیان میں لوہے کی جالی رکھ کر ان کے اوپر سیمنٹ کا پلستر کر رہے تھے میں نے کہا" خان صاحب کیا یہ کام باقی رہ گیا تھا"؟ ہنس کر کہنے لگے" ملک

بھائی میں جب ان مزدوروں کو اینٹیں اُٹھا کر دوسری منزل پر لے جاتے دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ان کی مزید عزت بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہی لوگ ملک کی تعمیر کے معمار ہیں اور سرکار دو عالم ﷺ نے بھی محنت کشوں سے محبت کی ہے اور وہ ان کے ہاتھوں کو چوما کرتے تھے اور فرمایا کرتے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو تا کہ یہ خوش ہو کر دعائیں دیتا جائے اور آج بھی اُردو سائنس بورڈ کی بلڈنگ اشفاق احمد کی آمد کے لیے آنکھیں فرش راہ کیے اس جیسے درویش کی منتظر دکھائی دیتی ہے لیکن ہم جیسے فقیروں کو بھائی کہہ کر بھلائی کرنے والا شاید نہ مل سکے۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

اب ان جیسا رائٹر و براڈ کاسٹر شاید ہی الیکٹرانک میڈیا کو مل سکے۔ کسی خستہ حال کے بغیر کام تو بند نہیں ہو جاتا کام تو رواں رہتے ہیں لیکن کوالٹی نہیں ملتی اور عوام ان کی مثالیں دینے لگ جاتے ہیں۔

آج حال یہ ہو گیا ہے لوگوں نے کتاب سے ناطہ توڑ کر کمپیوٹر سے یاری لگالی ہے۔ اشفاق احمد کی انہی خوبیوں سے متاثر ہو کر حکومتِ پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز سے نواز رکھا تھا جہاں اب تلقین شاہ بھی ریڈیو کو خیر باد کہہ گیا ہے اور ٹی وی کا زاویہ بھی نشر مکرر کے طور پر شاید نئی کاشت نہ ہو سکے اسی لیے تو اشفاق احمد کی آخری تحریر ڈھنڈورا میں کہا گیا ہے "ڈھونڈ ان کو چراغ رخِ زیبا لے کر"

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور

14 ستمبر 2004ء

"منچلے کا سودا"

ساجد حسین ملک

(سلسلہ روز و شب)

اس وقت ہم علم و دانش کے بہت اونچے معیار پر ہیں لیکن ہماری زندگی ہماری تہذیب ساری انسانیت اور پوری مدنیت کی بقاء کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ ہم منطقی متجاوز پر خاش گر عذاب انگیز اور سفاک رویوں پر نظر ثانی کر کے انہیں معاہدہ حدیبیہ کی مرحمت آمیز اور شفقت انگیز عمل میں داخل کرنے کی جرأت کریں۔ اس عہد میں یہ ہے تو بڑا مشکل کام لیکن انسانی بقاء کے لیے اس پر توجہ دی جانی نہایت ضروری ہے۔

یہ اقتباس جس تحریر سے لیا گیا ہے اس کا عنوان بنجارے کی ہانک ہے اور اسے جناب اشفاق احمد مرحوم و مغفور نے اپنے ڈراموں کے مجموعے من چلے کا سودا کے پیش لفظ کے طور پر تحریر کیا ہے اس اقتباس سے جناب اشفاق احمد کی سوچ ان کی فکر ان کی دانش ان کی لگن ان کی تمناؤں ان کے پند و نصائح اور ان کے جذبوں کا اظہار ہوتا ہے جس کے سوتے سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات مقدس سے پھوٹتے ہیں۔

جناب اشفاق احمد جنہیں دنیا ایک عہد ساز ادیب بڑا قلم کار منفرد افسانہ نگار بے مثال ڈرامہ نگار درد مند ناصح اجلے دانشور روشن خیال فلسفی' باعمل عالم اور دیدہ بینا کے مالک صوفی کی حیثیت سے جانتی تھی عجیب بات یہ ہے کہ میرا ان کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں تھا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کوئی تعلق نہیں تھا کوئی راہ و رسم نہیں تھی لیکن منگل کی شام کو ان کی وفات کی خبر سن کر اور بے شمار لوگوں کی طرح مجھے بھی یوں لگا جیسے میرا کوئی انتہائی پیارا اور قریبی عزیز کوئی بزرگ' کوئی رہبر' کوئی رہنما' کوئی استاذ' کوئی مرشد' کوئی پیر' کوئی نور والا بابا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جناب اشفاق احمد مرحوم سے میرا کوئی ذاتی رابطہ نہیں تھا صرف ایک دن ان سے ملنے کا اتفاق ہوا غالباً اگست 1992ء میں ضیاء الحق شہید فاؤنڈیشن کے تحت مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق

شہید کی یاد میں اسلام آباد میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا اس میں جناب اشفاق احمد بھی مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو تھے۔ وہاں میرا عزیز محترم عرفان صدیقی کی عنایت اور ان کی معیت میں اشفاق صاحب سے ہوٹل کے کمرے میں مختصر وقت کے لیے ملاقات کا موقع ملا ان دنوں پی ٹی وی پر ان کی ڈرامہ سیریز من چلے کا سودا بھی آ رہی تھی۔ اشفاق صاحب اس کے بارے میں بھی کچھ دیر باتیں کرتے رہے میں ایک مودب سامع کی طرح سنتا رہا اشفاق صاحب کی عصمت دردمندی اور راست فکری کا جو خاکہ پہلے سے ذہن میں موجود تھا اس میں مزید نکھار آیا۔

جناب اشفاق احمد خان کے ڈرامے ایک محبت سو افسانے جب ٹی وی پر پہلی بار چلے تھے تو انہیں دیکھنے کا موقع نہ ملا کہ اپنے پاس کوئی ٹی وی سیٹ نہیں تھا تاہم دوستوں ساتھیوں سے ان ڈراموں کی بڑی دھوم سنی دو تین سال میں ان ڈراموں کو نئی ریکارڈنگ اور نئے کرداروں کے ساتھ کراچی سٹیشن سے دوبارہ ٹیلی کاسٹ کیا گیا تو انہیں ذوق و شوق سے دیکھا۔ ''طوطا کہانی'' کے ڈرامے جو غالباً اسی کی دہائی میں پیش کیے گئے انہیں شوق سے دیکھا لیکن ان کی ڈرامہ سیریز ''من چلے کا سودا'' جس ذوق و شوق اور لگاؤ سے میں نے دیکھا اس کا اندازہ مجھے خود ہی ہے اس سیریز کے ایک دو کردار تو میں آج تک بھلا نہیں سکا۔ ایک ڈاکٹر محمد حسین کا کردار جو فردوس جمال نے کیا اس کے مکالمے میں سنتا تھا تو آنکھوں میں آنسو آ جایا کرتے تھے۔ دوسرا بابا غلام دین کا کردار جو ڈرامے کی آخری قسطوں میں سامنے آیا تھا بابا غلام دین چٹا ان پڑھ تھا اسے نماز بھی پوری پڑھنی نہیں آتی تھی بڑی نیک پاک روح تھی چھ مہینے تک مولوی صاحب کے پاس نماز اور قرآن کا سبق پڑھنے بیٹھا رہتا ہے لیکن سوائے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کے اور کچھ پڑھنا نہیں آتا وہ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کے بعد قرآن کی سطروں میں شہادت کی انگلی پھیر کر کہتا ہے ایہہ میرے صاحب کا فرمان ہے ایہی سچ ہے ایہہ میرے مولا ایہہ ہی حق۔

''من چلے کا سودا'' کے ڈراموں میں بابا غلام دین کا کردار دیکھ کر میرا خیال اپنے والد حاجی ملک محمد خان مرحوم و مغفور کی طرف چلا جایا کرتا تھا وہ بھی چٹے ان پڑھ تھے قرآن پاک ناظرہ بھی پڑھنا انہیں نہیں آتا تھا لیکن اللہ رب العزت نے انہیں ایمان و یقین تسلیم و رضا صبر و شکر دانش و بصیرت اور توکل کی اعلیٰ صفات سے نواز رکھا تھا۔ پانچ سال قبل ستمبر 1999ء میں ان کا انتقال ہوا

تو میں نے ان کی یاد میں ایک مختصر سا مضمون لکھا جو نوائے وقت میں چھپا اس مضمون کے آخر میں میں نے جناب اشفاق احمد کے ڈرامے من چلے کا سودا کے کردار بابا غلام حسین کا حوالہ دے کر لکھا کہ اس وقت جب یہ ڈرامہ سیریز چل رہی تھی یہ کردار دیکھ کر بے ساختہ میرا خیال اپنے والد محترم کی طرف اٹھ جایا کرتا تھا اور اب جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں تو ان کو یاد کرتے ہوئے مجھے محترم اشفاق احمد کے ڈرامے من چلے کا سودا میں بزرگ بابے کا کردار یاد آ رہا ہے جو چٹا ان پڑھ تھا جسے قرآن پاک ناظرہ بھی پڑھنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اسے اپنے مالک اپنے رب کی رضا حاصل تھی۔

پانچ سال قبل والد محترم کی وفات پر جب میں نے جناب اشفاق احمد کے ڈرامے کا حوالہ دے کر یہ چند باتیں لکھی تھیں تو سچی بات ہے ان کا مقصد جہاں والد گرامی مرحوم و مغفور کو خراج عقیدت کرنا تھا وہاں جناب اشفاق احمد کی عظمت کو بھی سلام کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ڈراموں میں کیا خوبصورت اور اجلے کردار پیش کیے ہیں اور نور و بصیرت اور عقل و دانش کی باتیں کی ہیں۔

داستان سرائے ماڈل ٹاؤن لاہور کے مسافر جناب اشفاق احمد کے سفر آخرت پر روانگی کے بعد قابل قدر اور محترم قلم کاروں اور کالم نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے نوائے وقت میں محترم سجاد میر نے انہیں بڑے خوبصورت انداز میں الوداع کیا ہے۔ انہوں نے لکھا "الوداع اے روح عصر" الوداع میری مٹی کی پہچان الوداع الوداع' الوداع اب پھر کوئی ایسا داستان گو نہیں آئے گا۔ الوداع اے میرے داستان گو۔

برادر عزیز محترم عرفان بھٹی نے خراج عقیدت کا اظہار اس طرح کیا عجب شخص تھا افسانہ نگار ڈرامہ نویس شاعر سکرپٹ رائٹر دانشور حکیم فلسفی داستان گو' سفر نامہ نگار' لیکن اس کی یہ ساری حیثیتیں رنگ و بو کے مرقع کی طرح کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھیں بہت کچھ لکھنے اور بہت کچھ بولنے کے باوجود اس کی ذات میں عجب طرح کی پراسراریت تھی اور یہی اسرار اس کی شخصیت کا اعجاز تھا۔ ڈاکٹر محمد اجمل نیازی نے اپنی محبتوں اور عقیدتوں کا اظہار کرتے ہوئے لکھا" وہ اپنے ازل سے آشنا تھا اپنے ابد سے آشنا تھا وہ ازلی وابدی آدمی پھر ہماری اجڑی بجڑی دنیا میں نہ آئے گا وہ گلی کوچوں میں پڑے خاک نشین عام آدمیوں کی بات کرتا تھا اور بات کو اتنی بلندی پر لے جاتا تھا کہ سننے والا ہر آدمی اپنے آپ کو سربلند محسوس کرنے لگتا تھا وہ کہتا تھا کہ سکول ماسٹر میرا آئیڈیل ہے دور افتادہ جگہوں پر ڈیرہ لگانے والے بابے اس کے ہم سفر وہ نور والے بابے کی باتیں کرتا تھا اور

اس کی آنکھیں نظر کے آنے والے نور سے بھیگ جاتی تھیں۔

''جناح'' میں جناب یوسف عالمگیر کا ''گور پیا کوئی ہور'' کے عنوان سے لکھا کالم مجھے اچھا لگا اس میں انہوں نے جناب اشفاق احمد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے جناب اشفاق احمد کی ایک سچی بات یہ بھی ہے کہ آپ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ دنیا سے چلے جانا مرجانا تو نہیں ہوتا مرتے تو وہ ہیں جو کبھی زندہ نہیں رہے ہوتے ایک تو بھرپور جئے ہشاش بشاش اور باوقار شخص کی طرح آپ کا فن آپ کی خدمات کی یادیں صرف داستان سرائے میں ہی نہیں بلکہ ہر آنگن میں جگمگاتی رہیں گی۔

منگل سات ستمبر کی شام کو جب میں نے جناب اشفاق احمد کی وفات کی خبر سنی تو میں نے بڑے بیٹے سے کہا میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ مجھے اشفاق احمد کا دور ملا ان کی تحریریں اور کتابیں پڑھنے ان کے ڈرامے دیکھنے اور ان کی دانش بھری باتیں سننے کے مواقع ملے ان کے ریڈیو پروگرام کے کردار تلقین شاہ کی لوک دانش سے لبریز سیدھی سادی باتیں اور ان کے ٹی وی پروگرام زاویہ میں عام فہم انداز میں نور و بصیرت اور عقل و دانش سے بھرپور گفتگو میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ زاویہ میں ان کی گفتگو اور نور والوں کے ڈیرے کے تذکرے سن کر بعض اوقات میری آنکھیں بھیگ جایا کرتی تھیں اس پروگرام کے آخر میں دہرایا جانے والا ان کا یہ دعائیہ جملہ خدا آپ کو آسانیاں دے اور آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق دے۔ تو میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران اپنے رفقائے کار خواتین و حضرات کے رسمی یا غیر رسمی اجتماع میٹنگ میں اکثر دہرایا کرتا تھا۔ اللہ رب العزت کے حضور التجا ہے کہ وہ جناب اشفاق احمد مرحوم کے لیے آخرت کی منزلیں آسان فرمائے آمین ثم آمین۔

روزنامہ ''جناح'' اسلام آباد

14 ستمبر 2004ء

پی ٹی وی کے لیے اشفاق احمد کی خدمات

آسیہ علی، مریم احسان

اُردو ادب اور پاکستان ٹیلی ویژن کی دنیا میں اشفاق احمد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے تقریباً آغاز سے ہی اپنی خدمات سرانجام دینا شروع کر دیں جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ڈرامے محض تفریح اور وقت گزاری کے لیے تحریر نہیں کیے بلکہ ان کے ڈرامے سبق آموز ہوتے تھے پی ٹی وی کے ناظرین ان کے ڈراموں کے لیے ہفتہ بھر منتظر رہتے اُن کے ڈراموں میں کئی نئے چہرے منظر عام پر آئے اور جلد ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے اور آج ان کا شمار پاکستان ٹیلی ویژن کے نامور اور سینئر فنکاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں کو نئی راہ پر گامزن کیا اور ڈراموں میں ان کی طویل المدت خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انہوں نے پی ٹی وی کے تمام نامور اور نئے ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں کے ساتھ کام کیا جن میں سے چند ایک مقبول ڈراموں کا ذکر درج ذیل ہے: 1976ء میں ''ایک محبت سو افسانے'' میں ان کی تحریر کردہ سیریز شروع ہوئی جس کے ڈائریکٹر ''محمد نثار'' تھے۔ ''ڈرامہ 1980ء'' کے ڈائریکٹر یاور حیات تھے۔

''بندی گلی'' جس کی ہدایت کاری محسن رضوی نے کی اور اس کی کاسٹ میں شمع چوہدری، فوزیہ درانی اور فردوس جمال شامل تھے۔ 1983ء میں ڈرامہ ''ننگے پاؤں'' آن ایئر ہوا۔ جس کے ہدایت کار محمد نثار حسین تھے اور اس کی نمایاں کاسٹ میں خالدہ ریاست افضال احمد، محبوب عالم، عثمان پیرزادہ اور عظمیٰ گیلانی تھے۔ 1980ء میں ''برگ آرزو'' کی ہدایت کاری نصرت ٹھاکر نے کی۔ پھر ''متاعِ غرور'' منظر عام پر آیا۔ 1988ء میں ''دو دھاری تلوار''، ''ناتے دار''، ''دبی بٹی''، ''یزمان کا موچی'' آن ایئر ہوئے جس کے پروڈیوسر محمد عظیم تھے۔ یاور حیات کا ''فیصلہ''، نصرت ٹھاکر کا ٹونکا، راشد ڈار کا ''منچلے کا سودا'' محمد عظیم کا سراغ زندگی خاص مقبولیت کے حامل رہے۔

''میل ملاپ''، ''بہن بھائی''، ''حیرت کدہ'' کے ڈراموں کی ہدایت کاری طارق جمیل

نے کی۔ یاور حیات کا ''آدم زاد'' جس میں ماریہ واسطی' عاصم بخاری' عصمت طاہرہ نے کردار نگاری کی۔ اس کے علاوہ محمد عظیم کا ''نیلی چڑیا'' طاہر رضوی کا ''ایسی بلندی ایسی پستی'' دوست محمد کشکوری کا ''پیغام زبانی اور منیٰ'' نے مقبول عام کی سند پائی 2000ء میں کامیڈی تھیٹر میں ڈرامہ ''عشق پر زور نہیں'' کی ہدایت کاری اعظم خورشید نے کی۔

ان تمام ڈراموں کے علاوہ اشفاق احمد کا پروگرام ''زاویہ'' موجودہ دور میں نئی نسل اور بزرگان دونوں کے مابین یکساں طور پر مقبول رہا۔ جس میں وہ اپنے تجربے کے ذریعے لوگوں کو مستفید کرتے تھے۔

انہوں نے قائداعظمؒ کی شخصیت پر بھی ایک ڈرامہ تحریر کیا جس کا نام ''قائداعظم دستاویزی ڈرامہ'' جس کے ہدایتکار بختیار احمد تھے۔ اس کی نمایاں کاسٹ میں فردوس جمال محمود اسلم' عاصم بخاری' یمی راحیل' ثمینہ احمد' ماریہ واسطی' نجمہ واسطی' نعمان اعجاز' سلیم پاشا' رضوان بیگ اور شاہ گل شامل تھے۔

اشفاق احمد نے نہ صرف اُردو ڈراموں میں اپنی خدمات سرانجام دیں بلکہ 1977ء میں پنجابی ڈرامہ سیریل ''اُچے برج لاہور دے'' تحریر کیا جس کے ہدایتکار راشد ڈار تھے اور اس کی کاسٹ میں نذیر حسینی' ریاض محمود' تانی بیگم شامل تھے۔

اشفاق احمد نہ صرف ایک اچھے ادیب بلکہ قابل تعریف شخصیت کے بھی حامل تھے۔ انسان دوست تھے اور نئے آنے والے فنکاروں کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ پی ٹی وی کے نامور پروڈیوسر ''راشد ڈار'' نے اشفاق احمد کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ''اشفاق احمد فلسفیانہ انداز کے مالک تھے ان کا رجحان کمرشلزم سے ہٹ کر تھا اور ان کا پیغام عام آدمی کے لیے ہوتا تھا وقت کی پابندی کو ملحوظ نظر رکھتے تھے اپنے تحریر کردہ ڈراموں کی ریہرسل تک میں شرکت کرتے تھے۔ کسی بھی پیچیدہ بات کو آسان لفظوں میں بہترین طریقے سے سمجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انسان دوستی ان کی شخصیت کا اہم خاصہ تھی'' پی ٹی وی کے سینئر فنکار فردوس جمال کہتے ہیں ''اشفاق احمد پرکشش شخصیت کے حامل تھے روحانیت کا عنصر ان کی

شخصیت پر غالب تھا وہ اپنے ڈراموں میں فنکاروں کی ہر ممکن مدد کرتے تھے نئے آنے والے فنکاروں کی یادداشت کا امتحان لینے کے لیے اکثر اوقات ان کو طویل جملوں پر مبنی ڈائیلاگ ادا کرنے کے لیے کہتے تھے جس سے وہ ان کی فنکارانہ صلاحیت کا اندازہ لگاتے تھے۔''

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

14 ستمبر 2004ء

خان صاحب

ہارون الرشید

(ناتمام)

اشفاق صاحب واقعی صاحب کمال تھے پھر مبالغہ آرائی کی ضرورت کیا ہے۔ لفظ ان کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھل جاتے اور ایک کوزہ گر کی طرح جو صورت وہ چاہتے اس سے ڈھال لیا کرتے۔ حسن بیان کی سلطنت میں کم کوئی بادشاہ ہوتا ہے جو تحریر و تقریر دونوں اقالیم کا حکمران ہو، اشفاق صاحب یقیناً تھے اور کسی کلام کرنے والے کو اس میں کلام نہیں، پھر یہی نہیں کہ مسلمہ طور پر وہ ایک صاحب اسلوب تھے بلکہ اسلوب میں بڑی وسعت ہیں، وہ اس کی حدود میں رہتے ہوئے مزید تنوع پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے اور چاہتے تھے تو کبھی اس اسلوب سے اوپر بھی اٹھ جاتے، الگ بھی ہو جاتے، یہ صاحبان اسلوب اور اہل ہنر کیلئے بھی رشک کا مقام تھا۔

ادب کے اکثر طلبہ ان کے عالی قدر ہم عصر اور نقاد بالعموم متفق ہیں۔ کہ "گڈریا" ان کے ہنر کا شاہکار رہے؟ اگرچہ بعد میں کوزہ گر نے کچھ ایسے نقوش اور زاویے تلاش کر لئے، جن سے زمانہ زیادہ مرغوب اور زیادہ متاثر ہوا لیکن جہاں تک افسانہ نگار کے فن کا تعلق ہے "گڈریا" ایک عظیم تخلیق ہے نہایت فخر اور اطمینان کے ساتھ ہم اسے ہمیشہ باقی رہنے والے عالمی ادب کا حصہ قرار دے سکتے ہیں۔ قاری کی نگاہ کردار نگاری اور اسلوب پر گرفت ہی سے خیرہ نہیں ہوتی بلکہ وہ درد کی کسک کو بھی مسلسل اور متواتر محسوس کرتا ہے جو فنکار کے خلوص، انسان دوستی اور بے تعصبی کی مظہر ہے، پھر اس افسانے کا ماحول معجز نگار قلم نے در و دیوار تک کو زندہ کر دیا ہے اور کبھی محسوس ہوتا ہے کہ خان صاحب اسی میدان میں جمے رہتے تو شاید ہم ایک اور بھی زیادہ نادر اور کامران آدمی کو دیکھتے۔ کچھ ایسے اور شاہکار گردش لیل و نہار جن کی چمک کو دھندلا نہ سکتی۔ شاید وہ اردو ادب کو کچھ اور بھی ثروت مند کر سکتے لیکن پھر یہ سوال ذہن میں اترتا ہے کہ اگر انسان کی افتاد طبع ہی اس کی تقدیر ہے تو اظہار ذات کا ایک تمنائی اور ناموری کا ایک آرزومند گریز کیسے کرتا ہے۔ یہ تو صوفی کا کام ہے اور خان صاحب صوفی نہیں تھے۔ البتہ اہل صفا کے حاشیہ نشین اور ہم مجلس۔ گاہے ان

کے ساتھ گاہے ان سے پیچھے ہو جاتے ان سے ذرا پیچھے گردِ سفر میں محوِ سفر لیکن راہِ سلوک کے مسافر وہ نہیں تھے۔

اس شام درویش کو میں نے گم سم پایا اور حیرت ہوئی کہ وہ تو ہمیشہ سے بشاش، سیراب اور شانت تھے۔ اس سے پہلے کہ سوال کیا جاتا، خود ارشاد کیا: لوگ علوم و معارف مناصب کے آرزومند ہیں مگر ریاضت کرتے نہیں اور بھلا دیتے ہیں کہ قلب کو صیقل کرنے کیلئے دائم جستجو اور اپنے آپ سے دائم کشمکش درکار ہے۔ یہ بات ان کے بارے میں کہی جو کسی نہ کسی درجے میں قرآن اور سیرت میں جی لگاتے، بندگانِ خدا کی خوش دلی سے خدمت کرتے اور تہذیبِ نفس کو منزل جان کر حسد، غیبت اور بغض و عناد سے گریزاں رہتے میری جیسے لوگ جن کی جوتیاں سیدھی کریں۔ خان صاحب قادر الکلام تھے کئی زبانوں اور تہذیبوں سے آشنا مگر سب سے بڑا فیض انہوں نے اہلِ صفا سے پایا۔ معلوم نہیں...... کہ اجتماعی لاشعور کی دریافت کا عمل صاحبِ ہنر کے ہاں پہلے مفتوح پذیر ہوا اور وہ "بابوں" کی طرف متوجہ ہوئے یا کسی صاحبِ عرفان کی محفل سے فکر کی اس جہت کا آغاز ہوا یہ البتہ آشکار ہے کہ تب ان کی انفرادیت اس میں گندھی اور بالآخر اسی میں فروغ پذیر ہوئی۔ وہ اپنے عہد کے لکھنے والوں سے منفرد ہی نہیں ممتاز بھی ہو گئے کہ زمانے کی رو سے مرعوب ان میں اکثر امت کی معاملے میں اجنبی تھے، معذرت خواہ یا مخالف تہذیب سے مرعوب۔

اشفاق صاحب کا بابا "صوفی کے سوا کوئی اور نہیں" اگرچہ گاہے یہ لفظ وہ نیک طینت اور جہاندیدہ سیانوں کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں، جو اپنے تمدن کے مرکزی دھارے کا حصہ ہیں۔ اس سے اکتساب کرتے اور اس سے جڑے رہ کر فکر و عمل کی تخلیق میں آہنگ پیدا کرتے ہیں اور جس سے اکتساب کرتے جس سے خود فرد کی ذات میں بھی آہنگ اور حسن جھلکتا ہے اور وہ معاشرے کیلئے خیر کا ایک سبب بن جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خود ان کے اندر بھی ایسا ہی ایک "بابا" بن جانے کی آرزو برپا رہی۔

صوفی ایک دوسرا شخص ہے صوفی وہ ہوتا ہے۔ جو ٹھیک وقت پر فیصلہ کرے اور پھر ساری

زندگی اس فیصلے کو سونپ دے۔ تصوف ساری زندگی طلب کرتا ہے اور تنہائی طلب کرتا ہے۔ اپنے اور زندگی کے بارے میں غور فکر کیلئے اور اپنے آپ سے کشمکش کی حکمت عملی مرتب کرنے کیلئے حسین بن منصور حلاج نے کہا تھا اپنی تمام تر صفات کے ساتھ فنا کی آرزو اور تصوف علم نہیں عمل کا نام ہے۔ غیر معمولی قوت خیال اور متاثر کن جذباتی توازن کے اس عملی آدمی نے صوفیوں سے فیض پایا اور اس کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا۔ یاد پڑتا ہے کہ جنرل محمد ضیا الحق کو پہلی ملاقات ہی میں انہوں نے مبہوت کر دیا تھا اور کس کو نہ کیا۔ کبھی تو انکار کے خوگر بھی ان کے قائل ہو جاتے۔ آخری عمر ہی میں ممتاز مفتی بھی اہل عرفان کے قائل ہوئے اور ان سے فیض پایا اور قدرت اللہ شہاب تو تھے ہی، اپنے دھیمے پن اور انکسار کے طفیل لیکن آخری تجزیے میں یہ سب صاحبان کمال باغی اور انقلابی تھے اور نہ صوفی

لیکن وہ اہل ہنر تھے اور ادور ادب کی آبیاری میں ان کا حصہ گراں قدر ہے۔ ان کی خدمات اتنی زیادہ ہی تھیں کہ تحسین و آفرین کے پھول دیر تک برستے رہیں پھر مبالغہ آرائی کی ضرورت کیا ہے۔ اللہ نے خان صاحب کو اچھی زندگی عطاء کی اور ان کا انجام بھی بخیر ہوا۔ یوم حشر وہ ان پر اپنی رحمت تمام کرے، حسن الدنیا والآخرہ، یہ طالب علم کا گمان بھی ہے اور دعا بھی۔

روز نامہ جنگ لاہور

14 ستمبر 2004ء

بلبل ہزار داستان

عطاءالحق قاسمی

(روزن دیوار سے)

جو کالم میں 40 منٹوں میں لکھ لیتا ہوں وہ کالم لکھتے ہوئے مجھے کئی دن گزر گئے ہیں وہ مجھ سے نہیں لکھا جا رہا!

میں نے ہیوسٹن سے اپنے گھر فون کیا تو عمر بیٹے نے بتایا کہ اشفاق احمد انتقال کر گئے ہیں اور اس کے بعد سے امریکہ میں مقیم پاکستانی دوستوں کے فون آ رہے ہیں اور ہر کوئی یہ خبر اس انداز سے سنا رہا ہے جیسے وہ مجھ سے اس خبر کی تردید سننے کا خواہشمند ہو مگر خبریں تو وہی صحیح نکلتی ہیں جو اپنے اندر گہرے دکھ اور لمبی اداسی کا سامان لیے ہوں! سو یہ خبر بھی درست ہے۔ اشفاق احمد انتقال بھی کر گئے ہیں اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انہیں منوں مٹی تلے دفن بھی کیا جا چکا ہے۔ یہ مٹی بھی کتنی بے خبر ہے اس کی بہت اڑانے والے اس کے سینے پر مونگ دلتے پھرتے ہیں اور اسے خاک شفا سمجھنے والے اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے والے اس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں انہیں ڈھونڈتی ہیں کان ان کی آواز سننے کو ترستے ہیں ہونٹ انہیں چومنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے اور ان کے درمیان کتنے ہی پردے حائل ہو گئے ہیں۔ چراغ رخ زیبا بھی لے کر نکلیں تو وہ ہمیں نظر نہیں آئیں گے۔ بس انہیں دیکھ لیا جتنا دیکھنا تھا۔

اشفاق احمد بظاہر ہماری ہی طرح کے ایک عام انسان تھے یعنی ہنستے بولتے تھے چلتے پھرتے تھے کھاتے پیتے تھے مگر وہ ہم جیسے کہاں تھے۔ مجھے تو کبھی کبھی شبہ گزرتا تھا کہ وہ ایک جن ہیں اور انسانی شکل میں ہمارے درمیان رہتے ہیں یا ایک عامل ہیں جو بڑے سے بڑے جن کو قابو کر کے اسے اپنا معمول بنانا جانتے ہیں۔ ''گڈریا'' جیسا شاہکار افسانہ لکھنے والا شخص جب ایک عام آدمی کے لیے لکھنے بیٹھتا تو اشفاق احمد سے تلقین شاہ بن جاتا' اس نے دانشوروں کو بھی اپنی دانش سے زیر کیا اور وہ عام انسانوں کو بھی تہہ دام لایا۔ اس نے ٹی وی کے لیے ''ایک محبت سو

افسانے'' اور'' اور ڈرامے'' لکھے تو عوام وخواص دونوں کو متاثر کیا'' زاویہ'' شروع کیا تو ان سے اختلاف رکھنے والے بھی پوری دلچسپی سے یہ پروگرام دیکھتے رہے۔ اشفاق احمد ادبی و ثقافتی تقریبات میں اظہار خیال کے لیے لب کھولتے تو بڑے بڑے لسان ان کے سامنے گونگے نظر آنے لگتے۔ دوستوں کی محفل میں ہوتے تو ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' ایسی کیفیت نظر آتی۔ اشفاق اور بانو آپا گھر پر ضیافت کا اہتمام کرتے تو منظر ایک دفعہ پھر بدل جاتا۔ اشفاق احمد لان میں کباب بنا رہے ہوتے اور بانو آپا باورچی خانے میں روٹیاں پکا رہی ہوتیں۔ وہ ایسے مواقع پر بزرگوں کے اندر کا بچہ بھی جگانے کی کوشش کرتے چنانچہ ایک دفعہ ایک ایسے ضیافت کے موقع پر ''میوزیکل چیئر'' کا کھیل بھی کھیلا گیا۔ اس موقع پر کیسے کیسے ثقہ دانشوروں کو بچوں کی طرح میوزک رکنے پر کرسی کی طرف جھپٹے دیکھا گیا۔

اور میں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ عید کے روز میں اپنے بیٹوں یاسر' عمر اور علی کے ساتھ اشفاق احمد اور بانو آپا سے ملنے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ان کی رہائش گاہ ''داستان سرائے'' گیا تو تھوڑی دیر بعد تین ملنگ اندر داخل ہوئے۔ ہاتھوں میں کڑے' گلے میں مالا' جسم پر سیاہ چادر۔ آتے ہی اشفاق احمد کے پاؤں میں بیٹھ گئے اور اپنے اس گرو کی ٹانگیں دبانا شروع کردیں۔ مجھے علم تھا کہ اشفاق احمد کے عقیدت مندوں میں بہت اضافہ ہو چکا ہے لیکن یہ علم نہیں تھا کہ باقاعدہ پیری مریدی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے مگر یہ پیری مریدی وہ نہیں تھی جس کے بدنما مظاہر ہمیں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ جو چیلے اشفاق احمد کے قدموں میں بیٹھے تھے ان میں ایک، یحییٰ خاں نام کا چیلا بھی تھا جو جہاں گرد ہے اور کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ گرو اور چیلے کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ بہت وکھری ٹائپ کی تھی۔ اشفاق احمد کا تصوف عام ڈگر سے ہٹ کر تھا اور ان کے چیلے بھی اپنے رویئے میں عام ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے۔

اشفاق احمد بنیادی طور پر داستان گو تھے ان کے ڈرامے ان کی گفتگو' ان کے بابے تقریروں میں پیش کیے جانے والے ان کے اعداد و شمار یہ سب ان کی داستان گوئی ہی کا حصہ تھے۔ وہ ہر بات تخلیقی سطح پر کرتے تھے۔ اور اسے ڈرامائی موڑ دیتے تھے چنانچہ عام اخباری رپورٹر ان کی

جو تقریر رپورٹ کرتے وہ اصل روح سے مختلف ہوتی۔ اشفاق احمد پر اس حوالے سے بہت اعتراضات ہوتے مگر وہ ''کج شہر دے لوک وی ظالم سن' کج مینوں مرن دا شوق وی سی'' کے مطابق اگلے ہی دن کوئی اور ''متنازعہ'' بات کہہ دیتے حالانکہ ان کی باتوں سے جزوی اختلاف تو ممکن تھا مگر بنیادی اختلاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً اگر وہ کہتے تھے کہ پاکستان کو پڑھے لکھے لوگوں نے برباد کیا ہے تو ان میں کون سی بات غلط تھی۔ اس کی معاشی پالیسیاں داخلہ پالیسیاں اور خارجہ پالیسیاں آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے ''ٹیکنو کریٹس'' ہی بناتے رہے ہیں۔ کسی نتھو خیرے نے تو یہ پالیسیاں نہیں بنائیں۔ یا اگر وہ کہتے تھے کہ کاشتکار' ترکھان' لوہار' موچی کو ان پڑھ نہ کہو کیونکہ اپنے شعبے میں ان کا علم ان شعبوں کے کسی پی ایچ ڈی سے کم نہیں ہے۔ تو اس میں بھی اختلاف کی کہاں گنجائش تھی؟ اسی طرح مغربی تہذیب وتمدن پر تابڑ توڑ حملوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ شاید اس تہذیب کے قابل قدر پہلوؤں سے انکاری ہیں۔ شاید ایسا نہیں تھا۔ وہ غالباً صرف بے پناہ مرعوبیت کو کم کرنا چاہتے تھے ممکن ہے ان کی سوچ یہ ہو کہ ایک انتہائی سوچ کو دوسری انتہائی سوچ کے ذریعے معتدل بنایا جا سکتا ہے تاہم اس حسن ظن کے باوجود مجھے اس سلسلے میں ان سے کم کم ہی اتفاق ہوتا تھا۔

آخر میں مجھے ان کی اس ''وصیت'' کا ذکر کرنا ہے جس کا اظہار انہوں نے ایک دفعہ میرے سامنے کیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی قبر پر ڈھول کی تھاپ پر درویش رقص کریں' میرے خیال میں اگر وہ یہ بات نہ بھی کہتے ان کے عقیدت مندوں نے یہی کرنا تھا وہ بہت برسوں سے ریاضت اور عبادت کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ ان کی دانش انہیں اسلام اور پاکستان سے محبت سے روکتی نہیں تھی۔ ان کی بعض تشریحات سے اختلاف ممکن تھا مگر ان کا وجود ان بدنیت دانشوروں کے لیے ایک چیلنج بن چکا تھا جو اسلام کی ضد میں پاکستان کی نفی بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ اس میں بہت سا قصور اسلام کے ان نام نہاد داعیوں کا بھی ہے جو ڈنڈا ہاتھ میں لیے ہر اس شخص کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کے اسلام کی تعبیر سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسلام کو وسیع معنوں میں ایک سیکولر مذہب سمجھتا ہے۔ اشفاق احمد تمام مذاہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ بہت سے

مذاہب کے بانیوں کا دل سے احترام کرتے تھے۔ بہت سے مذاہب کے بانیوں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ قرآن میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے صرف چند ایک کا ذکر آیا ہے چنانچہ ممکن ہے یہ ہستیاں بھی اللہ کی فرستادہ ہوں اور ان کے پیروکاروں نے ان کی تعلیمات کی شکل مسخ کر دی ہو۔ میں نہیں جانتا اس وسیع المشرب انسان کا جسد خاکی کس قبرستان میں دفن کیا گیا ہے اور وہاں درویشوں نے ابھی علم لہرائے ہیں کہ نہیں اور انہوں نے پاؤں میں گھنگھرو باندھے ہیں کہ نہیں مگر میرے کانوں میں اس بلبل ہزار داستان کے وجد آور نغموں کی تھاپ ابھی سے سنائی دے رہی ہے اور میری روح ان پر رقص کرنے کے لیے بے چین ہے!

روزنامہ جنگ' لاہور
15 ستمبر 2004ء

سارہ اینڈرسن کے نام

نوٹ: 26 ستمبر 1992ء کو روزنامہ "خبریں" کی اشاعت کے موقع پر مرحوم اشفاق احمد نے خصوصی کالم لکھا تھا. یہ کالم ہم دوبارہ قارئین کی نذر کررہے ہیں۔

مجھے لاہور آئے ایک مہینے سے اوپر ہو چکا ہے اور میں یہاں کے تہذیبی' مذہبی' اقتصادی' سیاسی اور علمی جغرافیے سے کافی حد تک واقف ہو چکا ہوں۔ لوگ یہاں کے خوش فکر' ملنسار' دبنگ اور طرحدار ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور اپنے سے بڑا کسی کو نہیں سمجھتے۔ ہر ایک کے ساتھ ہنس بول کر ملتے ہیں اور دوسروں کو برتے پر خوش وخرم رہتے ہیں۔ اپنا نقصان نہیں کرتے اور دوسروں کے ضرر پر رنجیدہ نہیں ہوتے۔ بڑے زندہ دل قسم کے لوگ ہیں۔ میلے ٹھیلے اور جلسے جلوسوں کے شوقین ہیں۔ حکومتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ہلے گلے کے عاشق ہیں' اس لیے ضبط و نظم کو ناپسند کرتے ہیں۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے ہیں اور اپنے ملک سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں میرا مشن کسی حد تک مشکل ہو گیا ہے' لیکن میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں یہاں بھی اسی طرح کامیاب ہوں گا' جس طرح اپنے پچھلے مشنوں میں ہوا تھا۔

افغانستان میں میرے مشن کی ناکامی کی وجہ میری کمزور پلاننگ نہیں تھی' بلکہ وہاں کے لوگوں کی مغربی تعلیم سے بے بہرگی تھی' وہ ایسے ان گھڑ' ان ایجوکیٹڈ' ناتراشیدہ اور بے خوف سے لوگ ہیں کہ ابھی تک ان کی سرزمین پر احساس کمتری کی بیماری وارد ہی نہیں ہوئی۔ ہماری ساری برتری اور سپیریریٹی کو وہ "چہ خوب" سا کہہ کر گزر جاتے ہیں اور اس کے عشق میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لوچانا آندرینی نے البتہ کابل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اپنی سیٹی پر لگا لیا تھا اور ان سے اسلام اور پسماندہ افغان معاشرے پر چند نعرے لگوائے تھے' لیکن مجھ سے تین سال کی مدت میں یہ بھی نہ ہو سکا۔

روس نواز نوجوانوں کو میں اپنے کھاتے میں ڈال کر اپنی کارکردگی کی رپورٹ ضرور بھجوا دیتا تھا کہ اور کچھ نہیں وہ اپنے مذہب سے تو کٹ چکے ہیں۔ ان کی سوچ تبدیل ہو چکی ہے اور وہ ایک دوسرا انداز زیست اختیار کر چکے ہیں' لیکن میں اندر سے بالکل خوش نہیں تھا۔ ان نوجوانوں کی دھار الٹی طرف تو جا رہی تھی' لیکن ہمارے مشن کے مطابق نہیں جا رہی تھی۔ لوچانا آندریئی ان دنوں الجزائر میں ہے اور بہت ہی مشکل ماموریت میں گھری ہوئی ہے۔ وہاں اسے مسلمانوں کو جمہوریت کے خلاف ابھار کر ایک نیا سبق دینا ہے۔ یہاں وہ جمہوریت کے حق میں خاص طور پر پارلیمانی جمہوریت کے حق میں' لوگوں کو ٹرینڈ کرتی رہی ہے۔ ہم بری طرح سے گر گئے ہیں۔ ایک مسلمان ملک میں ہم مغربی جمہوریت لانا چاہ رہے ہیں۔ دوسرے سے لے جانا چاہ رہے ہیں۔ عجب طرح کا سرکس ہے۔ تماشا بھی دکھانا ہے اور تنبو بھی اکھاڑنا ہے اور دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے ہیں۔ وقت کم ہے اور وزن بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر تم سنٹر میں کسی کو بتاؤ نہیں تو ایک خفیہ خبر دوں کہ لوچانا کو ایک الجزائری مسلمان سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ عمر میں اس سے چار سال چھوٹا ہے' سکول میں پڑھاتا ہے' بہتر گھنٹے سائیکل چلانے کا انعام حاصل کر چکا ہے۔ چودہ سال عمر سے تہجد پڑھ رہا ہے۔ تتلا کر بات کرتا ہے اور محلے کی مسجد میں صبح کی اذان دیتا ہے۔ لوچانا نے مجھے اس کا نام بھی بتایا ہے' لیکن میں اسے فی الحال تم پر ظاہر نہیں کروں گا۔

مجھ سے پہلے جب لوسی یہاں تھی' تو اس کے بھی ایک پاکستانی نوجوان سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ لیکن ان کے تعلقات ولایتی قسم کے تھے' کیونکہ اس لڑکے کے والدین ایسے تعلقات کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ گو اس نوجوان کے والدین کچھ خاص پڑھے لکھے نہیں تھے' لیکن ان کا کاروبار بہت وسیع تھا اور وہ اسلام آباد کے سفارتخانوں کو بجلی کا سامان فراہم کرتے تھے۔ ان کا بیٹا تین مرتبہ بی اے میں فیل ہو کر اب ٹرانسپورٹ کے بزنس میں ہے۔ اس وقت ٹرکوں ٹرالروں کے علاوہ اس کے تین بیلی کاپٹر کپاس پر سپرے کا کام بھی کرتے ہیں۔

اس کا خیال ہے کہ جونہی کوئی ایم این اے فوت ہوا' میں اس کی سیٹ پر ضمنی انتخاب لڑوں گا' خواہ وہ سیٹ کہیں کی بھی ہو۔ یہ مت سمجھنا سارہ! کہ میں اپنے مشن میں ڈوب کر تم کو بھول

گیا ہوں۔ تم تو میری زندگی کا پہلا اور آخری سہارا ہو' لیکن جس کام کو ہم نے پکڑا ہے' اسے بھی انجام تک پہنچانا ہے۔ خدا زندہ و سلامت رکھے بی بی سی کو جو ایک چھوٹے سے کمرے میں اتنی دور بیٹھ کر عالم اسلام کو بھڑ کا تا رہتا ہے اور مسلمانوں میں عزت نفس اور خود اعتمادی پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اب گزشتہ اڑھائی مہینے سے ریڈیو جرمنی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا ہے اور دونوں بھائی ایک دوسرے کو تقویت پہنچا رہے ہیں' لیکن ہم کو بھی تو کچھ کرنا ہے' جو اسلامی ممالک میں اس مشن پر مامور ہیں اور یہاں کے باشندوں کے درمیان رہتے ہیں۔

میری طرف سے نا مختتم محبت بھرے جملے

تمہارا

ہموزل

روزنامہ ''خبریں'' لاہور

15 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد...... چند یادیں

پوسٹ کارڈ واشنگٹن

خالد حسن

اشفاق احمد بھی چلے گئے اور جب انہیں ان کے محبوب شہر لاہور کی مٹی کے اندر اتارا گیا' تو ان کے ساتھ اس چیز کو بھی دفن کر دیا گیا' جسے ان کے گرو سعادت حسن منٹو افسانہ نگاری کا فن اور راز کہا کرتے تھے۔ ان کے ابتدائی افسانے آزادی کے بعد شروع شروع کے زمانے میں منظر عام پر آئے ہیں۔ حالانکہ سوائے اپنی تحریروں کے وہ باقی سب کی تحریروں میں کیڑے نکالتے تھے۔ وہ اشفاق کو پسند کرتے تھے اور ان کی تعریف کرتے تھے (ایک ایسی چیز جو وہ شاذ و نادر ہی کرتے تھے)۔ ایک عمدہ نثر لکھنے والے کی حیثیت سے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے' جو کوئی کہانی اپنے انداز کے ساتھ سنا سکے' جس طرح اس کہانی کے سنائے جانے کا حق ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں کا مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" رگ و پے میں ایک عجیب سی لہر دوڑا دیتا تھا۔ اگر آپ اسے آج بھی پڑھیں' تو اس میں آپ کو محبت کی چند ایسی انتہائی دلگداز داستانیں ملیں گی' جو اُردو زبان میں اب تک لکھی گئی ہیں (مثال کے سور پر "برندا بن کی کنج گلی میں")۔ اے حمید' ایک اور نوجوان ادیب' جو انہی برسوں میں مقبول ہوئے تھے' خصوصاً نوجوان نسل میں' نے بھی اپنے پہلے مجموعے "منزل منزل" کے ساتھ ایک بڑا معرکہ مارا۔ اشفاق اور اے حمید دونوں عمر کی تیسری دہائی میں تھے' دونوں مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجر تھے اور دونوں اگلے 55 سال تک حیرت انگیز طور پر تخلیقی صلاحیتوں کے حامل بنے رہے۔

اشفاق تو چلے گئے' لیکن اے حمید ہمارے درمیان موجود ہیں۔ بارش ہو یا دھوپ وہ ہر روز کئی گھنٹے تک لکھتے ہیں اور ان کے کام کی مجموعی مقدار دماغ کو چکرا دیتی ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ان سے کہا جائے' تو وہ ایک دن میں ایک کتاب لکھ سکتے ہیں۔ آج جبکہ ان کے کروڑوں الفاظ چھپ چکے ہیں' مجھے یقین ہے کہ ایک لمحے کے پلے ان کے دل کی دھڑکن رک

جاتی ہوگی' جب وہ اپنے گم گشتہ امرتسر کے پس منظر کے ساتھ اپنی جوانی کی محبت کی اداس کہانیاں یاد کرتے ہوں گے۔

جنرل ضیاء الحق کی حکمرانی کے دور میں اشفاق احمد سخت تنقید کی زد میں آ گئے' کیونکہ بہت سے لوگ انہیں فوجی حکمران کا حمایتی سمجھنے لگے تھے۔ یہ شاید درست الزام نہیں تھا' لیکن جس چیز سے اس قیاس کو تقویت ملی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں کے ذریعے اس پیغام کی وکالت تھی کہ آدمی کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آتا ہے' اس میں خدا کی مرضی شامل ہوتی ہے اور یہ درست نہیں کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔ ان کے نقادوں اور ان لوگوں نے' جو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر چڑھانے والے کی وحشیانہ فوجی حکمرانی کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے' اشفاق کی منطق کو حکومت پر تنقید کا رخ موڑنے کی ایک واضح کوشش کے طور پر دیکھا۔ چاہے جو کچھ بھی پیش آئے' اگر اسے یہ سمجھ کر قبول کر لیا جائے کہ خدا کی مرضی یہی تھی' تو پھر کبھی کوئی تبدیلی یا انقلاب نہ آ سکتا۔ اشفاق کا نظریہ ایسا دکھائی دیتا تھا' جیسے کوئی سب کچھ خدا پر چھوڑ دے کہ وہی انصاف کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر جنرل ضیاء جابر ہیں' تو پھر عوام کو یہ معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس سوچ کا منطقی نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ لوگوں کو اپنی ننگی پیٹھ پر کوڑے کھانے چاہئیں۔ میں شاید مبالغہ آرائی کر رہا ہوں' لیکن اشفاق کو اور ان کی تحریروں کو میرے سمیت بعض لوگ ان دنوں اسی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ' ان کی برسوں کی جیون ساتھی اور سب سے زیادہ قریبی دوست 2001ء میں واشنگٹن آئے۔ انہوں نے بعد دوپہر کا وقت یہاں ہمارے چھوٹے سے گروپ کے ساتھ گزارا' جو پاکستان سے آنے والوں میں سے کچھ لوگوں کی میزبانی کرتا ہے۔ اشفاق سے پوچھا گیا کہ کیا انہیں علم ہے کہ ضیاء حکومت کے تاریک عشرے میں ان کے راضی برضا رہنے کے فلسفے کی وکالت' جس میں غیر قانونی فوجی حکمرانی بھی شامل تھی' نے انہیں بہت سے لوگوں کے نزدیک ایسا بنا دیا تھا' جیسے وہ ڈکٹیٹر کا دفاع کرنے والے اور مددگار رہوں؟ ایک صاحب نے کہا کہ اس کردار کا دفاع کرنا مشکل ہے' جو ان تاریک وقتوں میں انہوں نے اختیار کر رکھا تھا'

جبکہ اپنے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں کے ذریعے وہ لوگوں کے ذہنوں میں مسلسل یہ بات بٹھاتے رہے کہ جو بات اہم ہے' وہ ان کی باطنی زندگی ہے اور وہ سب کچھ اہم نہیں جو باہر ہو رہا ہے' جس میں وقت کی بدشکل اور جابر حکومت بھی شامل ہے۔ انہیں یاد دلایا گیا کہ انہوں نے یہ دلیل بھی دی تھی کہ حالات پر اعتراض کرنے سے روح کو تکلیف ہوتی ہے' کیونکہ حالات پر اعتراض کرنا خدا کی خوشنودی پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔ ان سے کہا گیا کہ زندگی کے متعلق اس قسم کا فلسفہ اخلاقی طور پر نا قابل جواز ہے۔

اشفاق احمد اس تلخ تنقید کو صبر و تحمل سے سنتے رہے اور جب ہم سب کچھ کہہ چکے' تو انہوں نے پر سکون آواز میں جواب دیا کہ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے متعلق کیا کہا جاتا تھا۔ دراصل کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو سرگوشیاں کرتے تھے کہ ضیاء الحق ہر روز انہیں نوٹوں کا ایک پیکٹ بھیجتے ہیں' یا یہ کہ انہیں پلاٹ دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ''میں نے اس وقت جو کچھ کہا تھا' اسے درست سمجھتا تھا اور آج بھی اسے درست سمجھتا ہوں۔'' انہوں نے مزید کہا ''میرا نہیں خیال کہ عوام کے مسائل کا جواب ان لوگوں کے ساتھ وابستہ ہے' جو بازاروں میں جلوسوں کی سربراہی کرتے ہیں' تاکہ وہ اقتدار میں آسکیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب انہیں اقتدار ملتا ہے' تو وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر لوگ اپنی باطنی زندگی پر توجہ مرکوز رکھیں اور روحانی زندگی میں خوشیاں تلاش کریں' تو ان کے دنیاوی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔'' کسی صاحب نے کہا کہ یہ مشکل ہوگا کہ بھارتی ظلم و جبر کے خلاف لڑنے والے کسی کشمیری کو یہ پیغام دیا جا سکے۔

مجھے یاد ہے کہ جس میٹنگ میں یہ تبادلہ خیالات ہوا۔ اس کی صدارت اکمل علیمی نے کی تھی' جو اشفاق کو اس وقت سے جانتے تھے' جب وہ ''امروز'' میں رپورٹر تھے۔ اکمل نے اشفاق اور بانو کو یاد دلایا کہ لاہور میں 40 سال سے زائد عرصہ پہلے وہ اکٹھے لاہور کے دور دراز مضافات میں ایک جگہ ایک بہت سادہ اور منکسر المزاج شخص کے سامنے بیٹھے اس کی باتیں سنا کرتے تھے' کیونکہ ہر شخص کو یقین تھا کہ وہ کوئی صوفی منش شخص ہے۔ اشفاق کو یہ اس طرح یاد تھا' جیسے یہ کل کی بات ہو۔ انہوں نے کہا ''میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ کوئی ایسی بات معلوم کر سکوں جو معمول

سے ہٹ کر ہو اور یہ کہ بالائی پرتوں اور لوگوں کے چہروں کے پیچھے کیا چیز پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایسے لوگوں کی تلاش رہی ہے' جن کی ایک باطنی زندگی ہو۔ میں انہیں بابے کہتا ہوں۔''

جن لوگوں کا خیال تھا کہ اشفاق کے بابوں کا تعلق ہماری ہی سرزمین سے ہے' انہیں اس وقت حیرت ہوئی' جب اشفاق نے بتایا کہ ان کا پہلا بابا کون تھا۔ یہ سال 1950ء تھا اور وہ ایک سکالرشپ پر روم میں تھے' جس میں اٹلی کے طالب علموں کو اُردو پڑھانے کا کام بھی شامل تھا۔ ایک روز ان کی یونیورسٹی میں ایک شخص لیکچر دینے آیا۔ اس کا نام الیگزینڈر فلیمنگ تھا' جس نے چند سال پہلے پنسلین ایجاد کی تھی۔ اشفاق نے یاد کرتے ہوئے کہا ''جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا' تو میں اس کے پاس گیا' اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے چوم لیا۔ وہ شاید اسے نہ سمجھ سکا' لیکن میں نے اس کی بیعت کر لی تھی۔''

اس روز اشفاق نے ہمارے ساتھ اپنی ابتدائی تخلیقات کے متعلق بھی باتیں کیں' ریڈیو میں گزارے ہوئے دنوں کے متعلق' ٹیلی ویژن میں اپنی آمد' اپنی کتابوں اور ''داستان گو'' کے متعلق ایک رسالہ' جو وہ پہلے سمن آباد میں اپنے چھوٹے سے گھر اور پھر مال روڈ سے نکالا کرتے تھے اور یہ کہ شب و روز کس طرح گزرتے گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ پاکستان کے عوام کے لیے بہت گہرا احساس رکھتے ہیں۔ انہیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان کی عزت نفس کی بحالی ہے۔ مشرقی پنجاب میں پاکستان کے کاز کے لیے احتجاج کرنے والے ایک نوجوان کی حیثیت سے وہ لوگوں کو بتایا کرتے تھے کہ پاکستان میں انہیں عزت و احترام ملے گا۔ ''یہی وہ چیز ہے' جو انہیں نہیں مل سکی۔ یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔'' اس روز انہوں نے کہا۔ بانو قدسیہ نے بھی بات کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں جس خوشی کا بھی تجربہ ہوتا ہے' دراصل ہمیں اس کا موقع فراہم کیا جاتا ہے' تاکہ ہم مایوسی اور دل شکستگی سے نمٹ سکیں۔

اشفاق احمد نے بتایا کہ وہ جن ''بابوں'' سے ملے ہیں ان کے متعلق ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ وہ دو سو صفحات لکھ چکے تھے' لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کب ختم ہو گی۔ تقریباً تین ہفتے پہلے جب اکمل اور میں نے انہیں فون کیا' کیونکہ مجھے کچھ شک سا ہوا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں'

میں نے ان سے پوچھا کہ ''بابوں'' کے متعلق ان کی کتاب کب مکمل ہوگی؟ ''صرف اس صورت میں اگر میں زندہ رہا'' انہوں نے کمزوری آواز میں جواب دیا۔ جو اس زوردار اور چست وتوانا آواز سے بالکل مختلف تھی، جس سے ہم ہمیشہ مانوس رہے ہیں۔ میں نے یونہی کچھ محسوس کیا کہ کتاب ادھوری رہ جائے گی اور ایسا ہی ہوا ہے، لیکن اس غیر معمولی شخص نے اپنے پیچھے کتنی بڑی بڑی تخلیقات کا ایک ذخیرہ چھوڑا ہے۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور
15 ستمبر 2004ء

گڈریا چلا گیا

مسعود اشعر
(آئینہ)

اس وقت جب میں اشفاق احمد کو یاد کر رہا ہوں تو سب سے پہلا سوال جو میرے دماغ میں کھلبلی مچا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اشفاق احمد نے جب افسانہ ''گڈریا'' لکھا تھا تو کیا وہ جانتے تھے کہ آخرکار وہ اپنے لیے بھی گڈریئے کا رول ہی منتخب کریں گے؟ ایک ایسا گڈریا جو بھیڑ بکریوں کو اکٹھا کر کے انہیں ذہنی اور روحانی غذا فراہم کرے گا؟ اور کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ جس افسانے اور اس افسانے کے جس کردار نے انہیں شہرت کی معراج پر پہنچایا وہی ان کی اپنی شخصیت اور اس شخصیت کی شناخت بن گیا؟ شاید ادب کے محقق کسی اور ایسی ادبی شخصیت کا کھوج نکال لیں مگر میری نظر میں تو کوئی اور ایسی شخصیت نہیں جس نے اپنی زندگی کو اپنے ہی افسانے کے ایک کردار میں ڈھال لیا ہو۔ اُردو ادب میں اشفاق احمد کی پہچان اسی افسانے سے ہوئی۔ یہ وہی افسانہ ہے جس نے سعادت حسن منٹو جیسے نک چڑھے افسانہ نگار کو بھی اشفاق احمد کی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس افسانے کا ''داؤ جی'' ایک مثالی کردار تھا (اور آج بھی ہے)۔ ایک ایسا آئیڈیل کردار جو شاید ہماری آج کی کاروباری دنیا میں نہیں مل سکتا۔ داؤ جی کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اپنا علم اور اپنی دانش دوسروں تک پہنچانا۔ رنگ، نسل اور مذہب کی تمیز کیے بغیر ہر دماغ کو علم کی روشنی سے منور کرنا۔ اشفاق احمد نے جب یہ افسانہ لکھا تھا ان دنوں وہ ایک کھلنڈرا اور چلبلا سا نوجوان تھا۔ اور یہ ایک فطری سی بات بھی تھی کہ چونکہ وہ خود بہت ہی خوبصورت تھا اس لیے اسے چنچل اور چلبلا ہونا بھی چاہیے تھا۔ سنہری بال، چھوٹی چھوٹی سنہری مونچھیں، گلابی شہابی رنگ، گٹھا ہوا جسم۔ اب ہمارا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ ایسا سجیلا نوجوان ''داؤ جی'' جیسے کردار کو اپنا آئیڈیل تو بنا سکتا ہے مگر خود داؤ جی نہیں بن سکتا۔ لیکن ہوا یوں کہ اشفاق احمد کے افسانوں کا یہ ابتدائی کردار ان کی اپنی زندگی کا حصہ بن گیا۔ اور پھر اسی کردار نے انہیں مرجع خلائق بنا دیا۔ اس کردار نے انہیں ایسی شہرت اور عزت دی کہ لوگ ان کے اصل کام (افسانوں) کو بھول گئے اور ایک صوفی، صافی اشفاق

احمد کے گرد جمع ہو گئے۔ یوں تو ان کے ساتھ اکثر ہی ایسا ہوتا رہتا تھا۔ لیکن میں صرف ایک واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔ انیس ناگی بہانے بہانے اپنے گھر ادیبوں کو جمع کرتے رہتے ہیں۔ ان محفلوں میں اشفاق احمد پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ شاید ایک برس یا اس سے بھی پہلے کی بات ہے۔ ہم سب انیس ناگی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ ایک صاحب اندر داخل ہوئے اور نہایت عقیدت کے ساتھ اشفاق احمد کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ کہنے لگے میں بلا اجازت اندر آنے کی معافی چاہتا ہوں مگر میں آپ کو اندر آتے دیکھا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ سوچا یہی موقع ہے کہ میں آپ کی قدم بوسی کرلوں۔ یہ ''زاویہ'' والے اشفاق احمد کی مقبولیت تھی۔ یعنی گڈریئے کی مقبولیت۔

لگتا یوں ہے کہ داؤ جی کے کردار کا بیج اشفاق احمد کے اندر شروع سے ہی پڑ گیا تھا۔ جس وقت تک اس بیج سے انکھوے پھوٹے اور وہ جھاڑے دار درخت بنا اس وقت تک اشفاق احمد علم کا سمندر کھنگالتے رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہر چیز کو جاننے' اسے سمجھنے اور پھر دوسروں کو سمجھانے کا جو شوق اور جستجو اشفاق احمد میں تھی وہ ہمیں اپنے آس پاس اور کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ جستجو انہیں کہاں کہاں نہیں لے گئی۔ پھر ان کے پاس قلم بھی تھا اور زبان بھی۔ وہ دونوں کے ہی دھنی تھے۔ اگر فکشن اور ڈرامے میں ان کی اپنی زبان' اپنا اسلوب اور اپنا بیان تھا تو بولنے میں بھی ان کے پاس وہ زبان اور وہ انداز بیان تھا کہ آپ لاکھ ان کے خیالات سے اختلاف کریں ان کی باتیں سن کر ان کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے پاس قصے کہانیوں کے دفتر کے دفتر تھے۔ ایک تو قصہ اور پھر ان کا طلسماتی انداز بیان۔ کوڑھ مغز سے کوڑھ مغز انسان بھی اس سے حظ اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن یہ سب باتیں اپنی جگہ۔ اشفاق احمد کی سب سے بڑی خوبی ان کا پیار' ان کی محبت اور ان کی شفقت تھی۔ یہ پیار چھوٹے بڑے سب کے لیے تھا۔ کسی امتیاز اور کسی تفریق کے بغیر۔ اس زمانے میں جب مذہب کو تفریق کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور مختلف فرقوں کے درمیان نفرت پیدا کی جا رہی ہے وہ سب کے لیے پیار و محبت کی بات کرتے تھے۔ ہر طبقے اور ہر فکر کے لوگ ان کی بات توجہ سے سنتے بھی اسی لیے تھے کہ وہ بات پیار کی مٹھاس سے لبریز ہوتی تھی۔

اب مجھے کتنی ہی محفلیں یاد آ رہی ہیں۔ ممتاز مفتی آئے ہیں تو اشفاق احمد اپنے ہاتھ سے کوئلوں پر کباب لگا لگا کر مہمانوں کو کھلا رہے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے آموں کی پارٹی کی ہے تو اشفاق احمد آم کھانے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اپنے گھر میں کبھی واصف علی واصف کو بلا رہے ہیں تو کبھی امریکہ سے آئے ہوئے کسی مینجمنٹ سائنس کے ماہر سے مکالمہ کرا رہے ہیں اور کبھی کسی جادوگر کے کمال دکھا رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے بیماری نے انہیں نڈھال ضرور کر دیا تھا مگر وہ بچہ آخر وقت تک ان کے اندر ہمکتا رہا جو داؤ جی سے ریاضی پڑھتا تھا۔

اب یہاں میں ایک نہایت اہم بات تو بھولے ہی جا رہا ہوں۔ وہ بات ہے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی جوڑی کی۔ یہ ایک مثالی اور ناقابل یقین قسم کی جوڑی تھی۔ ناقابل یقین اس لیے کہ ایک ہی گھر میں دو انتہائی کامیاب اور مشہور و معروف ادیبوں کا میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم زندگی گزارنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آتا ہے۔ ادب کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ اپنی تو جانے دیجیے انگریزی ادب میں ورجینیا وولف سے سلویا پلاتھ تک ایسی کتنی ہی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن یہاں ایسا نہیں تھا وجہ اس کی وہی پیار محبت کی فراوانی تھی۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ بانو آپا کی محبت زیادہ رفیع اور زیادہ وسیع تھی (اور ہے) تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا۔ بانو آپا کے پیار اور ان کی محبت میں عاجزی اور انکساری کی جو ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے وہی اس جوڑی کی کامیابی کا راز ہے۔ اور آج یہ جوڑی بچھڑ گئی۔ گڈریا چلا گیا۔ یوں تو یہ دکھ اس گڈریے کی تمام بھیڑ بکریوں کا بھی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اصل دکھ بانو قدسیہ کا ہی ہے۔ کہنے کو تو سب کہہ دیتے ہیں کہ ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں لیکن کوئی کسی کے ذاتی دکھ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ دکھ بانو آپا کا اپنا اور ذاتی دکھ ہے۔ بہت ہی گہرا دکھ۔ ہم تو صرف صبر کی دعا ہی کر سکتے ہیں۔

روزنامہ "جنگ" لاہور

16 ستمبر 2004ء

اشفاق بابا

عابد کمالوی
(صلائے عام)

خاکسار کو ریڈیو پروگرام ''تلقین شاہ'' اس لیے بھی پسند تھا کہ اس میں دو کرداروں کی پنجابی بھارتی ضلع ہوشیار پور اور انبالہ کی تھی یہ اضلاع میرے ''دادکوں'' اور ''نانکوں'' کے ہیں جو وہاں سے تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ہجرت کے مسائل ومصائب جھیلنے کے بعد پاکستان پہنچے تھے خاص طور پر والدہ یہ پروگرام باقاعدگی سے سنتی تھیں اور جب والد گرامی رحیم اللہ گفتگو کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ تلقین شاہ بول رہے ہیں ''گڈریا'' سے پی ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' تک کا سفر کامیابی وکامرانی سے طے کرنے والا ملامتی صوفی بلکہ بابا بھی ہم سب کو خیر باد کہہ گیا اشفاق احمد خاں کا معاملہ بھی یہ تھا کہ انہیں دنیاوی علوم پڑھا ہوا کوئی پیر فقیر متاثر نہ کرسکا۔ پیروں مرشدوں اور صوفیاء کے سلسلے میں ان کا اپنا نظریہ اور خیال تھا کیونکہ کسی بھی سائنسی ودنیاوی علوم کے لیے جب وہ تصوف وروحانیت کی تھیوری بھی پڑھ چکا ہو فوراً کسی کے حلقہ ارادت میں آنا ذرا مشکل ہوتا ہے ویسے بھی پنجابی کہاوت ہے...... ''پانی پیئے پن کے مرشد پھڑیے چن کے...... ''یعنی پانی صاف کرکے پینا چاہئے اور پیر چھان بین کے بعد پکڑنا چاہئے یہ خاکسار خود 22 سال تک کسی صاحب نظر کی تلاش میں رہا' شرط یہ تھی کہ جس دن والد گرامی قدر سے پارسا محتاط شخص ملا اسے مرشد مان لینگے اس تلاش کے دوران لاہور سے دور ہونے کی وجہ سے اسی سلسلے میں مرحوم واصف علی واصفؒ اور اشفاق احمد خانؒ سے بھی بذریعہ خطوط وفون مشورے لیتا رہا خاں صاحب نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا۔

''عزیز گرامی قدر...... السلام وعلیکم! ابھی آپ لوگوں کو ٹیسٹ کررہے ہیں پھر ان کو اپنے آپ سے کوتاہ اور کمزور جان کر ردگر رہے ہیں جب آپ کے دل میں طلب پیدا ہوئی کوئی نہ کوئی آپ کی رہنمائی کے لیے آموجودہ ہوگا' خاطر جمع رکھیں اور لوگوں کی غلطیاں معاف کرتے جائیں' اللہ ستار العیوب ہے۔ میرا پروگرام پسند فرمانے کا شکریہ' یہ پروگرام وغیرہ تو چلتی پھرتی

چھاؤں ہوتے ہیں آج ہیں کل نہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطاء فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطاء فرمائے۔

دعا گو: اشفاق احمد

خان صاحب کی آسانیاں تقسیم کرنے والی بات بہت بڑی بات ہے ہمیں یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں والد گرامی کے ساتھ نماز کے لیے مسجد جاتے تو مرحوم گلی کے درمیان میں پڑے ہوئے پتھر' اینٹ کے ٹکڑے' کانٹے یا ایسی دوسری رکاوٹ راستے سے ہٹا دیتے' ناواقف کو بھی سلام میں پہل کرتے' سادگی اور شریعت پر کاربند رہنے کا نمونہ تھے فرماتے ''روپوں کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے صدقے ہیں جن کا حکم میرے ہادی و پیشوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے...... کہا کرتے تھے کہ ایک عبادت اللہ کے گھر میں بیٹھ کر کی جاتی ہے اور ایک اللہ کے گھر سے باہر۔ گھر میں محلے' شہر' ملک اور سفر میں بھی اللہ کے ذکر کی مختلف صورتیں ہیں......'' ان کے وصال تک کوئی اور بابا دل کو نہ بھایا کہ والد مرحوم سے بڑا بابا ملا ہی نہیں اس لیے ان کی لائن پر لگا رہا...... اب اشفاق بابا کی پوری زندگی کا مطالعہ کر لیں وہ تصوف میں نئے رجحانات کے موجد ہیں عام لوگ کیا اچھے خاصے پڑھے لکھے' سائنسدان' دانشور اور فلسفی ان کی بات غور سے سنتے کہ اس میں تجربے' مشاہدے اور واردات قلبی ہوتی تھی اس لیے اس دیئے کے سامنے بڑے بڑے دیئے ٹمٹماتے دیکھے گئے وہ برگد کا بہت بڑا درخت تھے اگرچہ سادگی پر کاربند لیکن رعب ایسا تھا کہ ان کے سامنے بڑوں بڑوں کی گھگی بندھ جاتی۔ انہوں نے ''بابا کلچر'' کو نئے انداز میں دلائل و براہین کے ساتھ متعارف کروایا۔ فرق ضرور ہے کہ تلقین شاہ میں ان کے سامعین عوام وخواص دونوں تھے لیکن ''زاویہ'' اور گھر میں سجنے والی مجالس میں جدید فیشن ایبل' نوجوان' آدھی عمر کے خواتین و حضرات ان کی محفلوں کی جان تھے۔ المیہ یہ ہے کہ ایسے صاف گو بابے تیزی سے اٹھتے جا رہے ہیں جبکہ ہمیں ہر شعبے میں ہر قدم پر ان کی ضرورت ہے' ہمارے ہر دفتر' ہر محفل' ہر گھر' ہر سکول' ہر ادارے میں بابوں کی ضرورت ہے آخر میں تین پنجابی شعر

الا اللہ دیاں ضرباں لا کے نفس دے بت نوں بھناں
توڑ قیامت ستیاں رہنا ' ہن جاگیں تے مناں
سیل ملاپ جہان دا چھڈ کے ہن اللہ دا بیلی
دوئیں جہانیں لبھناں نائیں ایس توں چنگا بیلی
وچ نمازاں تھر تھر کنبن رب دے مومن بندے
رب کریم دا فضل ہووے تے بخشے چنگے مندے

روزنامہ "انصاف" لاہور
16 ستمبر 2004ء

داستان گو اشفاق احمد......

''ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے''

محمد اسلام شاہ

اشفاق احمد نے ادبی سفر افسانے ''گڈریا'' سے شروع کیا پھر اُردو ادب میں اپنی گرانقدر خدمات کے ذریعہ بلند مقام حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ہی ریڈیو پاکستان میں ان کی تخلیقات نے انتہائی مقبولیت حاصل کی اپنی ایک تحریر ''میرا ریڈیو پاکستان لاہور'' میں لکھتے ہیں۔

''میں نے اپنی رسمی تعلیم تین یونیورسٹیوں سے حاصل کی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور' روم یونیورسٹی (اطالیا) اور گرینویل یونیورسٹی (فرانس) لیکن ان کے علاوہ ایک چوتھی یونیورسٹی بھی ہے جس سے مجھے باقاعدہ کوئی سند یا ڈگری نہ مل سکی۔ البتہ اس کے عطا کردہ کرم نے میری زندگی کی راہوں کو منور کیا' اس نور سے نہ صرف میری راہیں روشن ہوئیں بلکہ اس روشنی میں اپنے ساتھیوں کو بھی نئی جہتوں کے نشان دکھانے میں بہت حد تک کامیاب ہوا' یہ چوتھی یونیورسٹی ریڈیو پاکستان لاہور تھی' یہ سب نام و نمود' عزت و شہرت اور آسانی اور فراوانی مجھے ریڈیو پاکستان کی بدولت میسر آئی جس کا سب سے بڑا ذریعہ لاہور اسٹیشن ہے۔''

اشفاق احمد نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اُردو' روم یونیورسٹی سے اطالوی زبان اور گرینویل یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ نیویارک سے نشریات کی تربیت حاصل کی۔ دیال سنگھ کالج لاہور اور اٹلی میں لیکچرار رہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی کے اعزازی استاد رہے اُردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر رہے ہفتہ وار لیل و نہار اور ماہنامہ داستان گو کے ایڈیٹر رہے۔ ان کے افسانے ملک کے بڑے بڑے ادبی رسالوں میں چھپتے رہے۔

ان کی یہ تصانیف چھپ چکی ہیں ایک محبت سو افسانے' گلدان' حسرت تعمیر' جنگ بجنگ' ایک ہی بولی' شاہلا کوٹ' حیرت کدہ' طلسم ہوش افزا' اجلے پھول' سفر مینا (کہانیاں)' سفر در سفر (سفرنامہ)' توتا کہانی (ٹیلی کھیل) ننگے پاؤں ٹاہلی تھلے (پنجابی کھیل) وداع جنگ (ترجمہ)

مہمان بہار (ناولٹ) کھٹیا وٹیا (پنجابی نظمیں) اچے برج لاہور دے' دھینگا مشتی' چند ورہ' پنجابی ڈرامہ "ہنجھ" کا ریکارڈ ریڈیو پاکستان لاہور کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔

یوں تو انہوں نے ریڈیو کے لیے تقریباً 48 ڈرامے اور 229 فیچر اور خاکے تحریر کیے مختصر اً یہ کہ اپنے عہد کے ادیبوں میں سب سے زیادہ ریڈیو کے لیے انہوں نے لکھا۔ اشفاق صاحب ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ بہترین ڈرامہ پروڈیوسر بھی تھے۔ انہوں نے ایک جشن تمثیل میں اپنا ڈرامہ "متاع غرور" خود پیش کیا اور سامعین سے بے پناہ داد حاصل کی۔ وہ اپنا فیچر تلقین شاہ خود پروڈیوس کرتے اور اس میں کامیاب ترین ڈرامہ آرٹسٹ کی حیثیت سے تلقین شاہ کا کردار ادا کرتے۔ چند ہفتے پہلے شدید بیماری کی وجہ سے یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اس مقبول ترین فیچر کے علاوہ آپ نے حسرت تعمیر پروگرام بھی کیا۔ داد و لوہار کے کردار کی حیثیت سے بھی سوہنی دھرتی پروگرام کے میزبانوں کی رہنمائی کی۔ آپ نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں موسیقی کے پروگراموں میں انٹرویو کیے اور مخصوص بیٹھک کا انداز بھی سجایا۔ آپ کی بیگم بانو قدسیہ کا افسانوی ادب میں نام سرفہرست ہے۔ ڈرامہ آرٹسٹوں میں آپ محمد حسین' نذیر حسینی (ہدایت اللہ) آفتاب احمد' موتی حمید' خورشید شاہد خالدہ ارجمند اور ثروت عتیق کی بہت تعریف کرتے تھے۔ موسیقاروں میں امانت علی خاں سے بہت پیار کرتے تھے۔ یوں تو وہ ہر فنکار کو اس کی حیثیت کے مطابق عزت احترام اور پیار دیتے تھے بنیادی طور پر ادیب' شاعر' ڈرامہ نگار' ڈرامہ آرٹسٹ ہونے کے علاوہ وہ بہت بڑے انسان دوست بھی تھے۔

ان کے دوستوں میں ممتاز مفتی' مسعود قریشی' خواجہ عمر سرفہرست تھے ان کے ساتھ وہ سیر و سیاحت بھی کرتے تھے۔ ان دوستوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ریڈیو آزاد کشمیر کا آغاز کیا اور اسے کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق چلایا۔ قیام پاکستان کے وقت واہگہ کیمپ میں مہاجرین کا لامتناہی سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اس کیمپ میں آپ مہاجرین کی ہر انداز سے خدمت کرتے رہے اس سلسلے میں ان کے ماتحت شیخ شجاع الدین احمد نے اشفاق صاحب کے بارے مضمون میں رحمدلی کے واقعات کی خاص تفصیلات بیان کیں ہیں۔

آپ اسٹیج پر آتے تھے تو تقریب کو گل و گلزار بنا دیتے تھے۔ انتہائی قیمتی معلومات اور ہدایات انتہائی خوبصورت اور دلچسپ انداز میں بیان کرتے۔ حلقہ ارباب ذوق کی صدارت کرتے تو علم و ادب کے موتی بہا دیتے۔ پنجابی ادبی سنگت کی ایک صدارت میں آپ نے اپنی چھوٹی چھوٹی پنجابی نظمیں سنانی شروع کیں تو لوگوں کی فرمائش پر کافی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا لاہور آرٹ فورم کے خصوصی پروگراموں میں آپ متعلقہ مضمون پر تفصیل سے روشنی ڈالتے اور سوالوں کے جواب دیتے تھے۔ ویسے بھی آپ صلح کل مزاج تھے۔ آپ صوفیا کرام کی اس خصوصیت کی بہت تعریف کرتے تھے کہ ان کی محفلوں میں ہر مذہب اور ہر خیال کے لوگ آتے اور روشنی حاصل کرتے تھے۔ اس لیے وہ ایسے بابوں کا تذکرہ بھی کرتے تھے وہ خود بھی ہر خیال کے لوگوں کو عمدہ ترین پیرایہ میں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کے علمی ادبی مقام اور فنی خدمات کی وجہ سے ہر حکومت نے ان کے اعلیٰ مقام کو تسلیم کیا۔ 1979ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ان کو صدارتی تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ اشفاق صاحب کے بہت سے پروگراموں کی ریکارڈنگ ریاض محمود کے پاس محفوظ ہے۔ وہ 7 ستمبر 2004ء کو ہم سے جدا ہو گئے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

روزنامہ ''سعادت'' لاہور
16 ستمبر 2004ء

(لاہوریات)

اشفاق احمد کی یاد میں تعزیتی ریفرنس

ادیبوں اور شاعروں نے خراج عقیدت پیش کیا

قائداعظمؒ لائبریری اور اکادمی ادبیات نے اشفاق احمد کی یاد میں قائداعظمؒ لائبریری کے اقبالؒ ہال میں ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا۔ جس میں ان سے محبت وعقیدت رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اجلاس کی صدارت حمید اختر نے کی۔ حرف تعزیت پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر انیس ناگی' فرخندہ لودھی' ڈاکٹر آغا یامین' اظہر جاوید' بشریٰ اعجاز اور اصغر ندیم سید شامل تھے۔ حمید اختر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ داستان گوئی شروع سے اشفاق احمد کے خون میں شامل تھی۔ تحریر ہو یا تقریر جزئیات نگاری ہو یا مکالمہ نگاری' داستان گوئی کا رجحان ان پر غالب رہا۔ رسالہ نکالا تو اس کا نام "داستان گو" رکھا۔ رہائش گاہ کا نام "داستان سرائے" تھا۔ وہ ایک محنتی ادیب تھے۔ انہوں نے جو کچھ بھی بنایا اپنی قلمی محنت سے بنایا ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ عام لوگوں کی زبان میں ان کی سطح پر آ کر مکالمہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر انیس ناگی نے کہا کہ میں انہیں ہمیشہ خان صاحب کہا کرتا تھا۔ میرا اور ان کا تعلق ہمیشہ جھگڑے کا ہوتا۔ میں ان سے اکثر چیزوں میں اختلاف کرتا تھا لیکن مجھے ان سے محبت تھی۔ اشفاق احمد ایک بہت اچھے براڈ کاسٹر اور ٹیلی کاسٹر تھے۔ ان کی شخصیت کے تین حصے تھے ایک آرٹسٹ ادیب' دوسرا دنیا دار آدمی' تیسرا تصوف' مجھے ان کے موخر الذکر دو پہلوؤں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی لیکن وہ ایک زبردست آرٹسٹ تھے جو اپنے فن کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے فرخندہ لودھی نے اشفاق صاحب کے حوالے سے ایک مختصر سا تاثر پیش کیا۔ بشریٰ اعجاز نے اشفاق صاحب کے تصوف پر روشنی ڈالی اور انہیں ایک ملامتی بابا قرار دیا۔ اصغر ندیم سید نے کہا کہ جس شخصیت کے بہت سے پہلو ہوں اس پر بات کرنا مشکل ہوتا ہے جوں جوں وقت گزرے گا اشفاق صاحب کی بہت سی باتیں یاد آتی جائیں گی۔ میرا اشفاق صاحب سے استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا لوگ انہیں ادیب سمجھتے ہیں شاید میں بھی شروع میں

انہیں ادیب ہی سمجھتا تھا لیکن پھر میرا اور اس کا استاد اور شاگرد کا رشتہ قائم ہو گیا۔ میں ہمیشہ ان سے ایک فاصلے پر بیٹھتا تھا اور ادب و احترام سے ان سے بات کرتا تھا اشفاق صاحب کہا کرتے تھے کہ عام آدمی سے اس کی بات لے کر اس کو سنوار کر پھر اسی عام آدمی کو لوٹا دیتا ہوں۔ اظہر جاوید نے اشفاق احمد کی شخصیت کے حوالے سے ایک پرتاثر مضمون "دو پیالیاں ایک پرچ" پڑھا۔ انہوں نے بازار سے پیالیوں کا ایک سیٹ خریدا تھا جس کے لئے جمیل الدین عالی سے ادھار پیسے لینے پڑے بعد میں ان میں سے ایک پیالی ٹوٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی ان کا ایک دوست بھی ان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اسی طرح اور پیالیاں ٹوٹنے کے ساتھ دوست رخصت ہوتے رہے۔ اب اشفاق صاحب کے پاس دو پیالیاں اور ایک پرچ باقی تھی جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ایک پیالی وہ خود ہیں۔ بانو قدسیہ نے پیالیاں ٹوٹنے کے خدشے سے سنبھال کر رکھی دی تھیں۔ اب اشفاق صاحب کے بچھڑنے پر اظہر جاوید بانو قدسیہ سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ان دو پیالیوں اور ایک پرچ میں سے کہیں ایک پیالی ٹوٹ تو نہیں گئی۔ اظہر جاوید نے دکھ بھرے انداز میں کہا کہ داستان گو تو داستان کہتے کہتے سو گیا ہے اس تعزیتی ریفرنس میں اشفاق احمد کی بہو مسز سبیلہ انیس کے علاوہ قائداعظمؒ لائبریری کے چیف لائبریرین محمد تاج' پروگرام آفیسر محمد ہارون عثمانی' صدیقہ بیگم اور اشفاق احمد سے عقیدت رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض اکادمی ادبیات کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر قاضی جاوید نے سرانجام دیئے۔

روزنامہ جنگ لاہور

ادب و ثقافت ایڈیشن

17 ستمبر 2004ء

ایک اشفاق اور سو افسانے

عبدالقادر حسن

غیر سیاسی باتیں

میں ابھی چند منٹ پہلے ٹیلی ویژن کا ایک پرانا ڈرامہ قرۃ العین دیکھ کر بیٹھا ہوں اور اس میں گم ہوں۔ یہ ڈرامہ ٹیلی ویژن والے اشفاق صاحب کی یاد میں نشر کر رہے تھے اور اس سلسلے کے دوسرے ڈرامے بھی آپ دیکھیں گے۔ اشفاق احمد کا لکھا ہوا اور ایک عظیم المرتبت محمد نثار حسین کا پیش کیا ہوا یہ ڈرامہ ذہن میں تازہ کرنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ اتنے بڑے آرٹسٹ کے بارے میں کوئی کیا لکھ سکتا ہے' اسے خراج تحسین پیشکرنے کے لیے کوئی الفاظ کہاں سے لا سکتا۔ اشفاق صاحب کی زندگی کے جس دور میں ''ایک محبت سو افسانے'' کے ڈرامے لکھے گئے' وہ ان کے فن کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی دور کے ایک عرصہ میں مجھے اشفاق صاحب کے ساتھ ہفت روزہ لیل ونہار میں ایک مدت تک کام کرنے کا موقع ملا۔ لیل ونہار ایک نظریاتی سیاسی اور ادبی جریدہ تھا جس کے چیف ایڈیٹر فیض صاحب تھے اور ایڈیٹر سید سبط حسین تے۔ جب ایوب خاں نے یہ ادارہ قبضہ میں لے لیا تو جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنے دوست اشفاق احمد کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا۔ فیض صاحب اور سبط صاحب تو چلے گئے لیکن ادارتی عملے کے ہم لوگ اشفاق صاحب کو ورثے میں مل گئے۔ اشفاق صاحب کسی پہلو سے بھی اخبار نویس نہیں تھے اور لیل ونہار ہر طرح سے ایک ہفتہ وار اخبار تھا چنانچہ ایک دلچسپ صورت حال تھی۔ اشفاق صاحب فکشن کے آدمی تھے اور افسانہ وافسوں میں گم رہتے تھے۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا اخبار خالص اور ٹھوس ذہنی حقائق کا مطالبہ کرتا تھا اس وجہ سے بڑے گھپلے ہو جاتے تھے۔ اشفاق صاحب کی طبیعت صحافت کو نہیں مانتی تھی۔ وہ اصرار کیا کرتے کہ افسانوی اور ڈرامائی انداز اختیار کیا جائے چنانچہ ایک بار میں نے لاہور میں مقابلہ حسن کے عنوان سے ایک فرضی رپورٹ چھاپ دی۔ اشفاق صاحب بہت خوش ہوئے لیکن اس پر اوپر سے بہت جھاڑ پڑ گئی کہ یہ کیا لغویات ہے۔ اشفاق صاحب کے اوپر کے دوستوں نے

صورت حال سنبھال لی لیکن اس کے بعد افسانوی دور ختم ہوگیا۔ اشفاق صاحب ایوب خان کو بادشاہ کہتے تھے۔ وہ صحافت کی طرح سیاست کے آدمی بھی نہیں تھے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ایک آرٹسٹ تھے اور آخر دم تک اپنے موضوع عمر کے ساتھ بدلتے رہے لیکن ان کا آرٹ زندہ رہا۔ ان کا آخری پروگرام ''زاویہ'' ان کے آرٹ کے ایک دوسرے عروج کا نمونہ تھا اور آج کے لوگ انہیں اسی کے حوالے سے یاد کرتے ہیں۔

اشفاق صاحب نے آخری دنوں میں میری ٹیلیفون پر بات ہوئی آواز میں بہت نقاہت تھی۔ پشاور سے عبداللہ صاحب آئے ہوئے تھے اور عیادت کے لیے ان سے ملنا چاہتے تھے لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ میری اشفاق صاحب سے بھائی مجیب شامی کے ہاں کھانے پر بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ملاقات ڈاکٹر یقین صاحب کے ہاں بھی ہوئی۔ بانو آپا بھی موجود تھیں۔ یہاں خواتین کی آزادی کی تحریک پر باتیں ہو رہی تھیں۔ دوران گفتگو انہوں نے ہماری بانو آپا کو کسی کام سے بلایا تو انہوں نے کچھ دیر کر دی' اس پر اشفاق صاحب نے کہا اس پر بھی بہت کا اثر ہوگیا ہے۔ یہ شفیق خاتون مسکراتے ہوئے آئیں اور اشفاق صاحب کے حکم کی تعمیل کر دی۔ ان کے اندر خوبصورت اور شائستہ مزاح کی زندہ حس تھی۔

میں نہ شاعرانہ افسانہ نگار نہ براڈ کاسٹر اور نہ ہی خوش گفتار' میں اس نادر روزگار شخص پر کیا لکھوں۔ میں نے ان کے تصوف کے تصور سے کم ہی اتفاق کیا مگر یہ کہہ کر کہ کاتو نہیں منا مجھے خاموش کرا دیتے میرا ان کے استھ چونکہ لیل ونہار کا ایک ایسا تعلق تھا جو ان کا اور کسی سے نہیں تھا اس پرانے سٹاف سے ایک میں ہی بچا تھا جو لاہور میں رہتا تھا وہ میرے ساتھ گفتگو میں اس پرانے پیار کے تعلق کو ذہن میں رکھتے تھے اور میں اس پر بہت خوش ہوتا تھا کہ۔ وہ بھی کسی محفل میں سب سے ملتے ملاتے جب مجھ تک آتے تو ان کی دائمی مسکراہٹ زیادہ پھیل جاتی۔ ''تیرا کی حال اے'' کے جملے میں پرانے تعلق خاطر کی خوشبو ہوتی۔ سید سرفراز شاہ کے ہاں بارہا ملاقاتیں ہوئیں یہاں اشفاق صاحب اپنے تصوف کا نشہ کرنے آتے تھے۔ ان کے آخری عمر کے کئی بابے حقیقی بھی تھے لیکن اس افسانے نگار نے ان حقیقی بابوں کے ساتھ کئی اپنے تخلیق کردہ بابوں کو بھی خلط ملط کر دیا

تھا۔ میرے خیال میں وہ آخر عمر تک افسانہ وافسوں کی ذاتی دنیا میں سفر کرتے رہے۔ اس میں کئی حقائق بھی آئے جن کو انہوں نے اپنی افسانوی مہارت سے بنا سنوار کر ہمارے سامنے اپنی سحر انگیز گفتگو میں پیش کیا اور ہم نے بہت لطف لیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ جو سحر ''ایک محبت سو افسانے'' میں ہے' وہ ان کے تصوف میں نہیں ہے۔ یہ میرا خیال ہے اور اسی لیے جب بھی زیارت ہوتی تھی' میں ان سے کہتا تھا کہ واپسی کی کوئی صورت کب نکلے گی۔ وہ بنیادی طور پر دیہاتی تھے جو کسی حادثے میں شہر میں آباد ہو گئے لیکن خوش قسمت کہ انہیں لاہور جیسا شہر مل گیا جس میں ان کی آمد کے زمانے میں تاجرانہ ذہنیت بہت کم تھی اور میلوں ٹھیلوں اور خوش وقتی کا لاہوری مزاج زندہ تھا۔

قدرت اللہ شہاب' ممتاز مفتی اور اشفاق احمد ایسے ادیب لوگ تھے جو عمر کے آخری دنوں میں تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ ان تینوں کی دوستی کی وجہ سے ان کی تکون بہت مشہور تھی۔ صدر ضیاء الحق کے بارے میں ایک امریکی دانشور نے لکھا ہے کہ ایک مسلمان جب پچاس برس سے اوپر کی عمر کا ہو جاتا ہے تو وہ بالکل بدل جاتا ہے غیر یقینی ہو جاتا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا کہ وہ کیا کرے گا' ان تینوں نے بھی اپنے ماضی سے قدرے ہٹ کر نئی راہ اختیار کر لی چونکہ بنیادی طور پر تینوں افسانہ نگار تھے' اس لیے تصوف میں بھی ایک نیا رنگ پیدا کر دیا جو ثقہ صوفیوں سے کچھ مختلف تھا لیکن یہ اتنے بڑے آرٹسٹ تھے کہ اسے بھی نبھا گئے خصوصاً اشفاق صاحب۔ اشفاق صاحب کی تحریر' آواز اور مجالس ہمیشہ زندہ یادگار رہیں گی۔ وہ نہایت خوشگوار اور شفیق انسان تھے۔ ہم لوگ انہیں محبت کے ساتھ یاد کرتے رہیں گے۔ انہوں نے سوہی نہیں لاتعداد افسانے تخلیق کیے ہیں' ایک اشفاق اور افسانے۔

روزنامہ ''جنگ'' لاہور

17 ستمبر 2004ء

ہمارے بابا جی مشرقی فکرو دانش کا نمونہ تھے

افضال ریحان

(انسانوں کے نام)

جناب اشفاق احمد خان کے جانے کا دکھ تو ہے' لیکن یہ دعا بھی ہے کہ پروردگار سے جتنی مہلتِ عمل انہیں ملی ہے' اتنی ہم سب کو بھی عنایت فرمایا۔ انہوں نے اپنی 79 سالہ زندگی میں اتنے کام کیے ہیں کہ بہت سے لوگ سو سال جی کر بھی شائد اتنے کام نہیں کر سکیں گے۔ وہ عصر حاضر میں اردو کے سب سے بڑے ادیب تھے۔ وہ بیک وقت افسانہ و ڈرامہ نگار بھی تھے' تو صداکار بھی' داستان گو بھی تھے اور پنجابی شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے بھی۔ ان سب سے بڑھ کر وہ مشرقی تہذیبی فکر و دانش کا خالص نمونہ تھے' جس میں صوفی ازم سے لگاؤ نے گہرا سبز رنگ بھر دیا تھا۔ وہ بابا' بابا کرتے خود بابا بن گئے تھے۔

ان کے بابا سے میری نہیں بنتی تھی' بالخصوص تعلیم کے حوالے سے۔ وہ جس طرح ان پڑھوں کو پروموٹ کرتے تھے' اس سے پڑھائی لکھائی یا تعلیم کی ناقدری محسوس ہوتی تھی' جبکہ وہ بضد رہتے تھے کہ جو دھان لگاتا ہے' وہ دھان کا پی ایچ ڈی ہے۔ بھینس پالنے والا ان پڑھ بابا بھینسوں کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے' جو پڑھا لکھا ڈنگر ڈاکٹر نہیں جان سکتا' یعنی وہ روایتی پڑھائی پر فطری تجربے و مشاہدے کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک مخصوص زاویے سے نگاہ ڈالی جائے تو ان کی یہ بات جزوی طور پر قابل التفات تھی۔ اگر ہم روز مرہ کے معمولات میں اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں بہت سے ایسے پڑھے لکھے احمق نظر آئیں گے' جن کی نسبت کئی ان پڑھ بابے زیادہ عقل و دانش اور معرفت و بصیرت رکھتے ہیں۔ جنہوں نے کتاب فطرت کا وہ مطالعہ کر رکھا ہوتا ہے' جس کے سامنے بی اے' ایم اے کی رٹالائزیشن ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے ان پڑھوں پر لال کتاب کے ایک لاکھ عالم قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے اور اسی روحانی بالیدگی سے یہ آواز پھوٹتی ہے کہ "علموں بس کریں او یار"۔

ہمارے صوفیاء کا عشقِ حقیقی اپنی معراج یعنی فنا فی اللہ میں پہنچ کر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے ذریعے بندگانِ خدا میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر مقدس الفاظ کو نہیں ان کی روح کو دیکھا جاتا ہے۔ لفظی کرختگی مدعا کی شیرینی میں ڈھل جاتی ہے اور وہ پوری انسانیت سے پیار کرنا سکھلا جاتی ہے۔ اگر آپ کو کسی فنکار سے حقیقی پیار ہے تو آپ کو اس کے شاہکار تخلیقی فن پارے سے نفرت و مغائرت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ احسن التقویم بھی تو کائنات کے سب سے بڑے فنکار کا تخلیقی شاہکار اور فن پارہ ہے، جو عالم لفظی غلامی میں اس پر دھبہ لگاتا ہے اس رذو کو عالم قرار نہیں دیا جا سکتا، چاہے وہ کتنی ہی ڈگریوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ بابا جی کہا کرتے تھے اس ملک کو پڑھے لکھوں نے لوٹا ہے۔ کسی لوہار، ترکھان، دھوبی، نائی اور تیلی نے اس ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس طرح وہ صاحب ہنر اور محنت کش کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کا مورال بلند کرتے ہوئے انہیں خودداری و عزت نفس کا درس دیتے تھے۔ عزت نفس کے بحران کو وہ اس دیس کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیتے تھے۔ وہ زندگی بھر دبے ہوئے مظلوم و محروم طبقات کی عزت نفس بحال کروانے اور مقتدر طبقے سے منوانے کے لئے لڑتے رہے۔ اپنی متنوع صلاحیتوں اور ہمہ جہتی فن کو انہوں نے اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنائے رکھا۔ وہ اپنی وضع قطع اور مخصوص ڈھب کے انوکھے و منفرد آدمی تھے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ اسلام اور پاکستان ان کی شمع تھے اور وہ اس شمع کے پروانے تھے۔ وہ پکے سچے راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور خوبیوں و خامیوں سمیت مشرقی تہذیب و آداب میں گندھے ہوئے تھے۔ اس حوالے سے کٹریت ظاہر کرتے ہوئے وہ کسی جھجک، شرمندگی اور خجالت کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ اس لہر میں وہ سیکولرازم ہی کو نہیں، جمہوریت کو بھی ٹیکے لگا جاتے تھے۔ عورت، مرد کے حقوق کی بات کرتے ہوئے وہ مرد کی مناپلی و آمریت قائم کرتے محسوس ہوتے کہ شائد یہ بے انصافیاں بھی مشرقی آداب کا حصہ ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود شائد بہت کم لوگوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ وہ اپنے باطن میں بہت سی جدید مغربی اقدار سے متاثر تھے۔ مشرقی رکھ رکھاؤ کے باوجود ان کا رہن سہن روایتی مذہبی لوگوں جیسا ہرگز نہیں تھا۔ بنیادی طور پر وہ ادب کے آدمی تھے البتہ مذہب کی روح کو وہ اپنی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا حصہ بناتے

چلے جار ہے تھے اور اس حوالے سے ان کا یہ سفر جاری وساری تھا۔

ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی شخصیت بڑی متنوع تھی' مختلف شعبہ ہائے حیات میں ان کے ناطے اور واسطے تھے۔ نوجوان فنکاروں اور فنکاراؤں سے وہ یوں گلے مل رہے ہوتے' جیسے تلقین شاہ ان کے مربی و مہربان دوست ہوں۔ شاعروں اور ادیبوں کو تو خیر وہ اپنے اہل خانہ کی طرح سمجھتے تھے۔ علماء اور سیاستدانوں سے بھی وہ اتنے آگاہ تھے کہ ایک ایک کی اصلیت کو پوری باریکی کے ساتھ واضح کر سکتے تھے۔ صحافیوں اور کالم نگاروں کی کارکردگی کا کوئی بھی پہلو ان سے پوشیدہ و اوجھل نہیں تھا اس سب کے باوجود وہ جہاں حوصلہ افزائی کے لئے وسیع سینہ رکھتے تھے' وہیں تنقید و تنقیص کے لئے صوفیاء کا اسلوب اپناتے تھے۔ مجھے ان کا یہ انداز بیان بڑا دلنشیں لگتا' جب وہ کچھ فنکاروں پر تنقید کرتے ہوئے بولتے کہ وہ تھک گئے ہیں یا یہ کہ ان کی سانس پھول گئی ہے ہم سب مانتے ہیں کہ گھنے درخت کے نیچے اُگنے والے پودے کبھی پروان نہیں چڑھتے' لیکن یہ عجیب نوعیت کا شجر سایہ دار تھا' جو اپنے سائے میں اُگے ہر پودے کو پروان چڑھا کر اپنا ہم سایہ بنا لینا چاہتا تھا۔

مجھ کو ہی نہیں' وہ اپنے ہر چاہنے والے کو اپنے بابا کے روپ میں نظر آتے تھے۔ ایک بار میں نے انہیں کہا بھی کہ بابا جی! آپ باتیں تو پرانے بابوں کی کرتے ہیں' لیکن جوان نسل میں ایسے مقبول کیسے ہیں کہ میرے اکثر دوست تقاضا کرتے ہیں کہ ہمیں بابا جی سے ملواؤ۔ اس پر وہ کہنے لگے: "یار! یہ بات خود میری بھی سمجھ نہیں آئی اور میں اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ نوجوان مجھ سے بہت پیار اور اپنائیت رکھتے ہیں"۔

آج جب ہمارے بابا جی تلقین شاہ کا نام پا کر اور گڈریئے جیسی بگل مار کر راہی ملک عدم ہوئے ہیں تو میں سوچ رہا تھا کہ کاش بابا جی ایک نظر پلٹ کر دیکھیں اور اس محبت کا نظارہ کریں' جوان کے لئے ہماری آنکھوں سے اُمڈ رہی ہے' لیکن ان کا دست شفقت ہمارے سروں کی طرف نہیں اٹھ رہا۔ جب وہ یہ بتا رہے تھے کہ میری قبر اچھی سی اور کچی سی ہو' جس پر مسافروں کے لئے نلکا لگا ہو تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ وقت اتنی جلدی آنے والا ہے۔

روزنامہ "پاکستان" لاہور
17 ستمبر 2004ء

باتیں ان کی یاد رہیں گی

طارق اسماعیل ساگر
(نقار خانہ)

اشفاق احمد ایک انجمن کا نام تھا۔ ایک عہد تھا۔ لوگ مر جاتے ہیں عہد زندہ رہتے ہیں۔ اس سے متعلق ہی بلھے شاہؒ نے کہا تھا۔

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی ہور ....

موت تلقین شاہ کو فتح نہیں کر سکتی کہ اس کے وجود کی شمع سے پروانے تخلیق ہوتے تھے۔ اس کے وجود سے داستان سرائے ''زاویہ'' بنا تھا۔ کتنے ایسے تھے جنہوں نے اس زاویہ میں بیٹھ کر زندگی کی واقعیت کو مکمل شدت سے جانا۔ زندگی کے جھلتے صحراؤں کی آبلہ پائی کرنے کے بعد جب بھی کوئی سالک داستان سرائے کے نخلستان پر پہنچا اسے یوں لگا جیسے عمر بھر کی ریاضت کا حاصل مل گیا۔

وہ ایسا داستان گو تھا کہ لفظ جس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ وہ الفاظ سے زندگی کشید کرتا تھا اور پھر قطرہ قطرہ اپنے سامعین میں تقسیم کر کے انہیں نئے عزم اور نئے ولولوں سے روشناس کرتا تھا۔

علم و آگہی کا ایک جہان اس کے اندر سمٹا ہوا تھا۔ دانش و حکمت اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز رہتی تھی۔ وہ زندگی سے مایوس' حالات سے متنفر' بڑوں بوڑھوں' بچوں' نوجوانوں کو امکانات کے نئے جہانوں سے آشنائی بہم پہنچاتا تھا۔ اس سے ملنے والا کبھی خالی نہیں لوٹا۔ ایسا درویش خدا مست تھا کہ جو اس کی صحبت میں بیٹھا اس نے علم و دانش کے گوہر نایاب جھولیا بھر بھر کر سمیٹے۔

وہ دانش افرنگ کا نہیں مومنانہ بصیرت کا پرچارک تھا۔ اس نے کہا کہ اس مملکت خداداد کو ہمیشہ پڑھے لکھے لوگوں نے زک پہنچائی۔ دنیا جہان کے ادب لٹریچر پر عبور رکھنے والے اس گڈریے سے ملنے والے ''اہل نظر'' جانتے تھے کہ اس نے زندگی کا گیان کتابوں سے نہیں اللہ

والوں کی صحبت سے حاصل کیا ہے۔ "نور والے ڈیرے" سے اس کا باطن منور ہوا تھا۔ وہ ظاہر کا نہیں باطن کا بندہ تھا۔ اس نے کہا اپنے اوپر پہنے کاغذی لبادے اتار کر اپنے اندر جھانکو۔ اپنے اندر کے اندھیروں میں محبت کی موم بتی جلاؤ۔ اپنے اطراف و اکناف میں محبت تقسیم کرو۔ یہ بڑی عبادت ہے۔ ہمارے بابا جی نے جب سے سیاہ پوشی اختیار کی تھی داستان سرائے کے مکینوں کی طرف سے انہیں تسلسل کے ساتھ تن ڈھانپنے کا سامان میسر ہوتا تھا۔ ایسی خیرات قسمت والوں کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ داستان سرائے تک رسائی بھی خوش نصیبوں کو ملتی تھی۔

اشفاق احمد کبھی مبلغ نہیں بنا۔ اس نے اپنے چاہنے والوں کو بھی اپنی نصیحتوں سے بور نہیں کیا لیکن اس کے قرب سے جس دانش صوفیانہ کا ابلاغ ہوتا تھا اس سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ فرنگی دانش کے تہذی یافتہ' جدیدیت کو اوڑھنا بچھونا بنانے والوں کو اس نے اسلاف کی روایات سے محبت کا درس دیا۔ اس نے بتایا کہ کوئی درخت اپنی جڑوں سے کٹ کر جی نہیں سکتا۔ دنیا کا سب سے قیمتی "منی پلانٹ" بھی برگد جیسی چھایا نہیں دے سکتا۔ یہی فلسفہ صوفی اشفاق احمد کی تعلیمات کی بنیاد تھا اور ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار عمارتیں صدیوں اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں۔

میری آنکھیں اس کے حضور نذر عقیدت گزار رہی ہیں۔ وہ سرخرو ہوا۔

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم جہاں سے
تم ڈھونڈنے نکلو گے جنہیں پا نہ سکو گے

روزنامہ "جنگ" لاہور

17 ستمبر 2004ء

بیادِ اشفاق احمد

نجمہ یاسمین یوسف

فکر و سخن کے پیکر اشفاق کو سلام
علم و ادب کے قدسی آفاق کو سلام
اے داستان گو تیری پائندہ داستاں
تیرے یگانہ جوہر اشراق کو سلام

روزنامہ ''جنگ'' لاہور
17 ستمبر 2004ء

جیسے کہ تو گیا بھی تو ابھی اٹھ کے گیا ہے

سید طیب عابدی

اشفاق احمد سے جب ہم پہلی دفعہ ملے تو اس وقت ان پر بڑھاپا چاروں شانے چت کرنے آچکا تھا اک دفعہ ملنے کے بعد ان سے ایسی نیاز مندی بڑھی کہ ہم ہر ہفتے ''داستان سرائے'' جانے لگے ان کی محفلوں میں طالب علموں سے لے کر ہر شعبہ زندگی کے لوگ شامل ہوتے بانو آپا اور اشفاق احمد اپنے گھر آنے والے عام سے مہمان سے بھی ایسی مہمان نوازی سے پیش آتے کہ وہ اپنے آپ کو وی آئی پی محسوس کرنے لگتا۔ ادب سے وابستہ لوگ دور دراز سے آتے اور شاداں لوٹتے۔

اسلام اور پاکستان سے ان کی محبت بے مثال تھی اپنے مشہور افسانے ''گڈریا'' کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ مجھے ''گڈریا'' لکھ کر افسوس ہوا وجہ پوچھی گئی تو فرمانے لگے کہ ''جب واجپائی' نواز شریف کے دور میں لاہور آیا تو دونوں ممالک براہ راست رواں تبصرہ پیش کر رہے تھے جب واجپائی لاہور میں داخل ہوا تو انڈیا کے تبصرہ نگار کہنے لگے کہ یہ وہ سرزمین ہے جہاں کے فیض احمد فیض ہیں جہاں ''گڈریا'' لکھا گیا تو میں پریشان ہوا کہ جو چیز میرے دشمن کو پسند ہے اس میں یقیناً پاکستان کی برائی ہے۔''

ایک اور دفعہ کہنے لگے کہ ''میں پہلے لبرل سا آدمی تھا مگر اب کٹر (متعصب) مسلمان ہوں۔''

ان کے انتقال کے بعد جب ہم بانو قدسیہ سے داستان سرائے ملے تو انہوں نے بھی کہا کہ اشفاق صاحب جس طرح پاکستان سے محبت کرتے تھے آپ لوگ بھی اسی طرح پاکستان کی حفاظت کریں۔''

بانو آپا اور اشفاق احمد کا تعلق تابعداری احترام اور محبت کے جذبات کا ملاپ تھا جو آخری وقت تک قائم رہا آج داستان سرائے آدھا خالی ہوگیا بانو آپا نے تو ایک بڑی ادیبہ ہونے

کے باوجود اپنی ذات کی نفی کی اور سب کچھ اشفاق احمد کے لیے رکھ چھوڑا جہاں کہیں ان کی تعریف ہوتی یا ان سے کہا جاتا کہ آپ کچھ کہیں تو وہ یہی کہتیں کہ بس اشفاق صاحب کو سنیں۔ ان میں پیشہ وارانہ یا ادبی جیلسی دور تک نہ تھی قربانی کی ایسی مثال کہ اک ہی چھت کے نیچے دو بڑے ادیب رہتے ہوں اور کبھی اختلاف نہ ہوا ہو۔

بانو آپا نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "اشفاق صاحب میرے لیے تحفہ خداوندی ہیں" اور آج وہ تحفہ خداوندی اُٹھ گیا۔ بانو آپا اکیلی رہ گئیں۔ انہوں نے اتنے بڑے دکھ کو جس طرح سہا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا اتنا حوصلہ اتنا صبر۔

اشفاق احمد ایک سوشل ریفارمر تھے ان کا پروگرام "زاویہ" بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا وہ معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔

سرحد میں مولویوں کی حکومت آنے پر وہ سرحد کی خبریں دلچسپی سے پڑھتے تھے کہ یہ لوگ اب وہاں کیا تبدیلی لائیں گے کہنے لگے "سائن بورڈ اتارنے سے اسلام نہیں پھیلتا بلکہ حقوق العباد پورے کرنے سے حق ادا ہوتا ہے حقوق اللہ تو خدا معاف کرسکتا ہے مگر حقوق العباد نہیں انہیں لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنی چاہئیں تاکہ مشکلات"

لاہور کہ جو ادیبوں کا شہر ہے آج اپنے سرپرست سے محروم ہوگیا لاہور کی رونق احمد ندیم قاسمی سے عطاء سے اے حمید سے کشور امجد اسلام سے وابستہ ہے اور اسی قبیلے کا ایک فرد اردو ادب کا ایک باب ختم ہوگیا داستان سرائے پھر وہ اینٹوں پلستر اور روغن کا ڈھانچہ لگتا ہے جیسے اصل روح نکل گئی ہو۔ کراچی کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہاں قائداعظم رہتے تھے اور آج وہاں ہی دفن ہیں لاہور کے پاس اشفاق احمد تھا اور آج وہ بھی منوں مٹی تلے جا سویا۔ بانو آپا کو راہ میں کھڑا کرکے خود اک دوسری راہ پر ہولیا ڈونگی سوچ میں رہنے والا اشفاق احمد ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

وہ اکثر کہتے آپ لوگ بولتے نہیں کچھ کہیں، سنائیں، مگر ہماری زبان ان کی موجودگی میں گنگ ہو جاتی بس یہی منشا رہتی کہ جتنا ان سے سن لیں بتائیں پالیں اتنا ہی بہتر ہے وہ قصہ سے

قصہ نکالتے رہتے اور گفتگو دلچسپ ہوتی رہتی۔ آج وہی زباں رک گئی اور ایک بہت بڑا قلم جامد ہو گیا۔ ہماری راہ گزر ان کے گھر کے پاس ہی ہے اور آج وہاں سے گزرنے کو دل نہیں کرتا کلیجہ منہ کو آتا ہے اس بے حس خود غرض اور لالچی دنیا میں وہ اک دیا تھا اور وہ بجھ گیا اچھے اچھے لوگ اُٹھتے جاتے ہیں اپنے اشفاق صاحب کے جانے کے باوجود وہ اپنی باتوں، تحریروں کے ذریعے زندہ ہیں۔

محفل میں تیرے قرب کی خوشبو ہے ابھی تک
جیسے کہ گیا بھی تو ابھی اٹھ کے گیا ہے

روزنامہ ''دن'' لاہور

17 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد...... افسانہ نگار

اے حمید

(یہ مضمون اکتوبر 1982ء میں لکھا گیا تھا)

بعض آدمی تانبے کے ہوتے ہیں اور وہ ساری زندگی تانبے کو سونا بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ اشفاق احمد ایسا آدمی ہے جو سونے کا ہے مگر اپنے سونے کو تانبا بنانے میں لگا ہوا ہے۔ اب میں اس کے بارے میں یہ مضمون لکھتے ہوئے جتنے خلائی سیارے چھوڑوں گا وہ سب کے سب اسی پہلے فقرے کے مدار کے گرد گردش کریں گے۔ ہو سکتا ہے میرے پہلے فقرے کو اشفاق احمد بھی نہ سمجھے، آپ بھی نہ سمجھیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں اور میں نے اس فقرے کی شکل میں پہلا خلائی سیارہ ٹھونک بجا کر مدار میں چھوڑا ہے۔

اشفاق احمد سے میری پہلی ملاقات کون سے روز کس سن میں ہوئی یہ مجھے یاد نہیں۔ جس طرح کسی کو یہ یاد نہیں ہوتا کہ اس پگ ڈنڈی کی بنیاد کب پڑی۔ جو ٹاہلی کے درختوں میں سے ہو کر کنوئیں کو جاتی ہے۔ بس ایسا ہوتا ہے کہ پہلے گاؤں کی ایک لڑکی گاگر اٹھائے کنوئیں پر پانی بھرنے گئی اور اس کے پاؤں نے زمین پر آنے والی پگ ڈنڈی، آنے والی سڑک، آنے والی مال روڈ کا خاکہ بنا دیا پھر گاؤں کی دوسری لڑکیاں پانی بھرنے آنے لگیں اور یوں وہاں زمین کی مانگ کی طرح ایک پگ ڈنڈی نے جنم لے لیا۔ بالکل اسی طرح مجھے بھی یاد نہیں کہ پہلے روز جب میں اور اشفاق احمد ایک ہی کنوئیں پر پانی بھرنے گئے تو وہ کونسا دن تھا، کونسی شام تھی؟ بس اتنا یاد ہے کہ ایک روز وہ اور میں پاک ٹی ہاؤس میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور شیشوں سے اندر آتی دھوپ کی چمک میں اس کا چہرہ روشن اور تر و تازہ تھا۔ ہونٹوں کے کناروں تک جاتی ہلکی مگر پھولی ہوئی مونچھیں سر پر چمکتے ہوئے گھنے گہرے براؤن بال، چھریرا بدن، ہم ایسے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے پہلے بھی مل چکے ہوں۔ یقیناً ہم پہلے بھی مل چکے تھے اور یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں تھی جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ لیکن وہ ملاقات اب نہ اسے یاد ہو گی نہ مجھے یاد ہے۔ سن 49-1948ء کا تھا۔ اشفاق

احمد مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ وہ دو ایک افسانے لکھ کر منفرد افسانے لکھنے والوں کی صف اول میں آ چکا تھا۔ میں بھی دو افسانے لکھ کر منفرد افسانے لکھنے والوں کی صف اول میں آ چکا تھا۔ وہ میرا خیال ہے کہ اپنے شہر اپنے گاؤں کی باتیں کر رہا تھا۔ خالص اپنے انداز میں۔ اس کے لہجے میں ہوشیار پور کا رنگ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کھیتوں کے خرگوشوں' نیولوں اور گلی محلے کے ساتھیوں کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کر رہا تھا کہ میرے آگے سے خرگوش پھدک کر بھاگ رہے تھے۔ نیولے اور سانپ کی لڑائی ہو رہی تھی' اور لوگ باتیں کرتے' ہنستے' کھانستے' کان میں سلائی پھیرتے میری آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے۔ اس کی باتوں میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ وہ ان جانوروں اور انسانوں کی تصویریں ایک ایک دو دو لائنیں ڈال کر بناتا چلا جا رہا تھا۔ ہر انسان ہر چرند پرند کی دو ایک خاص لکیریں ہوتی ہیں۔ جن سے اس کی شخصیت کی کردار کی شناخت ہوتی ہے۔ اشفاق احمد کا قلم بس ان ہی دو ایک لکیروں کو پکڑتا تھا اور وہ شخص' وہ چرند وہ پرند سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ اشفاق احمد کی اپنی شخصیت اور افسانہ نگاری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے۔

ہم اکٹھے مال روڈ کی دوسری سڑکوں اور باغوں میں گھومتے' کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پیتے۔ ہماری کوئی کہانی ادب لطیف یا سویرا یا ادبی دنیا میں چھپتی تو اس پر باتیں کرتے۔ جو چیز کھٹکتی اسے بیان کرتے' جو چیز اچھی لگتی اسے بھی ظاہر کر دیتے۔ پہلے اشفاق احمد ملتان کے مہاجر کیمپ میں کام کیا کرتا تھا یہ اس نے مجھے بتایا تھا۔ شاید 1947ء میں وہ اس کیمپ میں فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ مگر تھوڑی دیر کے لیے۔ پھر وہ لاہور والٹن کے مہاجر کیمپ میں آ گیا۔ بہرحال میری اس سے والٹن مہاجر کیمپ سے نکلنے کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

مزنگ روڈ پر اس نے ایک تین یا چار منزلہ مکان الاٹ کروا لیا تھا۔ اس کے اوپر والے کمرے میں اشفاق احمد رہتا تھا۔ گرمیوں میں یہ کمرہ گرم اور سردیوں میں ٹھنڈا ہوتا تھا۔ کمرے میں کہیں کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا تھا اور کہیں آئیل کلر سے بنائی ہوئی گرد آلود تصویریں پڑی ہوتیں۔ اشفاق کو پینٹنگ کا بھی شوق تھا۔ مگر اس کی پینٹنگ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی اس کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

شروع شروع میں ہم پیدل ہی گھوما پھرا کرتے تھے۔ پھر اس نے ایک سائیکل خرید لی۔ اب وہ سائیکل پر سوار ہو کر ٹی ہاؤس آتا۔ میں مصری شاہ سے باغوں باغ پیدل ہی گوالمنڈی سے ہوتا میو ہسپتال سے نکل کر ٹی ہاؤس آ کر اس کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ میرے دوسرے دوست بھی وہاں موجود ہوتے مگر مجھے اشفاق احمد کا انتظار رہتا کیوں کہ وہ بڑی شگفتہ باتیں کرتا تھا اور وہ مجھے پیارا لگتا تھا۔ ابھی اس کی سونے کی ایک مرکی بھی تانبا نہیں بنی تھی۔ اس کے آتے ہی محفل میں اس کی باتوں کی شگفتگی آ جاتی۔ معمولی سے معمولی بات کو وہ غیر معمولی انداز میں بیان کرتا اور اس کا لہجہ اور خاص خاص لفظ مل کر بات کو تصویر بنا کر سامنے لا کھڑا کرتے۔

اشفاق احمد عورتوں اور لڑکیوں کی باتیں کبھی اس طرح مزے لے لے کر بیان نہیں کرتا تھا جس طرح میرے بعض دوست کیا کرتے تھے۔ شاید ایک بار اس نے مجھے اپنے شہر کی کسی لڑکی کے ساتھ نوعمری کے رومان کا قصہ سنایا تھا مگر بڑا مختصر اور اسے بھی وہ یوں بے تعلقی سے بیان کر رہا تھا جیسے کسی بلی کا ذکر کر رہا ہو۔ جو اس نے پالی۔ اسے دودھ پلایا اور وہ کسی اور بلے کے ساتھ بھاگ گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پیچھے ضرور کوئی زبردست رومان لڑایا ہوگا۔ کیونکہ وہ خوبصورت اور وجیہہ تھا اور آج بھی ہے۔ مگر وہ اپنے اس زبردست رومان کو مجھ سے چھپا گیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس وقت میں تو واشنگٹن میں ہوں۔ واپس لاہور گیا تو اس کی گردن پر گوڈا رکھ کر سارے رومانس باہر نکلواؤں گا۔ لیکن میرا خیال ہے گردن پر گوڈا رکھنے کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ کیوں کہ مجھے شبہ پڑتا ہے کہ اس کی پچھلی زندگی میں زیادہ رومانس نہیں ہیں۔ پاکستان آ کر اس نے پچیس تیس برسوں کی ریاضت کے بعد ایک اکلوتا رومانس لڑایا وہ مجھے معلوم ہے اس کے آگے کتاب ورق خالی ہیں۔

ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد بھی یونیورسٹی یا کالج کی جو بھی لڑکی اس کے افسانوں سے متاثر ہو کر اس کے پاس آتی۔ یہ بڑے ادب سے اس کے ساتھ باتیں کرتا۔ بار بار اسے "کڑیے" کہہ کر مخاطب کرتا ایک بار میں نے کافی ہاؤس کے آگے سے گزرتے ہوئے اس کی بانہہ مروڑ کر سرزنش کی تھی کہ یہ تم ہر لڑکی کو کڑیے کڑیے کیوں کہتے ہو۔ اپنا مستقبل کیوں تاریک کر رہے ہو۔

اشفاق احمد کی مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ وگرنہ اسے بھی اپنی مسکراہٹ پیاری لگتی۔ بہت کم لوگوں کو خوبصورت مسکراہٹ نصیب ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو تو مسکراتے ہوئے دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اشفاق احمد جب مسکراتا ہے تو یہ مسکراہٹ اس کے چہرے سے اتر کر اس کے سارے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔ جب وہ کبھی کبھی قہقہہ لگا کر ہنستا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے بازو ہاتھ اور پاؤں بھی قہقہہ لگا رہے ہیں۔ اس کے قہقہے میں ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس کے نوجوانی کے زمانے میں بھی آواز کم اور ظرافت کی سرگوشی زیادہ ہوتی تھی۔ یہ ظرافت اور قہقہے کا وسیع و عریض پھیلاؤ آج بھی اشفاق احمد کے قہقہے میں ہے مگر سرگوشی کافی کم ہوگئی ہے اور آج اس کا قہقہہ خاموش فلموں کی یاد دلاتا ہے۔

اشفاق احمد کی شخصیت اور باتوں میں ایسا جادو ہے کہ لوگ بہت جلد اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد میں اس کی شخصیت کے مدار کے گرد دو تین خلائی سیارے ضرور گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنا وقت پورا کر کے خلا کی پہنائیوں میں گم ہو گئے اور بعض آج بھی جھول کھا کھا کر گردش کیے جا رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی اس کی صحبت میں بیٹھتا ہے اگر اس کی اپنی شخصیت اور اسلوب میں پختگی نہیں ہے تو اس پر اشفاق احمد کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ میں نے ایسے کئی لوگوں کو اشفاق احمد کی طرح باتیں کرتے اور ہنستے دیکھا ہے جسے میں اچھی بات نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ اشفاق احمد دو نہیں ہو سکتے۔ کسی سے متاثر ہونا الگ بات ہے اور وہ کسی کی شخصیت کو اپنے اوپر طاری کر لینا دوسری بات ہے۔ اشفاق احمد بھی سعادت حسن منٹو کی باتوں اور شخصیت سے متاثر تھا مگر اس نے منٹو کی شخصیت کو خود پر طاری نہیں کیا۔

سعادت حسن منٹو بھی اشفاق احمد کو بہت پسند کرتے تھے۔ میں اور اشفاق احمد جب کبھی منٹو صاحب کے لکشمی مینشنز والے مکان پر جاتے تو وہ اشفاق احمد کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے۔ وہ اشفاق احمد کے افسانوں سے بھی بڑے متاثر تھے۔ کوئی خاص ظرافت کی بات ہوتی تو وہ مجھے چھوڑ کر خاص طور پر اشفاق احمد کو بتاتے۔ مجھے یہ بات بری نہ لگتی۔ کیوں کہ مجھے بھی اشفاق احمد سے اتنی ہی محبت تھی (اور اس سے زیادہ اب محبت ہے) وہ بھی مجھے اتنا ہی اچھا لگتا تھا جتنا منٹو صاحب

کو لگتا تھا۔ میں اصل میں محبت کا آدمی ہوں۔ محبت کر سکتا ہوں۔ دوستی کے اصول وضوابط اور رکھ رکھاؤ کو نبھانا میرے لیے بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اسی لیے میرے دوست کم اور محبوب زیادہ ہیں۔ جس کو میں اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں فوراً اس کے ساتھ محبت ڈال لیتا ہوں۔ اشفاق احمد کے ساتھ بھی پہلے ہی دن سے میں نے محبت ڈال لی تھی۔ جس کا بوٹا اب پھل پھول کر صنوبر کا گھنا درخت بن گیا ہے۔ کمال کی بات ہے کہ میں جو درخت ہاتھ کا تھامے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا۔ اشفاق احمد پر چھ سات صفحے لکھ گیا ہوں اور درخت کا ذکر اب پہلی بار آیا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اشفاق احمد پر مضمون لکھتے ہوئے اگر درخت کا ذکر نہ بھی آئے تو ایسا لگتا ہے کہ آدمی کسی ایسے درخت کا ذکر کر رہا ہے جو کھلا کرتہ پاجامہ پہنے سائیکل پر چلا جا رہا ہوں۔ اشفاق احمد کے اندر ایک درخت چھپا ہوا ہے اس درخت پر چڑیاں بھی بیٹھتی ہیں اور طوطے بھی بولتے ہیں۔ خزاں میں اس کے پتے زرد ہو کر گرتے بھی ہیں اور بہار میں اس کی شاخوں پر نسواری رنگ کی کونپلیں بھی پھوٹتی ہیں۔ لیکن وہ خود اس درخت کا آسیب بن کر اس پر بیٹھ گیا ہے کیوں بیٹھا ہے؟ کب تک بیٹھا رہے گا؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

اس زمانے میں اشفاق احمد اور میں گرمیوں میں زیادہ تر کرتہ پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ سردیوں میں کبھی کبھی میں کرتے کے اوپر گھر سے کشمیری شال جسے ہم شال کبھی نہیں کہتے بلکہ فرد کہتے ہیں اوڑھ کر ٹی ہاؤس آجاتا تھا۔ اشفاق احمد بھی کبھی کبھی سردیوں میں دھسہ یا امرتسری گوجروں والا اسلار اوڑھ کر آجاتا تھا۔ ایک روز تو اس نے کمال کر دیا۔ رنگدار پھٹیوں والی لنگی پہن کر ٹی ہاؤس آ گیا۔ اس کی وہ تصویر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ٹی ہاؤس کے دروازے کے ساتھ والی میز کے پاس صوفے پر بیٹھا تھا۔ بادامی رنگ کا کرتہ تھا اور رنگین پھٹیوں والی لنگی پہن رکھی تھی کہنے لگا یہ پنجابی لباس ہے۔ خالص پنجاب کے گھی مکھن کی طرح۔

یہ مضمون میں امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا آخری ہفتہ ہے۔ باہر بادل چھائے ہیں اور بارش ہو رہی ہے۔ کچن میں ریحانہ بند گوبھی پکا رہی ہے۔ بند گوبھی کی کھلی ہوئی خوشبو اپارٹمنٹ میں پھیلی ہے۔ اس بارش سے مجھے اسی

زمانے کے لاہور کا وہ دن یاد آ رہا ہے جب برسات کی پہلی یا دوسری جھڑی لگی تھی کہ میں اور اشفاق احمد اپنے ایک موٹر کار والے دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر نہر پر نہانے کے لیے لائل پور کو جاتی سڑک پر نکل گئے۔ شاید شیخوپورہ سے آگے نکل کر یا اس سے پہلے ایک بڑی بھرپور نکونکا، بھری ہوئی۔ بھاری بھرکم کشادہ نہر آ گئی۔ ہم نے وہیں گاڑی روک لی۔ پل پر سے آم خریدے۔ انہیں ٹوکری میں ڈال کر نہر کے ٹھنڈے یخ پانی میں ٹھنڈا کیا۔ آم چوس کر گٹھلیاں نہر کے دوسرے کنارے پر پھینکنے کی کوشش کرتے۔ شیشم یعنی ٹاہلیوں کے درخت یا محض ٹاہلیاں نہر کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھیں۔ نہر کے چوڑے چکلے بلوریں سینے پر ان کے سبز عکس پڑ رہے تھے۔ نہر کا پانی کناروں پر سبز لگتا تھا۔ اشفاق احمد نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس نے پائنچے اوپر اڑسے اور دھڑام سے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ نہر میں جاتے ہی اس کی شلوار کے پائنچے پھول گئے۔ میں بڑا ہنسا۔ اشفاق احمد بڑے مزے سے کپڑوں سمیت نہر میں تیرتا ہوا دوسرے کنارے تک گیا اور پھر واپس آ گیا۔ وہ پانی میں شرابور بلکہ لزوج تھا۔ مجھے اس کی یہ ادا بڑی اچھی لگی تھی۔

اشفاق احمد کی کئی ادائیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میں نے کہہ دیا ناں کہ میں محبت کا بندہ ہوں۔ میں اس مضمون میں اس کی شخصیت کا نفسیاتی' مافوق النفسیاتی' طبیعاتی' مابعد الطبیعاتی تجزیہ نہیں کر رہا۔ میں تو صرف اپنی اس محبت کو بیان کر رہا ہوں جو مجھے اس کے ساتھ تھی اور ہے۔ اگر کسی نے اشفاق احمد کی نفسیاتی گہرائیوں کا مطالعہ کرنا ہے تو وہ اس پر لکھا ہوا کوئی دوسرا تجزیاتی اور مابعد الطبیعاتی مضمون پڑھیں۔ میرے مضمون کو تو صرف وہی لوگ پڑھیں جو محبت کے بندے ہوں۔ یا اگر کوئی بھی نہ پڑھے تو کم از کم اشفاق احمد ضرور پڑھے۔ کیوں کہ وہ خود محبت کا بندہ ہے۔ اس محبت کے سچے سونے کو اس نے خدا جانے کس کس تیزاب کی پٹھ دے دے کر اس کا تانبا بنانے کی کوشش کی مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ تانبا نہ بن سکا۔ اب آخری عمر میں سونا اشفاق احمد کے خوب کام آ رہا ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''گڈریا'' چھپا تو مجھے اس سے اور زیادہ محبت ہو گئی اس افسانے میں اس کے اصل سونے کی چمک دمک تھی۔ ہلکی زرد کھری خالص چمک اس افسانے پر بحث کرنا'

تنقید کرنا' اس کی چیر پھاڑ کرنا میرا کام نہیں ہے۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ اگر آپ مجھے اپنا ہاتھ دیں تو میں آپ کا ہاتھ اس افسانے کے دل پر رکھ دوں گا اور جب آپ ہاتھ اٹھائیں گے تو اس افسانے کا دل آپ کے ہاتھ میں دھڑک رہا ہوگا۔ مجھے تو دل پر ہاتھ رکھنا آتا ہے۔ کیوں کہ میں محبت کا بندہ ہوں اور میں نے اشفاق احمد کے دل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ قصہ ختم! یہ محبت اسی لیے بڑی اچھی شے ہوتی ہے۔ سب بک بک جھکوں سے نجات دلا دیتی ہے۔ دوستی میں دوست کے عیبوں پر اس کی کمزوریوں اور خامیوں پر بھی نظر جاتی ہے۔ محبت میں کوئی عیب کوئی کمزوری نہیں آتی۔ اپنی وفا پر نگاہ نہیں جاتی محبوب کی جفا سب یاد رہتی ہے۔

اشفاق احمد مزنگ سے نکل کر سمن آباد میں آ گیا۔ پہلے وہ نیو مارکیٹ میں سکول کے پاس رہتا تھا۔ پھر گراؤنڈ کے پاس ایک مکان میں آ گیا۔ آج کل اس گراؤنڈ میں ایک بڑا خوبصورت باغ ہے بلکہ تھا کہنا چاہیے کیوں کہ وہاں ایل ڈی اے نے ایک سپورٹس کمپلیکس بنا دیا ہے جس نے باغ کی خوبصورتی کو محدود کر دیا ہے۔ اس زمانے میں یہ گراؤنڈ ایک ویرانہ تھا۔ جس میں گدھے لوٹتے رہتے تھے۔ گرد اڑتی رہتی تھی۔ گراؤنڈ کے درمیان کھجور کے تین درخت ایک ہی تنے میں سے نکلتے ہوئے تھے۔ میں اسے تین بہنیں کہا کرتا تھا۔ اسی گراؤنڈ کے کنارے اشفاق احمد کا مکان تھا۔ ایک صوفہ سیٹ تھا کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف تھے۔ پیچھے صحن تھا۔ ایک باورچی خانہ تھا۔ قدسیہ بھابی وہاں بیٹھ کر روٹیاں پکاتی تھیں۔ ایک روز بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں فلیمنگ روڈ سے چل کر اشفاق احمد کے گھر آیا۔ قدسیہ بھابی نے ریفریجریٹر میں سے ٹھنڈی بالائی نکال کر کھلائی۔ خدا اسے خوش رکھے بالائی کا خوشبودار ذائقہ آج بھی یاد ہے۔ اشفاق احمد ہوتا تو شاید ڈنڈی مار جاتا۔ لیکن پھر میں خود جا کر بالائی نکال لیتا۔ مگر وہ ڈنڈی نہیں مارتا اس کا ترازو بڑا اچھا ہے اور اس میں کوئی جھول نہیں۔ کسی پاسکو کی ضرورت نہیں۔

اس نے ''داستان گو'' رسالے کے اجرا کا سوچا تو قدسیہ بھابی کے ساتھ میرے فلیمنگ روڈ والے مکان پر آیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اس نے مال روڈ یعنی آج کی شاہراہ قائداعظم پر دفتر بنایا اور ''داستان گو'' شروع ہو گیا۔ اس رسالے میں

اس کے منفرد سائز سے لے کر اس کے مواد تک ہر چیز میں اشفاق احمد کی بھرپور شخصیت جھلک رہی تھی۔

اب داستان گو کے دفتر کا پردہ اٹھتا ہے۔ سٹیج پر ایک طرف میز لگی ہے وہاں اشفاق احمد بیٹھا ہے۔ دیوار کے ساتھ صوفہ لگا ہے اس پر میں اور ''داستان گو'' کا کمال کا آرٹسٹ اور پیارا انسان پرویز بیٹھا ہے۔ ادیبوں' شاعروں اور ریڈیو کے فنکاروں کا آنا جانا لگا ہے۔ ''داستان گو'' کا دفتر ایک شاہ نشین قسم کا نیچی چھت والا کمرہ ہے۔ ریڈیو کا مشہور آرٹسٹ محمد حسین بھی یہاں آ کر بیٹھا ہے۔ صبح سے شام تک داستان گو کے دفتر میں رونق لگی رہتی ہے۔ اشفاق احمد نے اپنے گھر میں کیمروں' کیمرہ لینزوں' پریس کی سیاہیوں اور مائیکروفونوں اور بلاکوں کے ٹوکرے بھر بھر کے رکھے ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں بھی بڑا کاریگر آدمی ہے۔ کتاب رسالے سرورق کی پرنٹنگ کے تمام حساب کتاب سے واقف ہے۔ یہاں اس کے سونے کی کچھ مرکیاں تانبے میں بدل گئی ہیں۔ ''داستان گو'' رسالہ زیادہ دیر کاڑھ نہ نکال سکا۔ یعنی چل نہ سکا اور ایک روز بند کر دیا گیا۔ دفتر اس کے بعد کافی دیر تک ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ پھر اس دفتر کی بھی کھڑکیاں دروازے بند ہو گئے۔ خدا جانے اشفاق احمد نے اس دفتر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔

اشفاق احمد ریڈیو پر تلقین شاہ کا سلسلہ شروع کرنے لگا تو اس نے ایک روز ریڈیو سٹیشن کی پرانی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے مجھے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کے بارے میں ریڈیو سیریز شروع کر رہا ہوں جو دوسروں کو نصیحتیں کرتا ہے مگر خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ میرے دماغ میں اس کا نام تلقین شاہ ہے۔ اشفاق احمد میں یہ بڑی خوبی ہے بات کی تہہ میں اتر کر پانی کے اندر زمین کے ساتھ لگا ہوا آخری سیپ اٹھا کر لے آتا ہے۔ ایک ایسے کردار کے لیے جو دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور خود اس پر عمل نہ کرتا ہو' تلقین شاہ بڑا موزوں نام تھا۔ سیریز شروع ہو گئی۔ اشفاق احمد خود تلقین شاہ بن گیا۔ وہ کچھ ہوشیار پوری' کچھ روہتکی' کچھ پٹیالوی لہجے میں بولتا بڑا اچھا لگتا۔ میں اس کے پروگرام کو آج بھی امریکہ آنے تک بڑے شوق سے سنتا تھا۔

اشفاق احمد لیل و نہار میں آ گیا۔ یہ پاکستان ٹائمز کے ادارے کی جانب سے شائع

ہونے والا ایک ہفت روزہ جریدہ تھا۔ اشفاق احمد نے یہاں بھی بڑی محنت سے کام کیا۔ بڑی ذمہ داری سے کام کیا اور ''لیل و نہار'' بڑی خوبی سے چلتا رہا۔ یہاں میں آپ کو ایک بات بتا دوں اشفاق احمد بڑا دیانت دار اور ہر کام بڑی دیانت داری سے کرتا ہے۔ میں تقریباً ہر روز لیل و نہار کے دفتر میں جا کر اس کے پاس کچھ وقت گزارتا تھا۔ ہم چائے پیتے باتیں کرتے۔

جب تک اشفاق احمد لیل و نہار میں رہا وہاں بڑی رونق رہی اور میں ہر دوسرے تیسرے روز بلکہ کبھی کبھی ہر روز اس کے پاس گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضرور گزارتا تھا۔ پھر ایک روز اس نے لیل و نہار چھوڑ دیا اور ریڈیو کی طرف رجوع کر لیا۔ ابھی اس کے پاس سائیکل تھی' سکوٹر نہیں آیا تھا۔ ایک روز میں ایبٹ روڈ پر ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ وہ مجھے سائیکل پر ریڈیو سٹیشن کی طرف سے آتا ہوا مل گیا' کہنے لگا۔

''اوئے رتن سینما میں انڈیا کی فلم ''جھنک جھنک پائل باجے'' ایک ادارے کی طرف سے دکھائی جا رہی تھی۔ جاؤ ریحانہ کو ساتھ لو اور جا کر فلم دیکھو رقص ہی رقص ہیں۔''

میں تو دفتر نہ جانے کے موقع تلاش کیا کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں بڑی معقول اور وزنی وجہ تھی وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ اگر دفتر نہ جانے کی کوئی وزنی وجہ نہ بھی ہو تو میں اس میں اپنی طرف سے وزن ڈال لیا کرتا ہوں۔ لیکن یہ تو بڑی معقول وجہ تھی اور اس میں پہلے ہی کافی وزن تھا۔

اشفاق احمد سمن آباد سے ماڈل ٹاؤن چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنی محنت کی کمائی سے ایک خوبصورت مکان بنوایا۔ صحن میں ایک درخت لگایا۔ میں بھی فلیمنگ روڈ سے سمن آباد والے مکان میں آ گیا۔ سکوٹر نے اشفاق احمد کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اب اس کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ فاصلے زیادہ ہو گئے۔ اب روزانہ کی ملاقات نہ رہی۔ میرا بیٹا مسعود احمد میٹرک میں پاس ہوا تو میں نے اپنے عزیزوں' رشتہ داروں اور دوستوں کی دعوت کی' اشفاق احمد اور بھابھی قدسیہ کو بھی بلایا۔ دیگیں دم ہو رہی تھیں' صحن میں نواری کرسیوں پر میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا اعجاز حسین بٹالوی بھی اپنے بچوں اور بیگم کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ میں آج بھی ان کا شکر گزار ہوں کہ وہ میرے گھر آئے اور مجھے خوشی اور عزت بخشی۔ پلاؤ کی دیگیں نکل آئیں' سبحان اللہ کیسی خوشبو اڑی' میں بڑا

خوش تھا۔ میرے پیارے دوست وہاں موجود تھے' رات دیر تک یہ مجلس گرم رہی۔

اشفاق احمد نے ٹیلی ویژن پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے کئی ایک ڈرامہ سیریز لکھیں اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھیں جب میں لاہور سے امریکہ روانہ ہوا تو اس سے ذرا پہلے اشفاق احمد کی ایک ڈرامہ سیریز غالباً '' اور ڈرامے'' چل رہی تھی۔ لوگ اس کے خلاف تھے کہ کردار لمبے لمبے واعظ کرتے ہیں۔ مگر میں اسے بڑے شوق سے دیکھا اور سنا کرتا تھا۔ اب اشفاق احمد کی باتیں غور سے سننے کے لائق ہو رہی تھیں۔ جس سونے کو اس نے تانبے میں بدلے کی غیر شعوری کوششیں کی تھیں۔ اب وہ کندن بن کر دمکنے لگا تھا۔ اب یہی کندن تلقین شاہ میں بھی دکھائی دیتا تھا مگر تانبا اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ جیسا کہ ہمارے قبیلے کے ہر فرد کے اندر کام کر رہا تھا۔ جیسا کہ ہمارے قبیلے کے ہر فرد کے اندر کام کرتا رہتا ہے جو اس کے عمل سے غافل ہو گیا ہو یعنی تغافل برت رہا ہو اس تانبے کو گال کر سونا بنانا پڑتا ہے بلکہ اس کے ساتھ گل کر سونا بننا پڑتا ہے۔ اب ایسا ہوا تھا کہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ اشفاق احمد کے دونوں پہلو بالکل سامنے دھوپ میں پڑے دکھائی دے رہے تھے اور ایک دوسرے کو دشمنی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اشفاق احمد کا سونے کا پہلو زیادہ نمایاں اور غالب تھا۔

وہ اُردو مرکز میں آ گیا تھا۔ اب کبھی کبھار کسی سبب سے اس کے پاس جانا ہوتا تو ملاقات ہو جاتی۔ جتنی دیر اس کے پاس بیٹھتا پرانے زمانے کی باتیں کرتا رہتا۔ کیونکہ اس کے نئے زمانے کی چیزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاف سیٹ چائے اور بسکٹ .... اور ہم باتیں کرتے رہتے۔

وہ اُردو مرکز کے صحن میں دھریک کا درخت لگوانا چاہتا تھا' دھریک کے درخت کے نام پر میرا چہرہ گرم ہو گیا اور چائے کی خوشبو نے میرے جسم کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ہم دونوں اٹھ کر باہر صحن میں آئے۔ وہ جگہ طے کی جہاں درخت لگوانا تھا۔ پھر میں واپس چلا گیا۔ اب اس کے پاس جانے سے پہلے چپڑاسی سے گزرنا پڑتا تھا۔ جو بات مجھے پسند نہیں تھی۔ اب اس کی اور میری محبت کے درمیان سیکرٹری اور چپڑاسی کا پردہ حائل ہو گیا تھا۔ جب سوچتا کہ اسے ملنے کے لیے پہلے اس

کے پہرے دار کو ملنا پڑے گا اور اس کے ساتھ فون پر بات کرنے سے پہلے اس کے سیکرٹری سے بات کرنی پڑے گی تو میں اشفاق احمد کو ملنے کا خیال ہی دل سے نکال دیتا۔

جب کبھی اس سے ملاقات ہوتی تو میں دیکھتا کہ اب وہ تصوف کی طرف مائل ہے۔ تصوف کی بڑی بڑی موٹی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے۔ وہ باتیں کرتا رہتا اور میں چائے کی خوشبو میں مست ہو کر سنتا رہتا۔ پھر کسی نہ کسی بہانے اٹھ کر باہر کھلی ہوا میں درختوں کے پاس آ جاتا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ کھلی ہوا میں زیادہ تصوف ہوتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد سے جو مجھے پیار ہے وہ دوبارہ کھینچ کر مجھے اس کے اونچے لمبے پردوں والے کمرے میں لے جاتا تھا جہاں گرمیوں میں سخت ٹھنڈ ہوتی اور سردیوں میں گرمی لگتی تھی۔ سردیوں کا موسم ہوتا تو وہاں سے نکل کر باہر ٹھنڈ میں آ کر گرمیوں کا موسم ہوتا تو باہر گرم لو اور دھوپ کی تپش میں آ کر خدا کا شکر ادا کرتا۔ یہاں واشنگٹن میں اس وقت سخت سردی پڑ رہی ہے۔ ہیٹنگ ہماری اپارٹمنٹس میں ہے۔ مگر میں نے ہیٹنگ اون نہیں کی۔ ہلکی ہلکی خنکی میں بیٹھا چائے کی پیالی سامنے رکھے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ گرمیوں کے موسم میں اپارٹمنٹ کی کولنگ اون کرنے والا شائد پوری بلڈنگ میں آخری آدمی ہوتا ہوں۔ کیونکہ مجھے سخت سردی اور جھلسا دینے والی لو بڑی عزیز ہے۔

لاہور میں تھا تو اشفاق احمد سے روزانہ ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ لیکن جس روز اس کا ٹی وی پر ڈرامہ ہوتا تو میں اسے ضرور دیکھتا۔ کیونکہ اس ڈرامہ میں کہیں نہ کہیں مجھے آج سے تیس برس پہلے والا اشفاق احمد دکھائی دیتا تھا۔ میں اس کے تانبے میں سے اس کا اصلی پاسے کا سونا تلاش کر لیتا تھا۔ بس مجھے یہی چاہیے ہوتا تھا۔ دوست کی شکل نظر آ جائے۔ دوست کی آواز آ جائے۔ اس سے زیادہ بھلا اور کس چیز کی ضرورت ہے اور اس سے بہتر اور شے ہو بھی کیا سکتی ہے؟

اور اسے ساتھ لے کر اس کے دفتر کے باہر دھریک کے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ کر چائے بناؤں گا۔ ایک پیالی خود لوں گا۔ ایک پیالی اسے دوں گا اور سگریٹ سلگا کر اسے درخت کی شاخوں میں کھلے ہوئے کاسنی پھولوں کو دکھا کر کہوں گا۔

''دھریک کے کاسنی پھولوں کی خوشبو میں اس درخت کی روح ہے۔''

اور پھر اشفاق احمد کو اپنے اندر کا درخت یاد آئے گا۔ اپنا سونا یاد آئے گا اور اس کا چہرہ اسی طرح روشن ہو جائے گا۔ جیسا کہ آج سے تیس برس پہلے ٹی ہاؤس میں روشن تھا۔ جب وہ میرے سامنے بیٹھا تھا اور شیشے میں سے اندر آتی دھوپ کی چمک اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

روزنامہ ''نوائے'' وقت لاہور

19 ستمبر 2004ء

آہ اشفاق احمد بھی چل دیئے

مسرت لغاری

(فکر جہاں)

صد افسوس داستان سرائے کا مسافر زندگی کی داستان سناتے سناتے اچانک چل دیا لوگوں میں آسانیاں بانٹنے اور انہیں دوسروں میں آسانیاں بانٹنے کی توفیق کی دعا دینے والا سب کو مشکل میں ڈال گیا ہے۔ ابھی تو خدا جانے اس کے کتنے عقیدت گزاروں اور کتنے چاہنے والوں نے اپنی اپنی زندگی کے مسائل و مصائب کا اس سے حل پوچھنا تھا؟ کتنوں نے کتنا کچھ اس سے حاصل کرنا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ سوچے بغیر آنکھیں ایک دم بند کر لیں اور زبان پر خاموشی طاری کر لی۔ صدمہ اتنا گہرا اور دھچکا اتنا شدید ہے کہ سمجھ نہیں آ رہی تعزیت کس کے ساتھ کر کے دل ہلکا کیا جائے۔ بانو آپا کے ساتھ یا پھر اپنے آپ کے ساتھ؟ کیونکہ صدمہ اس کے سب ساتھیوں کیلئے ہم وزن اور برابر ہے لیکن خود کو خود تسلی دینا ایک مشکل کام ہے۔

اشفاق صاحب سے ہماری پہلی ملاقات لاہور ٹی وی سٹیشن پر ہوئی۔ پروگرام تھا ''ہدف''۔ ہم یونیورسٹی کی ایم اے کی طالبات اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ سامنے بورڈ پر درج مختلف موضوعات پر ہم نے نشان لگانا تھا اور پھر اسی موضوع پر اشفاق صاحب نے ہم سے سوالات کرنے تھے۔ میں ان دنوں ''فنون'' میں جس کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی صاحب ہیں اور ماہ نو اور ادب لطیف جیسے رسائل میں افسانہ لکھ رہی تھی' شاعری کر رہی تھی۔ سو دل میں دعا کی کہ کاش ہمارا نشانہ ادب کے موضوع پر جا لگے۔ بہر حال پروگرام شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے میں ان کے پاس جا بیٹھی اور کہا کہ سر آپ تو مجھے بحیثیت ادیبہ جانتے ہیں۔ میرا نشانہ جس بھی موضوع پر لگے آپ نے سوال بہر حال ادب پر ہی کرنے ہیں۔ میری بات سن کر زور سے ہنسے پھر کہا ''شرارت کرتی ہو بے ایمانی سکھاتی ہو؟ بھئی جس موضوع پر نشانہ لگا میں تو اسی کے بارے میں سوال پوچھوں گا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میرا نشانہ کھیل کی خانے پر جا لگا۔ سخت گھبرائی، پروگرام لائیو

تھا ایک دم بات سنبھالتے ہوئے بولے بھئی لڑکی ہو کر تم کھیل کے بارے میں کیا کہوگی یہ بتاؤ فنون اور نقوش جیسے بڑے بڑے ادبی رسائل میں کب سے لکھنا شروع کیا اور کیوں؟ میری بات بن گئی خوب سوال جواب ہوئے۔

اس کے بعد کئی ملاقاتیں ادبی محافل میں ہوئیں' میرے افسانوں کیلئے تعریف کا فون ضرور کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد میری شادی ہوگئی' ملک سے باہر چلی گئی' واپس آئی تو زندگی چولا بدل چکی تھی' تصوف اور روحانیت مطلوب و مقصود حیات ٹھہرا۔ اس حوالے سے اشفاق صاحب سے خط و کتابت ہوتی رہی' ان کا اپنا بھی یہی پسندیدہ موضوع تھا' خوب خوب بحث ہوتی تھی۔ ایک روز لاہور سے اشفاق صاحب کا خط ملا کہ تم چھوٹی عمر ہونے کے باوجود ایک مشکل لڑکی ہو میں کل ہی تمہارے پاس راولپنڈی آ رہا ہوں' زندگی روحانیت' تصوف اور مذہب پر بات ہوگی۔ بہر حال اگلے دن دس بجے کی فلائٹ سے آ گئے' لمبی نشست لگی' بحث ہوئی بلکہ باقاعدہ مناظرہ ہوا' اسی دوران دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا قدرت اللہ شہاب صاحب بھی آ گئے کھانے کے بعد ایک بار پھر طویل بحث ہوئی۔ جاتے وقت بے حد شفقت سے دونوں نے مجھے روحانیت کے نئے بابرکت سفر پر دعائیں دیں' بعد میں گفتگو کا یہ سلسلہ فون پر اور خطوط میں جاری رہا۔ ملاقاتیں بھی ہوئیں' جب میری کتاب ''تیسری آنکھ سے'' شائع ہوئی اور میں نے بھجوائی تو حیران نہ ہوئے بلکہ بے پناہ خوش ہوئے۔ فون پر کہا تبصرہ بھیج رہا ہوں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ تم کسی دوسری دنیا کی باسی ہو بہت بہت مبارک ہو.......!

قارئین! انہوں نے جو کچھ لکھ بھیجا میں سمجھتی ہوں وہ ایک مکمل صوفی' درویش صفت اور کھرے دل و دماغ کے انتہائی ایماندار شخص کی رائے ہے۔ میں شائد اس پر پوری نہیں اتری' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں اپنے قرب خاص میں جگہ دے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

20 ستمبر 2004ء

داستان سرائے کی ڈیوڑھی کا سناٹا

بشریٰ اعجاز

(تاثرات)

یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے جمہوراتی کے دور میں ایک ایسے داستان گو کا ذکر کیا ہے جو کہانی اس موثر انداز میں سناتا تھا کہ لوگوں پر جادو سا کر دیا کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس داستان گو نے ایک بار آدھی رات کے وقت کہانی سناتے سناتے صحرا کی گرم دوپہر کا نقشہ اتنی قادر الکلامی سے کھینچا کہ اکثر لوگوں کو کہانی سنتے سنتے شدید گرمی کا احساس ہوا اور وہ چشمے کی طرف نہانے کیلئے دوڑ پڑے۔ ہمارے اس عہد کا آخری داستان گو بھی اپنے اندر کچھ ایسا ہی کمال رکھتا تھا۔ داستان سرائے کی نیم ڈیوڑھی اور لوہے کی جالیوں اور سفید گرل لگی دالان میں جب وہ سفر کی صعوبتوں سے تھکے ماندے مسافروں کو زندگی کی قدیم و جدید کہانیوں میں ہلکی سی مبالغہ آرائی اور اپنے لب و لہجے کی خالص چاشنی شامل کر کے سنایا کرتا تھا تو ان کی صعوبتیں دفعتہً ہلکی پڑنے لگتی تھیں ان کے دلوں کی دیواریں شق ہونے لگتی تھیں اور وہاں سے خدا، محبت، نیکی، سچائی اور روشنی کے چشمے ابلنے لگتے تھے، جہاں سے چلو میں اپنی بھر کر وہ اپنے گرد و پیش میں چھڑکتا رہتا تھا۔ رفعِ بلیات کیلئے؟ مگر 7 ستمبر بروز منگل یہ داستان گو اپنے سینے میں کہی نہ جا سکنے والی داستانوں کا ایک دفتر لیے دنیا سے رخصت ہو گیا اور تھکے ماندے منتظر مسافروں سے بھی داستان سرائے کی نیم روشن ڈیوڑھی اور جیتا جاگتا دالان خاموشی سے کھڑے تکتے رہ گئے۔ وقت کی جلد بازیوں کے یہی قصے ہیں اس نے بھی کسی کو چھوڑا ہے جو ہمارے داستان گو کو چھوڑتا!!

مجھے یاد آ رہا ہے عمر کے اول دنوں کا وہ وقت، جب میرے ہاتھ داستان گو کی کہانی "گڈریا" لگی تھی، جسے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا تھا اور اس کے بعد میری جو حالت ہوئی، گڈریا کے غصیلے، عجیب و غریب چلنے والے داؤ جی تو جیسے میرے دل میں آ کر بیٹھ ہی گئے جاتے ہی نہ تھے۔ ان کا کردار اور اس کی ہمہ جہتی بیک وقت نرمی اکھڑ پن، سخت گیری، مظلومیت

'دانش اور روحانیت نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ ان دنوں وہ کردار میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گیا تھا اور مسلسل درد کرتا تھا' خصوصاً اس کا آخری حصہ'' اوہ پیا جاندا ای فرید المیاں والا'' نے تو دل کے اندر ریل ہی چلادی۔ آنسو تھمتے ہی نہ تھے اور حیرت کی یہ بات ہے کہ اب بھی کبھی وہ افسانہ پڑھوں تو یہی حال ہوتا ہے۔

یہی عالم اس زمانے میں ''ایک محبت سو افسانے'' دیکھتے ہوئے ہوا کرتا تھا' وہ تمام ڈرامے کچھ اس قدر چونکا دینے والے اور دل کی تہوں کو جھنجھوڑنے والے تھے کہ انسان ان کے ختم ہو جانے کے بعد تادیر ایک گمشدہ سی حالت میں اس جہان محبت (جو اشفاق صاحب کا بنایا ہوا ہوتا تھا) میں بیٹھا خود یہ باور کرانے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ ابھی ابھی اس نے جو دیکھا وہ اس کی اپنی وہ بات نہیں جو اس پر اسی گھڑی منکشف ہوئی ہے۔ یہ محض ڈرامہ ہے' جواب ختم ہو چکا ہے' مگر یہ ختم ہو جانے والا ڈرامہ اپنے اندر کچھ ایسا چھپا ہوا سحر رکھتا تھا کہ اسے دیکھنے والا' اس کا میری طرح شکار ہو جاتا تھا۔

ان ڈراموں نے ان دنوں سارے ماحول کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا' جسے دیکھو وہ 'ایک محبت سو افسانے کی کہانی کو دہرا رہا ہوتا تھا۔ جس کا اختتامیہ درد والم کی سیاہ روشنائی سے لکھا ہوتا تھا۔ انہی کیفیات کے دوران میں میرے حافظے پر تلقین شاہ ابھرتا ہے' جس کو اپنی ناسمجھی کے زمانے میں بھی میں اتنے ہی ذوق و شوق سے سنا کرتی تھی جتنا کہ بعد میں۔ حالانکہ ہدائت کی بے ہدایتی اور شاہ جی کی چٹکلوں اور روزمرہ کے عام فہم گفتگو میں کی جانے والی بڑی بڑی باتیں میری سمجھ میں کم ہی آیا کرتی تھیں' مگر اس ریڈیائی پروگرام میں خدا جانے ایسا کیا تھا کہ ہمیشہ اس کے ختم ہو جانے پر اس کے دوبارہ نشر ہونے کا انتظار شروع ہو جاتا تھا۔

توتا کہانی' ناہلی تھلے' اُچے برج لہور دے' شاہلا کوٹ' منچلے کا سودا اور زاویہ..... کیسے کیسے ناقابل فراموش اور انوکھے ڈرامے اور تمثیلیں ہیں' جنہیں دیکھنے والوں نے ذاتی تجربات اور قیمتی رازوں کی طرح اپنی فکر کا حصہ بنا رکھا ہے۔ ان کے کام پر نظر کی جائے تو یقین نہیں آتا ایک انسان ایک ہی زندگی' مگر اتنا کام' کس قدر بھرپور متحرک اور کارآمد زندگی کا اس قدر پُرمعانی

اور بھرپور استعمال' بھلا ہر ایک کے بس میں کہاں؟ کون جی سکتا ہے اتنے محاذوں پر گزاری ہوئی اس قدر جاندار زندگی اور کون اس کا حق ادا کر سکتا ہے؟ ریڈیو' ٹیلیویژن' دفتر' داستان سرائے' ادبی محافل' فنکشن' مضامین' کہانیاں' ڈرامے' میل ملاقات' بابے' تصوف اور خارجی و باطنی سفر در سفر ..... اور اس پر کمال یہ کہ ہر جگہ بھرپور اور مکمل موجودگی ..... اتنے کام کے باوجود انہیں ہشاش بشاش اور چاق و چوبند دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ باتیں شروع ہوتیں تو بات سے بات نکلتی چلی جاتی تھی' پرت در پرت' پہلو در پہلو نجانے کہاں سے کہاں گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا' مگر اتنا دلچسپ کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

جس محفل میں اشفاق صاحب موجود ہوتے وہ محفل ان کی موجودگی سے بھری بھری نظر آتی' مگر نمایاں نظر آنے کے باوجود نمایاں ہونے کی نفی ان کی شخصیت سے چھلکتی رہتی۔ اپنے مخصوص انداز میں جب بولنا شروع کرتے تو لوگ پروانوں کی طرح ان کی طرف کھنچے چلے جاتے۔ کیا چھوٹے' کیا بڑے' کیا عام کیا خاص سبھی یکساں شمولیت سے انہیں ملتے اور کسی کو بھی گلہ نہ ہوتا اب بہت عرصے سے ان کی گفتگو کا موضوع بھی عام لوگ تھے۔ مٹی بن کر رہنے والے' بنگلوں اور پوش علاقوں میں رہنے والی بیگمات کے بجائے وہ پھاتاں' نبھیاں اور سکینال کی بات کرتے تھے اور جی بھر کر کرتے تھے۔

انہی برسوں میں خواص کو ان کے ڈراموں سے یہ گلہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ان میں اپنے بھاری بھرکم نظریات اور تصوف بلاوجہ ٹھونس کر انہیں بوجھل کر دیتے ہیں۔ اور کرداروں کی زبانی لمبی لمبی تقریروں میں بیان کردہ ان کے فلسفے کی دیکھنے والوں کو سمجھ نہیں آتی' مگر مٹی پر مٹی بن کر رہنے والوں کو ان سے ایسا کچھ گلہ نہ تھا۔ ان کے ڈراموں' کہانیوں اور گفتگو میں عموماً دور دراز کے ویرانوں میں رہنے والے بابے' سڑکوں پر جوتے گانٹھتے موچی بابے' نائی بابے' ترکھان' لوہار' ریڑھی بان اور تانگہ بان بابے' درگاہوں' حجروں اور کٹیاؤں کی خاموشی اور پراسراریت میں پاک انفاس سے خلیوں اور سانسوں میں اللہ ہو جگاتے تہمد پوش بابے نظر آتے تھے' جن کے درمیان مزے سے آلتی پالتی مارے بیٹھے' وہ خدا اور اس کے دوستوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔

انہوں نے پتہ نہیں کن کن رنگوں' بھیسوں اور رُوپوں میں ان بابوں کو پایا تھا کہ ان کی پوٹلی کا مال ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے لٹانے کے عادی تھے۔ محبت' شفقت' خیر' نیکی' سچائی' حقیقت اور انکساری کتنا کچھ تھا اس چھوٹی سی پوٹلی میں جسے لے کر وہ تمام عمر بیچ چوراہے پر بیٹھے رہے اور ہو کا لگاتے رہے' لے لو جتنا جی چاہے اور لینے والوں نے جھولیاں بھر بھر لیا' مگر مال پھر بھی ختم نہ ہوا۔ ہاں عمر کی پونجی ختم ہوگئی۔ مگر وہ زیادہ خرچنے سے تھوڑا کم ہوتی ہے' اس کی کمی بیشی کا تو سسٹم ہی الگ ہے' جو عمر کے راشن ڈپو سے وصول کردہ زندگی کے کارڈ پر اپنی مقررہ سانسوں کا جتنا کوٹہ لکھوا کر لایا ہوگا' اس قدر خرچ کر سکے گا' اس سانسوں کے راشن کارڈ کا پوٹلی کے مال سے کوئی تعلق نہیں' یہ تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ پوٹلی کے مال کو کل کی فکر کے بنا بغیر بخیلی کے خرچ کرنا' ہر کسی کے بس میں نہیں۔ مگر ہر کوئی اشفاق صاحب ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

مجھے تو لگتا ہے داستان سرائے کے آخری داستان گو کے چلے جانے کے بعد دنیا سے اب داستان گوئی کا وہ باب بھی رخصت ہوا' جو قدیم روایتوں سے جڑا ہوا تھا اور ہمارے تہذیبی اور ثقافتی رویّے کا امین تھا۔ گاؤں کے چوپالوں میں' سردیوں کی لمبی شاموں اور نہ ختم ہونے والی یخ بستہ راتوں میں' چلم سلگا کر' الاؤ روشن کر کے بڈھے داستان گو کے گرد جمع ہو کر۔ پریوں' جنوں' شہزادیوں اور بہادر شہزادوں کی کہانیاں سننے اور زندگی کے بارے میں جمع شدہ سوالوں کو ضرب اور تقسیم کرنے والے لالٹینوں کے دھندلے شیشوں سے نکلتی پیلی مدہم روشنی میں دیواروں پر ابھرتے سایوں اور ہیولوں بھرے ماحول میں چھینٹ کی پھولدار رضائیاں اوڑھ کر بڈھی نانی کے گرد کہانیوں کے لالچ میں گھیرا ڈال کر بیٹھنے والے بھی ان محفلوں کے آہستہ آہستہ اجڑ جانے کے بعد عہد حاضر کے آخری داستان گو کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ جو داستان سرائے کی نیم روشن ڈیوڑھی میں بیٹھ کر ایسی ایسی داستانوں کے باب کھولتا تھا' جو عہد عتیق سے شروع ہو کر عہد حاضر کے جدید سائنسی دور تک اتنی آہستگی اور خوبصورتی سے بڑھتی چلی جاتی تھیں کہ سننے والوں کو درمیان میں حائل زمانی و مکانی فاصلوں کا اندازہ ہی نہ ہوتا تھا اور ظالم دیو اور مکھی شہزادی سے شروع ہونے والا قصہ سائنس و ٹیکنالوجی کمپیوٹر چپ فلاپی اور بابوں تک اتنی آہستگی سے پہنچ جاتا تھا کہ خود قصہ گو کو بھی اپنے سفر کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔

ان کے گرد ایسے لوگوں کا ہجوم رہتا تھا جو ان کی باتوں' تحریروں اور ڈراموں سے درست اور نادرست کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان سے زندگی کے نتائج اخذ کرتے تھے اور اپنا اصول وضع کرتے تھے ان کا ڈیرہ ایسے حاجتمندوں سے آباد رہتا تھا جو ان کے ذریعے فکر' سوچ' روح اور دل کے راستوں کی کشادگی چاہتے تھے۔

بابوں کی باتیں بتاتے بتاتے اب وہ خود ایک ایسا بابا بن چکے تھے' جس کی بکل میں چور ہوتا ہے اور وہ سب میں اس ڈر سے گھبرایا پھر رہا ہوتا ہے کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔ جو ا پنے کی یاری میں گھر بار لٹا کر دیبلے نین پران لئے پیا پیا کرتے ہیں' ہمیں پیا ہوئے' اب پیا کس کی کینے کی تصویر بنا' خود سے بھی لکن مٹی کھیل رہا ہوتا ہے۔ اس لکن مٹی میں انہیں کامیابی ہوئی یا نہیں' اس سے قطع نظر کہنے کی بات الگ یہ ہے کہ دوست کا رنگ چڑھ جانے کے بعد اپنے سوبے اور سادے چولے پہن کر انہیں انکساری کی میل خورے رنگ کی چادر سے چھپا دینے کی کوشش کرتے ہوئے جب وہ جھجکے ہوئے لہجے میں صاحب حال بابوں کا ذکر کرتے تھے' تو کیا کسی کو ان پڑھا کر کے ڈیرے میں ناد بجاتے اس ملامتی بابے کا گمان نہیں گزرتا تھا' جو اپنی گگی کی بات کرنے پر آئے تو کن فیکون سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔

دوسروں کا تو پتہ نہیں مگر مجھے تو یہ بابا بھی اسی لائن کا بابا لگتا تھا۔ "منچلے کا سودا" اور "زاویہ" انہی سوبے اور سادے چولوں کا قصہ معلوم ہوتے ہیں جنہیں ان کی انکساری کی میل کورے رنگ کی چادر بھی پوری طرح چھپا نہ سکی تھی۔ "سفر در سفر" میں میرے مرنے پر کیا ہوگا' میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے "حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور ذہین فنکار اور شو بزنس کے ایک کامیاب آرٹسٹ کی موت کے باوجود لاہور کا سارا کاروبار نارمل طریق پر چلتا رہے گا۔ شاہ عالمی چوک سے لے کر میو ہسپتال کے چکر تک ٹریفک اسی طرح پھنسا رہے گا' کوچوان گھوڑوں کو اونچے اور قریبی کوچوان کو نیچے لہجے میں گالیاں دیتے رہیں گے۔ ہسپتال کے اندر مریضوں کو کھانا جاتا رہے گا' ٹیلیفون بجتا رہے گا"۔

جیسا کہ اشفاق صاحب نے لکھا تھا' یہ سب کچھ اس روز بالکل اسی طرح ہوا۔ مگر اس

کے ساتھ اس روز یہ عجیب معاملہ بھی دیکھنے میں آیا کہ شاہ عالمی چوک سے میو ہسپتال تک پھنسی ہوئی ٹریفک کے ڈرائیور اپنی ہمیشہ کی جلد بازی کے بجائے کچھ سست سے پڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور اس سستی میں ہارن بجانا بھول کر گاہے گاہے منہ سے ہلکی ہلکی آہیں نکال لیتے تھے یوں جیسے ان کی پسلیوں سے درد اٹھتا ہو۔ کوچوانوں نے اس روز اپنی پرانی عادت کے برخلاف گھوڑوں کو اونچی آواز میں گالیاں دینے کے بجائے آہستہ سے انہیں گھر کا' کیونکہ ان کے حلق خشک ہو رہے تھے اور آنکھوں میں کچھ رڑک رہا تھا اور ایک نوجوان کوچوان تو اپنے گھوڑے کے گلے لگ کر چپکے چپکے آنسو گراتا ہوا اس کے کان میں کہہ رہا تھا ''موتی یار! ساڈے شاہ جی ٹر گئے نی۔'' ہسپتال کے اندر مریضوں کے سامنے کھانا رکھا رکھا ٹھنڈا ہو رہا تھا اور عجیب سراسیمگی کے عالم میں صبح اور دوپہر کے اخبار سامنے پھیلائے اونچی آواز سے اشفاق احمد کی رحلت کی خبر ایک دوسرے کو پڑھ کر سنا رہے تھے' نیک بھرتی بلڈ پریشر چیک کرتی اور دوائی نہ کھانے پر مریض کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی نرسیں ڈیوٹی چھوڑ کر باباجی کی رحلت کی خبر سکتے کے عالم میں کھڑی سن رہی تھیں اور ٹیلیفون کی گھنٹیاں اس روز معمول سے بھی زیادہ بجیں' دن بھر ٹیلیفون انگیج رہے کیونکہ ''باباجی'' شاہ جی اور اشفاق احمد کے چاہنے والوں نے اس روز ٹیلیفون پر ایک دوسرے سے تعزیت کرنے میں سارا وقت گزارا۔

میں نے ماڈل ٹاؤن ڈی بلاک کے گراؤنڈ میں ان کے سوئم کے ختم پر اس گراؤنڈ میں باباجی کا میلہ لگا ہوا دیکھا' جہاں لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ اگر کی بتیوں کا خوشبودار دھواں پھانکتے ہوئے ان کے چاہنے والے زمین پر دوزانو بیٹھے گٹھلیوں پر کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے۔ پنڈال میں چاروں طرف قرینے سے لگی کرسیوں پر قطاروں میں بیٹھی بیبیاں سپارے پڑھتے ہوئے ناک شوں شوں کر رہی تھیں۔ ان کی لحظہ بھر دم نہ لینے والی زبانیں' تالو سے چپکی پڑی تھیں اور چہروں پر اتنا ذاتی سا دکھ تھا کہ کوئی کسی سے کچھ کہنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ باہر ٹریفک کو کنٹرول کرنے والے سپاہی کا ڈسپلن قابل دید تھا۔ ڈرائیور بونٹ سے ٹیک لگائے کچھ سوچتے تھے اور ڈی بلاک گراؤنڈ کے اردگرد اونچے چھتنارے درختوں پر طوطے' چڑیاں' قمریاں' کوئلیں کاٹ کر چھپیاں اور کٹ بڑھئی دم بخود بیٹھے اگر کی بتیوں کا خوشبودار غم زدہ دھواں اس کے گرد جگنوں کی طرح بیٹھی

بھیاں اور سپاروں کے ورق الٹنے کی آوازیں سنتے تھے اور پروں میں چونچیں چھپاتے سوچتے تھے یہ سب کیا ہو گیا؟

باباجی کے میلے میں آتے ہوئے سارے یہی سوچتے تھے اور ماڈل ٹاؤن کو جاتے راستوں پران قدموں کی چاپ ڈوبتی تھی جو ایک درویش کی ایڑی سے اٹھتی تھی اور سارے میں دھوم جاتی تھی۔اب وہ چاپ خاموش ہو گئی ہے۔شاید داستان گو سو گیا ہے گہری اور میٹھی نیند اسی لئے داستان سرائے کی نیم روشن ڈیوڑھی میں شہر لاہور کا سارا سناٹا آن کر بجھ گیا ہے جس میں کوئی ہولے ہولے کہہ رہا ہے "او وپیا چاند اای فریدالمیاں والاں والا" ☆

روزنامہ خبریں لاہور

21 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد خان: درویش خدا مست

ڈاکٹر قاری محمد طاہر

مدیر التجوید فیصل آباد

کسی سوال کرنے والے نے اشفاق احمد خان سے پوچھا "تم نے زندگی میں کتنے عشق کئے"؟........ سوال اگر چہ پیچیدہ تو نہ تھا، البتہ ٹیڑھا ضرور تھا۔ اپنی دیوار سے میرے آنگن میں کوئی جھانکے تو برا تو لگتا ہے، آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ اس بات پر تو لوگ بگڑتے ہیں اور بگڑتے ہی چلے جاتے ہیں، پھر اس بگاڑ سے بہت سے مزید بگاڑ بھی پیدا ہوتے ہیں، جو بجھنے کا نام نہیں لیتے۔ بھلا روزنِ دیوار سے تانکا جھانکی کا حق کس نے عطا کیا ہے؟ لیکن اس سوال سے اشفاق احمد خان کی آنکھوں میں نہ خون اترا، نہ ہی چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔ ٹھنڈے دل سے گرم سوال سنا، پھر میٹھے لہجے میں جواب دیا: میں نے زندگی میں تین عشق کئے ہیں۔ پہلی محبت مجھے اپنے استاد کی لڑکی سے ہوئی، لیکن محبت کا آغاز ہی تھا کہ اسے بخار ہوا اور وہ مر گئی۔ دوسری محبت مجھے اپنی ایک کزن کے ساتھ ہوئی، لیکن اس کی شادی کسی اور جگہ ہوگئی۔ ان دو واقعات سے مجھے یہ احساس ہوا کہ ہمارے فیصلے کسی اور جگہ ہوتے ہیں۔ تیسری محبت میں نے اپنی کلاس فیلو سے کی اس محبت کا نام بانو قدسیہ ہے، جو میری رفیقہ حیات ہیں۔"

کہنے کو اشفاق احمد خان کے پہلے دو عشق ناکام ہوئے، لیکن حقیقت میں وہ کامیاب ٹھہرے۔ ان کے من کی دنیا نے راہ راست تلاش کر لی۔ دل بول اٹھا" کائنات کے پس پردہ کوئی ہے...... وہی خدا ہے"۔

اشفاق احمد خان داستان سرائے میں رہا کرتے تھے داستان سرائے کوئی سرائے نہیں تھی، بلکہ ان کا گھر تھا، جس کو ادیب لوگ اپنی سرائے ہی سمجھتے تھے۔ اسی حوالے سے وہاں آتے جاتے ٹھہرتے، حقہ پانی چلتا اور ادب جنم لیتا تھا۔ انتقال سے ٹھیک ایک برس قبل اشفاق احمد نے رابطہ ادب اسلامی کے وفد کو داستان سرائے میں مدعو کیا۔ اس وفد میں راقم الحروف کے علاوہ مولانا فضل الرحیم اور ڈاکٹر محمود الحسن عارف بھی شامل تھے۔ اس محفل کی روداد رابطہ کے ماہنامہ "اخبار رابطہ" میں شائع ہوئی:

یکم ستمبر کو ملک کے نامور ادیب و قلم کار محترم اشفاق احمد صاحب نے اپنے ''دولت خانہ'' واقع ماڈل ٹاؤن میں ایک ادبی و تعارفی نشست کا اہتمام کیا، جس میں لاہور کے نامور ادیب شریک ہوئے۔ ان میں انیس ناگی، قاضی جاوید، اشفاق احمد، یونس جاوید، اطہر جاوید، ذوالفقار تابش، اصغر ندیم سید، ڈاکٹر سلیم اختر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے جن عہدیداران نے اس نشست میں شرکت کی، ان میں مولانا حافظ فضل رحیم (صدر رابطہ)، ڈاکٹر محمود الحسن عارف (نائب صدر) اور اخبار رابطہ کے مدیر ڈاکٹر قاری محمد طاہر شامل تھے۔ اس نشست میں ادباء اور رابطہ کے اراکین کا باہم تعارف بھی ہوا، نیز بہت سے علمی و ادبی موضوعات بھی زیر بحث آئے۔ محبت بھری باتیں بھی ہوئیں اور ترش و تیز اور قدرے تلخ عنوانات پر بھی تبادلہ خیال ہوا اور تعلقات میں شرینی بڑھی جب بھی مل جائیں کلیجے سے لگائیں ان کو۔

داغ میرا ان حسینوں سے جھگڑا کیا تمام مشارکین نے اس نشست کو بہت اہم قرار دیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اس قسم کے اجلاس کے مواقع میسر آتے رہنے چاہیں، تاکہ باہم رابطہ برقرار رہے اور محبت استوار ہو۔ صدر رابطہ مولانا فضل رحیم مولوانا فضل رحیم کی دعا پر نشست اختتام پذیر ہوئی۔ آخر میں صاحب خانہ ممتاز ادیب، معروف دانشور میں اشفاق احمد صاحب نے مشارکین کی تواضع پرتکلف چائے اور دیگر لوازمات سے کی۔

اشفاق احمد خان ادیب بھی تے، ڈرامہ نگار بھی، فن کاری کا ہنر بھی جانتے تھے، پنجابی بھی لکھتے، اردو بھی۔ بذلہ سنجی ان کی طبیعت کا حصہ تھی۔ ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے ان کے پروگرام تلقین شاہ ہو یا ایک محبت سو افسانے یا سفر در سفر، یا ان کی دیگر جملہ تحریریں، سب کا مجموعہ کریں، خلاصہ نکالیں دو ہی عنوان بنتے ہیں۔......اصلاح معاشرہ اور پرانی اخلاقی اقدار کا احیاء...... کون نہیں جانتا کہ ان کا پروگرام تلقین شاہ برسوں ریڈیو پر نشر ہوتا رہا، جس میں تحریر بھی ان کی ہوتی تھی اور آواز بھی۔ اس پروگرام میں انہوں نے اقدار کی حفاظت کے حوالے سے جالندھر و پٹیالہ کی ٹکسالی زبان کو استعمال کیا اور یہ بات باور کرادی کہ زبانیں تعصب کو ہوا دینے والے محبت کے معنوں سے ناآشنا ہیں اور محبت کی ٹھنڈک کو چنگاری کا نام دیتے اور اس چنگاری سے صحن چمن کو آگ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اشفاق احمد کی زندگی کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کیلئے ہمہ وقت تیار ہوتے۔ اس سے واقفیت ہے یا نہیں، انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ بے غرض مدد کے قائل تھے۔ ایک مجلس میں بتانے لگے کہ ایک شخص میرے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ میں اپنا تبادلہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہر جگہ معروف ہیں، آپ میری مدد کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے میرے لئے کوشش کی تو میرا تبادلہ ممکن ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ مجاز افسر کون ہے۔ جواب ملا فلاں شخص ہے۔ سیکرٹریٹ میں بیٹھتا ہے۔ میں نے کہا میں اسے جانتا تو نہیں، تاہم میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گا۔ متعلقہ شخص کے دفتر میں چلا گیا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا کہ کوئی شناسا چہرہ ملے، تاکہ اس کے توسط سے متعلقہ افسر سے سفارش کی جائے۔ اسی اثناء میں متعلقہ افسر نے مجھے دیکھ لیا اور خود ہی اپنے پاس بلا لیا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا کہنے لگا ''آپ اشفاق احمد ہیں نا، میں آپ کا بڑا فین ہوں مداح ہوں۔ میں تو خود آپ سے ملنے کی تمنا رکھتا تھا''۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا۔ چلئے سفارش کے بغیر ہی کام ہو گیا۔ اس نے چائے منگوائی اور بڑی تواضع کی۔ باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ ''اشفاق صاحب یہ کام میرے ہی اختیار میں ہے لیکن آپ کا یہ کام نہیں ہو سکتا پوچھا'' کیوں؟........ کہنے لگا ''معاشرے کی جن برائیوں کا تذکرہ آپ اپنے مضامین اور پروگرامز میں کرتے ہیں یہی مسئلہ یہاں ہے۔ اختیار کے باوجود میں بے اختیار ہوں۔ لوگ قائداعظم کو مانتے ہیں، ان کی بڑی عزت کرتے ہیں، ان کی تصویر دیکھتے ہی سلام کرتے ہیں اور کام آسان ہو جاتے ہیں۔ آپ کو بھی یہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا''۔ ادب سرخ ہوتا ہے نہ سبز نہ کالا نہ چتکبرا۔ بس ادب ہوتا ہے اور فطری طور پر سفید ہوتا ہے۔ ہر چیز کو صاف دیکھتا، صاف رکھتا ہے۔

زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے ٹیلی ویژن پر ''زاویہ'' عنوان سے پروگرام شروع کیا، جس کو بڑی پذیرائی ملی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ زاویہ کا مطلب عرب زبان میں وہی ہے جو برصغیر کے رہنے والے لوگوں کے ہاں خانقاہ کا ہے۔ اس پروگرام میں اشفاق احمد کی ساری گفتگو تطہیر باطن ہی کے حوالے سے ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ اشفاق احمد خان 1925ء میں پیدا ہوئے پنجاب یونیورسٹی میں پڑھے

لی گئے، بورڈ کے رکن ہوئے جانے کیا کچھ کیا۔ بالآخر اخبارات میں خبر چھپی کہ اشفاق احمد خان 7 ستمبر کی صبح کو فوت ہو گئے ممکن ہے یہ بات سچ ہو لیکن ادیب تو کبھی نہیں مرتا۔ وہ اپنی تحریروں میں زندہ رہتا ہے اور اپنے پیغام سے زندگی کی تہمت رکھنے والے مردہ انسانوں کو زندگی بخشتا رہتا ہے۔

اگر غالب زندہ میری تقی میر زندہ ہے، داغ اور حسرت زندہ ہیں۔ اقبال، حالی زندہ ہیں تو اشفاق احمد خان بھی زندہ ہے اور جاوید رہے گا۔ اصل میں وہ داستان سرائے میں کچھ عرصہ ٹھہرا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا اور اپنے سفر سے یہ سبق دے گیا کہ دنیا مقام نہیں مسافر خانہ ہے، سرائے ہے۔

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

روزنامہ پاکستان لاہور
21 ستمبر 2004ء

تنقید اور تائی کا فلسفہ

مرتب: منیر چوہدری
(زاویہ نظر)
(نوٹ یہ پروگرام اشفاق احمد کے انتقال چند روز قبل نشر ہوا)

ان دنوں میرا پوتا جواب بڑا ہو گیا، عجیب عجیب طرح کے سوال کرنے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کو بڑا حق پہنچتا ہے سوال کرنے کا۔ اس کی ماں نے کہا کہ تمہاری اُردو بہت کمزور ہے تم اپنے دادا سے اُردو پڑھا کرو۔ وہ انگریزی سکول کے بچے ہیں اس لیے وہ زیادہ اُردو نہیں جانتے۔ خیر! وہ مجھ سے پڑھنے لگا۔ اُردو سیکھنے کے دوران میں وہ کچھ اور طرح کے سوالات بھی کرتا ہے۔ پرسوں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ دادا! یہ آمدورفت جو ہے اس میں عام طور پر کتنا فاصلہ ہوتا ہے؟ (اس نے یہ لفظ نیا نیا پڑھا تھا)۔ اب اس نے ایسی کمال کی بات کی تھی کہ میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ دادا! کیا نفسیات کی ایسی کوئی کتاب ہے جس میں آدمی کو پرکھنے کے اچھے سے اور آسان سے طریقے ہوں؟ تو میں نے کہا کہ بھئی! تمہیں آدمی کو پرکھنے کی کیا ضرورت پیش آ رہی ہے؟ اس نے کہا کہ پتہ تو چلے کہ آخر مدمقابل کیسا ہے؟ کس طرز کا ہے؟ جس سے میں دوستی کرنے جا رہا ہوں یا جس سے میری ملاقات ہو رہی ہے۔ میں اس کو کس کسوٹی پر کس پیپر کے ساتھ چیک کروں۔ میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر تم ایسا چاہتے ہی ہو تو ظاہر ہے علم نفسیات میں بہت ساری ایسی کتابیں ہیں کہ

HOW TO UNDERSTAND PEOPLE?

HOW TO CHECK HUMAN BEINGS?

ایسی بے شمار کتابیں ہیں لیکن وہ ساری کی ساری اتنی ٹھیک نہیں جتنی ہمارے ہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ ہماری اُستاد تو ہماری تائی تھی۔ میں نے پہلے بھی اس کے بارے میں آپ لوگوں کو بتایا ہے لیکن آپ میں سے شاید بہت سے لوگ نئے ہیں اور ان ''تائی'' کے بارے میں پتہ نہ ہو جسے سارا گاؤں ہی ''تائی'' کہتا تھا۔ بڑے کیا چھوٹے کیا سبھی۔ وہ ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ تیلی جو میری پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے تھے ان کی بیوہ تھیں۔ ہماری تائی تیلن تھی تیل نکالتی تھی اور بچی گھانی کا خالص سرسوں کا تیل بیچتی تھی۔ سارے گاؤں والے اس سے تیل لیتے تھے۔ خود ہی بیل چلاتی تھی بڑی لٹھ جو بہت مشکل ہوتی ہے بیلوں سے وہ اکیلی نکال لیتی تھی۔

میں جب اس سے ملا تو اس کی عمر 80 برس کی تھی۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا لیکن مجھے اس تائی کی شخصیت نے متاثر بہت کیا۔ وہ اتنی خوش مزاج اتنی خوشی عطا کرنے والی اور خوش بختی کا سامان مہیا کرنے والی تھی کہ جس کا حساب نہیں۔ شام کے وقت گاؤں کے لوگ

بزرگ، ہندو، سکھ سب اس کے پاس جمع ہو جاتے تھے کہ ہمیں کوئی دانش کی بات اس کے ہاں سے ملے گی۔ ایک طرح سے یوں سمجھئے کہ اس کا گھر "کافی ہاؤس" تھا، جس میں زمیندار لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ایک بار میں نے تائی سے پوچھا کہ یہ تیزی زندگی جو گزری ہے اس کا میں تو شاید نہیں ہوں وہ کس قسم کی تھی؟ اس نے بتایا کہ میں پچیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور پھر اس کے بعد اب میری عمر دیکھ لو تمہارے سامنے ہے۔ اسی برس ہے۔ میں ایسے ہی رہی لیکن میں کڑوی بہت تھی اور تلخ طبیعت کی ہو گئی۔ جب میں بیوہ ہو گئی۔ میں خدا پر بھی تنقید کرتی تھی، حالات پر بھی، وقت پر بھی، لوگوں پر بھی اور میری کڑواہٹ میں مزید اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ میری شخصیت کو وہ سکون نہیں ملتا تھا، جس کی میں آرزومند تھی، لیکن میں ہر بندے کو اچھی طرح سے "کھڑکا" دیتی تھی اور وہ شرمندہ ہو کر اور گھبرا کر میرے ہاں سے رخصت ہوتا تھا۔ تو میں نے ایک اور یہ فیصلہ کیا کہ (اس عورت میں اللہ نے فیصلے کی بڑی صلاحیت رکھی ہوئی) اگر مجھے آدمیوں کو لوگوں کو سمجھنا ہی ہے، اگر مجھے ان کی روحوں کے اندر گھبرا اترنا ہے، تو میرا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ مجھے ان پر Criticism کرنا، تنقید کرنا، نکتہ چینی کرنا، چھوڑنا ہوگا۔ جب آپ کسی شخص پر نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیتے ہیں اس پر تنقید کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس میں نقص نکالنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ آدمی سارے کا سارا آپ کی سمجھ میں آنے لگتا ہے اور ایکسرے کی طرح اس کا اندر اور باہر کا وجود آپ کی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اب یہ اس کا بھی فلسفہ تھا اور کچھ بڑوں سے بھی اس نے حاصل کیا تھا، وہ بھی تھا۔ جب بھی مجھے کوئی ایسا مشکل مسئلہ ہوتا، تو میں ضرور اس سے ڈسکس کرتا کہ اس کو کیسے کرتا ہے، اکیلا میں ہی نہیں، سارے ہی اس سے ڈسکس کرتے تھے، کیونکہ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ کسی کی خرابیاں تلاش کرنے کے بجائے اس کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے اور ظاہر ہے کہ آدمی کسی کی خوبیوں پر نظر نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن ڈھونڈنی چاہئیں۔ وہ تائی واحد ایسی فرد تھی جو کہ بڑے سے بڑے آدمی میں، بڑے سے بڑے وجود میں سے بھی خوبی تلاش کر لیتی تھی۔ میرا بھائی جو مجھ سے دو جماعتیں آگے تھا، وہ بھی تائی کے اس رویے سے بڑا تنگ تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ ایک دن اس نے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے کہا کہ یار! میں اس تائی کو پہچانتا ہوں، کیونکہ وہ بالکل ان پڑھ ہونے کے باوصف ہم سے بہت آگے چلی جا رہی ہے۔ میں نے آج ایک معمہ بنایا ہے اسے لے کر تائی کے پاس چلتے ہیں، لیکن تم بہت سنجیدہ رہنا اور معصوم سے "میسنے" بن کر کھڑے ہو جانا۔ یہ تائی ہر چیز کی تعریف کرتی ہے، کبھی آج تک اس کو کسی میں نقص نظر نہیں آیا، پھر زندگی کا مزہ کیا ہے کہ آدمی کسی نقص کے بغیر ہی زندگی بسر کرتا چلا جائے اور ارد گرد پڑوس میں عورتیں آباد ہوں اور آدمی ان میں نقص ہی نہ نکالے۔ یہاں تو فوراً کھڑکی کھول کر دیکھتی ہیں کہ اس کے گھر میں کون آیا ہے؟ کون گیا؟ فٹافٹ نقص نکالنے اور خرابی کی وضاحت پیش کرنے کے لیے ان کو موقع چاہیے ہوتا ہے۔

اب تائی پھنس جائے گی) تائی! یہ شیطان کیسا ہے؟ تائی کہنے لگی پت! ابلیس؟ وہ کہنے لگا ہاں۔ تائی کہنے لگی ہائے ہائے صدقے جاواں وہ بڑا ہی محنتی ہے جس کم دا تہیہ کرے اس کو چھوڑتا ہی نہیں پورا کرکے دم لیتا ہے۔ کیا کہنے اس کے وہ ہماری طرح سے نہیں ہے کہ کسی کام میں آدھا دل ادھر اور آدھا دل ادھر اس نے جس کام کی ٹھان لی پورا کرکے ہی چھوڑتا ہے۔ میں نے بھائی سے کہا کہ آ جاؤ یہاں ہماری دال نہیں گلے گی یہ اور طرح کی یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے جو لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ نہیں کھڑے ہو سکتے۔

میں اپنے پوتے سے یہ کہہ رہا تھا (ظاہر ہے کہ بہت عرصہ بیت گیا اب تائی اس جہاں میں موجود نہیں ہے لیکن میں اس سے اپنے حوالے سے اور حیثیت سے بات کر رہا تھا) کہ آدمی کو اپنے آپ کو جاننے کے لیے دوسرے آدمی کے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب تک آپ دوسرے آئینے کو نہیں بنائیں گے آپ کو اپنی ذات کی شکل نظر نہیں آئے گی۔ اگر آپ اس کے اوپر کالک ملتے رہیں گے تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی۔

اتفاق سے اب ہمارے ہاں Criticism کچھ زیادہ ہی ہونے لگا ہے اور کچھ ہمیں پڑھایا بھی جاتا ہے۔ کچھ ہماری تعلیم بھی ایسی ہے۔ کچھ ہم ایسے West Oriented Educated لوگ ہو گئے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ ہر بات کا احتساب کرو اس پر تنقید کرو اور ہر چیز کو تسلیم کرتے ہوئے اور ایسے ہی آگے چلتے ہوئے زندگی بسر نہ کرو۔

جب میں لکھنے لکھانے لگا اور میں چھوٹا سا ادیب بن رہا تھا یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے اس وقت ہمارے لاہور میں ایک ''کافی ہاؤس'' ہوتا تھا وہاں بڑے سینئر ادیب رات گئے تک نشست کرتے تھے تو ہم بھی ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں سیکھتے تھے۔ ان سے بات کرنے کا شعور حاصل کرتے تھے اور اپنے مسائل بھی ان سے بیان کرتے تھے۔ اس زمانے میں راجندر سنگھ بیدی یہاں ڈاکخانے میں کام کرتے تھے۔ پریم چند بھی ''کافی ہاؤس'' میں آ جاتے تھے اور اس طرح بہت بڑے لوگ وہاں آ جاتے تھے۔ میں رات دیر سے گھر آتا تھا میری ماں ہمیشہ میرے آنے پر ہی اُٹھ کر چولہا جلا کر روٹی پکاتی تھی (اس زمانے میں گیس ویس تو ہوتی نہیں تھی) اور میں ماں سے ہمیشہ کہتا تھا کہ آپ روٹی رکھ کر سو جایا کریں تو وہ کہتیں تو رات کو دیر سے آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تجھے تازہ پکا کر روٹی دوں۔ جیسا کہ ماؤں کی عادت ہوتی ہے۔ میں ان سے اس بات پر بہت تنگ تھا اور میں نے ان سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ اسی طرح رات دیر سے اُٹھ کر روٹی پکاتی رہیں تو میں پھر کھانا ہی نہیں کھاؤں گا۔ ایک دن یونہی رات دیر سے میرے آنے کے بعد ''پھلکا'' (تازہ روٹی) پکاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے پوچھا ''کہاں جاتا ہے؟'' میں نے کہا اماں! میں ادیب بن رہا ہوں۔ کہنے لگیں وہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا اماں! لکھنے والا' لکھاری۔ وہ پھر گویا ہوئیں تو پھر کیا کرے گا؟ میں نے کہا میں کتابیں لکھا کروں گا۔ وہ

کہنے لگیں' ایمیاں اگے پیاں جیہڑیاں کتاباں اونہاں دا کی بے گا؟ میں نے کہا' نہیں! انہیں' وہ تو جھوٹ ہیں' کچھ نہیں۔ میں اور طرح کا رائٹر بنوں گا اور میں سچ اور حق کے لیے لڑوں گا اور میں ایک سچی بات کرنے والا بنوں گا۔ میری ماں کچھ ڈر گئی۔ بیچاری اَن پڑھ عورت تھی گاؤں کی۔ میں نے کہا' میں سچ بولا کروں گا اور جس سے ملوں گا' سچ کا پرچار کروں گا اور پہلے والے لکھاری بڑے جھوٹے رائٹر ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت ماں کے ہاتھ میں پکڑے چمٹے میں روٹی اور چنگیلی (دیگچی) تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی' اگر تو نے یہی بننا ہے' جو تو کہتا ہے اور تو نے سچ ہی بولنا ہے تو اپنے بارے میں سچ بولنا۔ لوگوں کے بارے میں سچ بولنا نہ شروع کر دینا۔ یہ میں آپ کو بالکل اَن پڑھ عورت کی بات بتا رہا ہوں۔ سچ وہ نہیں ہوتا۔ ہماری یہ عادت بن چکی ہے اور ہمیں ایسے ہی بتایا' سکھایا گیا ہے کہ ہم سچ کا پرچار کریں۔ جب ہم بابا جی کے پاس گئے اور کبھی کبھی ان کے سامنے میرے منہ سے یہ بات نکل جاتی تھی کہ میں سچی اور حق کی بات کروں گا' تو وہ کہا کرتے تھے' سچ بولا نہیں جاتا' سچ پہنا جاتا ہے' سچ اوڑھا جاتا ہے' سچ وا پرتا (اوڑھنے) کی چیز ہے' بولنے کی چیز نہیں ہے۔ اگر اسی طرح اور یوں ہی سچ بولو گے تو جھوٹ ہو جائے گا۔ جب تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی' لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا ہے اور یہ حسرت اور آرزو ہی رہتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے میں کم از کم ایک دن سچ اوڑھ کر باہر نکلوں اور ساری دنیا کا درشن کر کے پھر واپس لوٹوں' اوڑھا ہوا سچ معلوم نہیں کتنا خوبصورت ہوتا ہوگا' بولا ہوا تو آپ کے سامنے ہی ہے' وہ اچھا نہیں ہوتا۔ جب آدمی کسی کو Criticise کرتا ہے اور کسی کے اوپر تنقید کرتا ہے' تو حکم تو یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ کو دیکھ لیں اور اس کی عینی شہادت لیں کہ آیا آپ میں ایسی کوئی خرابی ہے بھی کہ نہیں۔ اگر وہ نظر بھی آ جائے اور خرابی ہو بھی' تو پھر بھی اس کا اعلان نہ کریں۔ آپ کو کیا ضرورت ہے کسی کی خرابی کا اعلان کرنے کی' اللہ ستار العیوب ہے۔ اگر اللہ خداوند تعالیٰ ہماری چیزوں کو اُجاگر کرنے لگے' تو توبہ توبہ ہم تو ایک سیکنڈ بھی زندہ نہ رہیں' لیکن وہ ہمارے جیبد "کلو" کر چھپا کر رکھتا ہے۔ تو ہمیں اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم لوگوں کی خرابیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے پھریں۔ اگر آپ کو کسی میں خرابی نظر آئے تو یہ دیکھیں کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا' میں انہیں Circumstances میں ہوتا اور میں ایسے حالات میں سے گزرا ہوا ہوتا' بچپن میں یتیم ہو گیا ہوتا' یا کسی کے گھر پلا ہوتا تو میری شخصیت کیسی ہوتی؟ یہ ایک بات بھی غور طلب ہے۔

ممکن ہے آپ کی آنکھ میں ٹیڑھ ہو اور اس بندے میں ٹیڑھ نہ ہو۔ ایک واقعہ اس حوالے سے مجھے نہیں بھولتا' جب ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ یہ لاہور میں ایک جگہ ہے۔ وہ ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ اچھا پوش علاقہ تھا۔ وہاں ایک بی بی بہت خوبصورت' ماڈرن قسم کی بیوہ عورت نوعمر وہاں آ کر رہنے لگی۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم' جو سمن آباد کے "نیک" آدمی تھے ہم نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب کردار آ کر ہمارے درمیان آباد ہو گیا ہے اور اس کا انداز

زیست ہم سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ ایک تو وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے خوبصورت کپڑے پہنتی تھی' پھر اس کی یہ خرابی تھی کہ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ تیسری اس میں خرابی یہ تھی کہ اس کے گھر کے آگے سے گزرو تو خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ اس کے جو دو بچے تھے' وہ گھر سے باہر بھاگے پھرتے تھے اور کھانا گھر پر نہیں کھاتے تھے۔ لوگوں کے گھروں میں چلے جاتے تھے اور جن گھروں میں جاتے' وہیں سے کھا پی لیتے تھے' یعنی گھر کی زندگی سے ان بچوں کی زندگی کچھ کٹ آف تھی۔ اس خاتون کو کچھ عجیب و غریب قسم کے مرد بھی ملنے آتے تھے۔ گھر کی گاڑی کا نمبر تو روز دیکھ دیکھ کر آپ جان جاتے ہیں' لیکن اس کے گھر آئے روز مختلف نمبروں والی گاڑیاں آتی تھیں۔ ظاہر ہے اس صورتحال میں ہم جیسے بھلے آدمی سے کوئی اچھا نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے۔ اس کے بارے میں ہمارا ایسا ہی رویہ تھا' جیسا آپ کو جب میں یہ کہانی سنا رہا ہوں' تو آپ کے دل میں لامحالہ اس جیسے ہی خیالات آتے ہوں گے۔ ہمارے گھروں میں آپس میں چہ میگوئیاں ہوتی تھیں کہ یہ کون آ کر ہمارے علاقے میں آباد ہوگئی ہے۔ میں کھڑکی سے اسے جب بھی دیکھتا' وہ جاسوسی ناول پڑھتی رہتی تھی۔ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ اسے کسی چولہے چوکے کا کوئی خیال نہ تھا۔ بچوں کو بھی کئی بار باہر نکل جانے کو کہتی تھی۔ ایک روز وہ سبزی کی دکان پر گر گئی' لوگوں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے وینٹے مارے تو اسے ہوش آیا اور وہ گھر گئی۔ تین دن کے بعد وہ فوت ہوگئی' حالانکہ اچھی صحت مند دکھائی پڑتی تھی۔ جو بندے اس کے ہاں آتے تھے' انہوں نے ہی اس کا کفن دفن کا سامان کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کے ہاں آنے والا ایک بندہ ان کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ اس عورت کو ایک ایسی بیماری تھی جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس کو کینسر کی ایسی خوفناک صورت لاحق تھی Skin وغیرہ کی کہ اس کے بدن سے بدبو بھی آتی رہتی تھی۔ جس پر زخم ایسے تھے اور اسے خوشبو کے لیے سپرے کرنا پڑتا تھا' تاکہ کسی قریب کھڑے کو تکلیف نہ ہو۔ اس کا لباس اس لیے ہلکا ہوتا تھا اور غالباً ایسا تھا جو بدن کو نہ چبھے۔ دوسرا اس کے گھر آنے والا اس کا وکیل تھا' جو اس کے حقوق کی نگہبانی کرتا تھا۔ تیسرا اس کے خاوند کا چھوٹا بھائی تھا' جو اپنی بھابی کو ملنے آتا تھا۔ ہم نے ایسے ہی اس کے بارے میں طرح طرح کے اندازے لگا لیے اور نتائج اخذ کر لیے اور اس نیک پاک دامن عورت کو جب دورہ پڑتا تھا تو وہ بچوں کو دھکے مار کر باہر نکال دیتی تھی اور تڑپنے کے لیے وہ اپنے دروازے بند کر لیتی تھی۔ میرا یہ سب کچھ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تنقید اور نقص نکالنے کا کام اللہ پر چھوڑیں وہ جانے اور اس کا کام جانے۔ ہم اللہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہ اٹھائیں کیونکہ اس کا بوجھ اٹھانے سے آدمی سارے کا سارا ''چبہ'' ہو جاتا ہے' کمزور ہو جاتا ہے' مر جاتا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور
11 ستمبر 2004ء

داستان گوئی اشفاق احمد کے لہو میں شامل تھی

قائداعظم لائبریری میں اشفاق احمد کی یاد میں تعزیتی اجلاس

محمد تاج

اشفاق احمد کا شمار موجودہ عہد کی ہمہ جہت شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ ایک دانشور ادیب، صوفی، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، براڈ کاسٹر، ٹیلی کاسٹر اور صداکار تھے۔ گزشتہ دنوں اشفاق احمد ہمیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ قائداعظم لائبریری لاہور اور اکادمی ادبیات پاکستان نے ان کی یاد میں قائداعظم لائبریری کے اقبال ہال میں ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا جس میں ان سے اشفاق احمد ایک بہت اچھے قلمکار اور براڈ کاسٹر تھے محبت وعقیدت رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اجلاس کی صدارت حمید اختر نے کی' حرف تعزیت پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر انیس ناگی' فرخندہ لودھی' ڈاکٹر آغا یامین اظہر جاوید' بشریٰ اعجاز اور اصغر ندیم سید شامل تھے۔

حمید اختر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ داستان گوئی شروع سے اشفاق احمد کے خون میں شامل تھی۔ تحریر ہو یا تقریر' جزئیات نگاری ہو یا مکالمہ نگاری' داستان گوئی کا رجحان ان پر غالب رہا۔ رسالہ نکالا تو اس کا نام" داستان گو" رکھا۔ رہائش گاہ کا نام" داستان سرائے" تھا۔ وہ ایک محنتی ادیب تھے۔ انہوں نے جو کچھ بھی بنایا اپنی قلمی محنت سے بنایا۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ عام لوگوں کی زبان میں ان کی سطح پر آ کر مکالمہ کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مخالفت کا برا نہیں منایا۔ ہمیشہ دلیل اور منطق کا سہارا لیا۔ ان کے بات کرنے کا ہمیشہ ایک مقصد ہوتا تھا۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا نے اشفاق احمد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ کبھی بھی اشفاق صاحب کے قریبی حلقوں میں نہیں رہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اشفاق صاحب کے قائل تھے۔ اشفاق صاحب ایک خوش گفتار انسان تھے ان کی خطابت نہیں بلکہ سحر ہوتا تھا۔ جو براہ راست دل پر اثر کرتی تھی۔ ان کے مزاج میں تحمل تھا۔ وہ اختلاف رائے کو تحمل سے برداشت کرتے تھے۔ مادی چمک دمک کے خلاف تھے۔
ڈاکٹر انیس نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں انہیں ہمیشہ خان صاحب کہا کرتا تھا۔ میرا اور ان کا

تعلق ہمیشہ جھگڑے کا ہوتا۔ میں ان سے اکثر چیزوں میں اختلاف کرتا تھا' لیکن مجھے ان سے محبت تھی۔ اشفاق احمد ایک بہت اچھے براڈ کاسٹر اور ٹیلی کاسٹر تھے۔ ان کی شخصیت کے تین حصے تھے۔ ایک آرٹسٹ ادیب' دوسرا دنیادار آدمی' تیسرا تصوف۔ مجھے ان کی موخر الذکر دو پہلوؤں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی' لیکن وہ ایک زبردست آرٹسٹ تھے جو اپنے فن کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اپنے افسانہ اور ریڈیائی ڈراموں کے ذریعے انہوں نے ایک نئی اُردو زبان کی داغ بیل ڈالی۔ میں نے ان سے کئی بار کہا کہ اس زبان کو ترویج دیں تا کہ ہمیں پرانی اُردو سے نجات ملے' لیکن وہ یہ نہ کر سکے اور اس دنیا سے ادھورے ادیب کے طور پر چلے گے۔ فرخندہ لودھی نے اشفاق صاحب کے حوالے سے ایک مختصر سا تاثر پیش کیا۔ بشریٰ اعجاز نے کہا کہ میرا شمار اس نسل میں ہوتا ہے جس کی فکری ارتقاء میں اشفاق صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اپنے طویل مضمون کا آخری حصہ پڑھتے ہوئے اشفاق صاحب کے تصوف پر روشنی ڈالی اور انہیں ایک ملامتی بابا قرار دیا۔ اصغر ندیم سید نے کہا کہ جس شخصیت کے بہت سے پہلو ہوں اس پر بات کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جوں جوں وقت گزرے گا اشفاق صاحب کی بہت سی باتیں یاد آتی جائیں گی۔ میرا اشفاق صاحب سے استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔ لوگ انہیں ادیب سمجھتے ہیں شاید میں بھی شروع میں انہیں ادیب ہی سمجھتا تھا لیکن پھر میرا اور ان کا اُستاد اور شاگرد کا رشتہ قائم ہو گیا۔ میں ہمیشہ ان سے ایک فاصلے پر بیٹھتا تھا اور ادب واحترام سے ان سے بات کرتا تھا۔ اشفاق صاحب کہا کرتے تھے کہ عام آدمی سے اس کی بات لے کر اسے سنوار کر پھر اسی عام آدمی کو لوٹا دیتا ہوں۔ اظہر جاوید نے اشفاق احمد کی شخصیت کے حوالے سے ایک پر تاثر مضمون ''دو پیالیاں ایک پرچ'' پڑھا۔ اظہر جاوید اشفاق صاحب کو جمیل الدین عالی کے اعزاز میں ہونے والی دوبئی کی تقریب میں بطور صدر اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہاں پر اپنی تقریر میں اشفاق احمد نے ''دو پیالیاں اور ایک پرچ'' کا ذکر کیا۔ بعد میں پوچھنے پر بتایا گیا کہ کراچی میں انہوں نے بازار

سے پیالیوں کا ایک سیٹ خریدا تھا جس کے لیے جمیل الدین عالی سے ادھار پیسے لینے پڑے۔ بعد میں ان میں سے ایک پیالی ٹوٹ گئی اوراس کے ساتھ ہی ان کا ایک دوست بھی ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ اسی طرح اور پیالیاں ٹوٹنے کے ساتھ دوست رخصت ہوتے رہے۔ اب اشفاق صاحب کے پاس دو پیالیاں اور ایک پرچ باقی تھی جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ایک پیالی جمیل الدین عالی ہیں اور دوسری وہ خود۔ بانو قدسیہ نے پیالیاں ٹوٹنے کے خدشے سے سنبھال کر رکھ دی تھیں اب اشفاق صاحب کے بچھڑنے پر اظہر جاوید بانو قدسیہ سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ان دو پیالیوں اور ایک پرچ میں سے کہیں ایک پیالی ٹوٹ تو نہیں گئی۔ اظہر جاوید نے دکھ بھرے انداز میں کہا کہ داستان گو تو داستان کہتے کہتے سو گیا ہے۔ اس تعزیتی ریفرنس میں اشفاق احمد کی بہو مسز ثوبیہ انیس کے علاوہ قائداعظم لائبریری کے چیف لائبریرین محمد تاج' پروگرام آفیسر محمد ہارون عثمانی' ادب لطیف کی ایڈیٹر صدیقہ بیگم اور اشفاق احمد سے عقیدت رکھنے والے لوگوں کی ایک تعداد نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض اکادمی ادبیات کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر قاضی جاوید نے سرانجام دیے۔

انصاف سنڈے میگزین لاہور

26 ستمبر 2004ء

اشفاق احمد...... پیکر جہد مسلسل تصادم پیری بھی وہ۔

علامہ چودھری اصغر علی کوثر وڑائچ
(لاہوریات)

جو لوگ دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں وہ اپنے لواحقین و اقارب کے ساتھ غیر لوگوں کے دل و نظر میں بھی اپنی محبت جاگزیں کر دیتے ہیں اور جب وہ اس دار فانی سے رخصت ہوتے ہیں تو ان کے لواحقین و اقارب کے ساتھ دیگر کروڑوں انسان بھی ان کی کمی محسوس کرتے ہیں اور صدیوں ان کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ جاری رکھتے ہیں۔ اشفاق احمد بھی پاکستان کی ایسی ہی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں ان کی شہرت کی بنیاد ان کی نگارشات پڑھنے والوں سے زیادہ ریڈیو پر ان کے پروگرام سننے اور ٹیلی ویژن پر ان کے پروگرام دیکھنے والوں نے رکھی حقیقت یہ ہے کہ جو اشفاق احمد اس دنیا میں 80 سال گزارنے کے بعد رخصت ہوئے وہ پہلے ہی روز یا اپنے عنوان شباب ہی سے اشفاق احمد نہ تھے بلکہ انہوں نے دنیا کو اس بلندی پر نظر آنے کے لیے شدید محنت کر کے زندگی بھر ترقی کے زینے چڑھے اور آخری دم تک شدید محنت کرتے رہے انہوں نے اپنی لمبی عمر میں کبھی کوئی لمبی بیماری نہ دیکھی اس لیے جب ان کی وفات کی خبر پھیلی تو ان سے محبت کرنے والے ششدر رہ گئے۔ ماڈل ٹاؤن کی فٹ بال گراؤنڈ ان لوگوں سے جنازے کے وقت بھری ہوئی تھی۔ وہ ایوان کارکنان پاکستان کی تقاریب میں بھی گاہے گاہے شریک ہوتے رہتے تھے اس لیے نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن نے بھی پاکستان ورکرز ٹرسٹ کے اشتراک سے ایک ''تعزیتی ریفرنس'' کا انعقاد کیا۔ وہ دو قومی نظریہ کے بھی پرتپاک حامی تھے اور تحریک قیام پاکستان کے دوران ہندوستان کے فرزندان توحید کی بطل جلیل جناب قائد اعظمؒ کی روح پرور قیادت میں شبانہ روز کام کرتے رہے۔ وہ اپنا ایک الگ فلسفہ زندگی رکھتے تھے وہ انسانیت کے بارے میں مختلف اور متحارب و متصادم نظریات رکھنے والوں میں فکری یگانگت پیدا کرنے کے لیے تحمل و بردباری کو ناگزیر قرار دیتے رہے لیکن ابھی ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونا باقی ہے۔ وہ متقابل صفات کے حامل فنکار تھے ان کو اپنی طرز کا ایک منفرد انسان گردانا گیا۔ وہ اپنے عظیم وطن پاکستان کے استحکام و ترقی پر مکمل یقین رکھتے تھے اور ہمیشہ پر اُمید نظر آتے تھے۔ ان کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام نئی نسل کی فکری اور فنی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے رہے جو قومی اعتبار سے ایک ناقابل فراموش خدمت تھی اشفاق نے اُردو زبان کے فروغ و ترویج کے میدان میں بھی اپنے

توسن فکر و دانش کو مہمیز لگائے رکھی' ان کی کوشش رہی کہ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے عام فہم الفاظ کو اُردو زبان کے دامن کا گوہر بنا دیا جاتا' وہ پاکستان کے ناخواندہ لوگوں سے دلی محبت کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کو ناخواندہ لوگوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اشفاق احمد زندگی کے ہر موضوع پر اور ہر پہلو کے بارے میں بلا تکان بولتے تھے۔ کیونکہ ان میں علم بھی تھا اور ہنر بھی۔ وہ انفرادی دانش پر اجتماعی دانائی کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ اپنی بات ہمیشہ درود شریف سے شروع کرتے' دراصل ان کے دل و دماغ واقعی نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے عشق سے سرشار تھے۔ اشفاق احمد نے اپنی فنکارانہ جدوجہد کا آغاز 1950ء کے بعد ریڈیو پاکستان سے اداکار ظریف کے ساتھ کیا' وہ اس پرانی کوٹھی کے نکڑ پر ایک کینٹین میں بیٹھے رہا کرتے تھے جس میں 1938ء میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا۔ گھنٹوں ان کی باتیں ہوتیں' پھر اشفاق احمد کو کام ملنے لگا تو انہوں نے کینٹین پر بیٹھنا چھوڑ دیا' ایک روز ظریف وہاں بیٹھے تھے کہ اشفاق احمد کینٹین کے قریب سے گزرے' ظریف نے آواز دی تو اشفاق نے کہا کہ ''یار میں مصروف ہوں'' کچھ دنوں کے بعد ظریف کو پنجابی فلم ''پاٹے خان'' میں کام مل گیا تو ان کا مستقبل بھی روشن ہوا' پاٹے خان اتنی کامیاب فلم ثابت ہوئی کہ ظریف ظریف ہو گئی چنانچہ وہ ریڈیو کی کینٹین چھوڑ کر فلم سٹوڈیوز کے ہو گئے مگر ایک روز جب وہ ریڈیو کی کینٹین کے قریب سے گزرے تو اتفاقاً اشفاق احمد وہاں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ظریف کو آواز دی تو ظریف نے کہ ''یار میں مصروف ہوں'' 1965ء کی جنگ کے دوران اعجاز حسین بٹالوی کی طرح اشفاق نے بھی 'تلقین شاہ' کے ذریعے براڈ کاسٹنگ میں نام پیدا کیا۔ انہیں فلمساز چودھری ثناء اللہ اور چودھری حاکم علی نے اپنی فلم دھوپ سائے' ڈائریکٹ کرنے کی دعوت دی' اس فلم میں تمام نامور فلمسٹار اور روایتی ڈائریکشن کی تکنیک سے گریز کیا گیا چنانچہ فلمسازوں کا سرمایہ ڈوب گیا۔ اشفاق احمد کو بھی پھر کبھی ڈائریکشن کا چانس نہ ملا مگر وہ خوش تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں نے روایت سے مار نہیں کھائی تجربہ ناکام ہو گیا تو کیا۔ آخر نیا ایک تجربہ گاہ ہی تو ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور
27 ستمبر 2004ء

اُداس داستانِ سرائے

عالم حسین
(یادِ رفتگاں)

اشفاق احمد ادب کی دنیا کا آفتاب تھے۔ ان کی وفات ہوئے چند دن ہی ہوئے ہیں' دل پر تازہ خراش کی وجہ سے قلم میں پہلے جیسی روانی ناممکن ہوگئی ہے کیونکہ جس آفتاب کی کرنوں کی روشنی میں ادبی تحریروں کے لیے میں نے قلم چلانا شروع کیا تھا' اب وہ آفتاب ادب اشفاق احمد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آخرت کے سفر کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ وہ ہزاروں کو چمکتا دمکتا رکھنے والا ستارہ رہتی دنیا تک کبھی طلوع نہ ہوگا' اس لیے دل ہمیشہ اداسی کی کیفیت میں رہے گا۔

شفیق لفظوں کی داستانیں رقم کرنے والے اشفاق احمد کی داستان سرائے میں جب میں نے پہلی مرتبہ قدم رکھا تو میرے سامنے ایک باوقار روپ میں کھڑی آپا بانو قدسیہ سے ملاقات ہوئی اور اس طرح اس داستان سرائے سے میرا واسطہ تقریباً پندرہ سال پہلے پڑا۔ میری جلد ہی اشفاق احمد صاحب کے ذاتی سیکرٹری کی حیثیت سے جان پہچان ہوگئی۔ یہ عہدہ بھی آپا جی کے فیض سے مجھے ملا۔ رفتہ رفتہ داستان سرائے بطور استاد میرے دل ودماغ میں سما گئی' لکھاری بننے کا شوق عروج پر تھا۔ آپا جی نے تربیت کے ساتھ ساتھ مجھے سراہنا بھی شروع کر دیا' جو کہ اس گھرانے کی پہلی خوبی ہے۔ میرا دس سال کا عرصہ اشفاق احمد کی ہمہ گیر شخصیت کے سامنے فطری طور پر باادب کھڑا رہنے میں گزرا۔ جن لوگوں پر ان کی شفقت کا ہاتھ رہتا تھا' ان میں' میں اکیلا ہی نہ تھا' بلکہ کئی ایک طالب علم اور دوسرے مفلس اور بے سہارا لوگ بغیر کسی کے احسان کو محسوس کیے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اشفاق احمد عوامی مصلح کی حیثیت کے حامل تھے۔ ہر لحہ لوگوں کو ترقی کی طرف گامزن رہنے کا سبق دینے کے بجائے احساس انسانیت کا درس دیتے تھے۔ ان کے ڈرامے ''ایک محبت سو افسانے'' کی مختلف کہانیوں کو دیکھ کر میں کبھی مطمئن نہ ہوتا' کیونکہ ان کے اختتام پر اس کہانی کا نتیجہ یاسیت ہی کیوں ہے۔ آج کی نسل کو رجائیت کے درس کی ضرورت ہے۔ اندر ہی اندر گہری سوچوں میں گم میں غور وخوض کرتا رہتا۔ میں آپا بانو قدسیہ سے کئی ایک سوالات کرتا رہتا۔ فارغ اوقات میں آپا جی سے سوالوں کا جواب کرتا۔ وہ نہایت اطمینان بخش جواب دیتیں۔ آج جبکہ اشفاق احمد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں' میں ان کی عظیم سوچوں کو سرنگوں ہو کر خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

اس تحریر میں یہ ناممکن ہے کہ میں اپنے دس برس کی شاگردی کے عمومی اور خصوصی واقعات کا ذکر کر سکوں۔ اشفاق احمد صاحب کی خوش گفتار شخصیت کے متعلق بیان کرنے کے لیے لامحدود مسودے لکھے جائیں تو ہو سکتا ہے پھر بھی ان کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو مکمل

نہ ہو سکے گی اور قاری ان کے متعلق مزید جاننے کے لیے بے قرار رہے۔ ان کی قربت سے میں نے جو بات جانی وہ اشفاق احمد کا اپنا قول تھا کہ انسان کو عزت نفس مل جائے تو تمام لوگ سکون کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ان کا پورا گھرانہ انسان کو عزت نفس سے نوازنے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عزت نفس کا لباس پہنا کر انسان کے اندر کے انسان کی بنیاد کو پختہ کیا جائے تو اللہ کی ذات زیادہ خوش ہوتی ہے۔ گھر میں کام کرنے والے افراد کو کبھی آپا جی پڑھا رہی ہوتی تھیں تو کبھی وہ مجھے ان کی تعلیم کے لیے وقت نکالنے کا کہتی تھیں۔ کبھی کسی کو مالی طور پر مدد کرنے کے طریقے تلاش کیے جاتے تاکہ ان کا عمل خیر متعلقہ فرد یا گھرانے کو ناگوار نہ گزرے۔

داستان سرائے میں ہونے والے بیٹھکوں کے دوران میں نے اکثر اشفاق احمد کو تعلیم یافتہ طبقے کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتے سنا کہ انہوں نے اس وطن عزیز کو بہت نقصان پہنچایا۔ ان کی فکریہ باتوں میں مذہب اور روحانیت کو خاص مقام حاصل تھا۔ جوان نسل کو قائم کرنے کے لیے اشفاق احمد کو ایک الگ دسترس حاصل تھی۔ ان کو مادیت کے اس دور میں روحانیت کا درس دیتے تھے۔ اکثر اوقات قدرت اللہ شہاب صاحب اور ممتاز مفتی کی باتوں کو اپنی گفتگو کا حصہ بنا کر پر موثر بناتے تھے۔

10 سال کے طویل عرصہ میں اشفاق صاحب کی شخصیت کو میں نے ہر لمحہ پڑھنے کی کوشش کی۔ بہت سے نہایت قابل دلچسپ باتوں کے ساتھ ساتھ ان کی عظیم شخصیت میں ایک خاص خوبی یہ پائی جاتی تھی کہ وہ پرسان حال، بے سہارا اور مفلس لوگوں پر شفقت کا ہاتھ رکھتے تھے۔ ان کی خوبی کی بناء پر انہیں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ انسانی ہمدردی کے حقدار لوگوں پر شفقت کے مینار سایہ رکھتے تھے جس کے سائے میں دوسرے لوگوں کے لیے شفقتیں ہی شفقتیں تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم صوفی صفت اشفاق احمد کی خوش الحانی طبع سے محروم ہو گئے۔ اب داستان سرائے اداس انگرائیاں لے کر اشفاق احمد کے عقیدت مندوں کو سوگوار کر رہی ہے کیونکہ اس سرائے کے مختلف کونوں میں بیٹھ کر اللہ ھو ورد کرنے والا اسے ویران چھوڑ گیا۔ داستان سرائے ایسے عظیم داستان گو سے محروم ہوگئی ہے جس نے اسے داستان سرائے کے نام سے منسوب کیا تھا کیونکہ اب اس کو کبھی بھی زاویہ کا دربار لگانے والے شرف حاصل نہ ہوگا اور داستان سرائے ہمیشہ سوچوں میں ڈوب کر گتھیاں سلجھانے والے کا انتظار کرتی رہے گی۔

روزنامہ خبریں لاہور

30 ستمبر 2004ء

ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے

اشفاق احمد۔ کچھ یادیں

افضال احمد

یہ ستمبر 1973 کی بات ہے منسٹری۔ آف فنانس میں بطور نیشنل سیونگز آفیسر میری تقرری ہوئی پہلی تعیناتی نیشنل سیونگز گلبرگ کے انچارج کی حیثیت سے تھی۔ مراکز قومی بچت کا قیام پہلی بار ہوا تھا اور ہمارا حال یہ تھا کہ فرنیچر اور دیگر دفتری لوازمات کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے برانچ میں دری بچھا رکھی تھی۔ فائلیں اور سرٹیفکیٹس وغیرہ کیلئے بہرحال ایک سیف مہیا کر دیا گیا تھا۔ ایک شام اشفاق احمد اپنے بیٹے (غالباً رفیق احمد) کے ساتھ تشریف لائے تو ہم سب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ اشفاق صاحب سے میری پہلی ملاقات بالمشافہ تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اشفاق صاحب نے گیروے رنگ کا کرتہ اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ میرے پہلے کلائنٹ کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے 5 ہزار کے ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ خریدے اور میں کئی روز اپنے افسران اور کولیگز کو فخر سے یہ بتاتا رہا کہ میری برانچ کے کاروبار کا آغاز اشفاق احمد کی بچت سے ہوا ہے۔ ریڈیو اور پھر ٹیلی ویژن کے حوالے سے اشفاق احمد کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیل چکی تھی خاص طور پر ٹی وی پر میزبان کی حیثیت سے ان کی گفتگو کا انداز میرے دل و دماغ پر یوں طاری تھا کہ میں انہیں اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ اس حوالے سے میری دوسری آئیڈیل شخصیت کی ہے (خدا انہیں سلامت رکھے) کچھ عرصے بعد میرا تبادلہ ریجنل ڈائریکٹوریٹ میں پبلسٹی آفیسر کے طور پر ہو گیا۔ ان دنوں ہر سال ہفتہ قومی بچت بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس ہفتے کی تقریبات میں نیشنل سنٹر میں ایک سیمینار کا انعقاد بھی میرے ذمے تھا۔ میں نے اشفاق صاحب کو فون کیا فوراً رضامند ہو گئے اور ان کی تقریر کا وہ

جملہ مجھے آج بھی یاد ہے جس میں بچت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ہر صبح جب بچے نہا کر سکول چلے جاتے ہیں تو میری نہانے کی باری آخر میں آتی ہے مگر جب تولیہ اٹھاتا ہوں تو وہ پوری طرح گیلا ہوتا ہے جسے استعمال کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر پھر فوراً یہ خیال آتا ہے کہ میں نے اتنے پیسے بچا رکھے ہیں کہ جن سے میں ایسے سینکڑوں تولیے خرید سکتا ہوں اور یہ سوچتے ہی تولیئے کا گیلا پن مجھے قطعی محسوس نہیں ہوتا۔ پھر ان سے محبتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ راز کھلا کہ وہ عام زندگی میں بھی اسی لب و لہجے اور انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ دراصل دانشور ہونا اپنی جگہ بڑی بات ضرور ہے مگر اپنی دانش کو Express کرنا اور اس انداز میں بیان کرنا کہ بات سننے اور دیکھنے والے کے دل میں اتر جائے، بہت کم دانشوروں کے حصے میں آیا ہے اور اشفاق صاحب بلاشبہ اس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ 1995 میں جب میں عرصہ دراز کے بعد لندن سے وطن واپس لوٹا تو اشفاق صاحب کے بھانجے اور سمدھی جاوید طارق خان نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے مجھے ہائی نون گروپ کا میڈیا چیف بنا دیا (انہوں نے مجھے پورے سات برس برداشت کیا جس کے لیے میں ہمیشہ ان کا ممنون رہونگا) جاوید طارق خان ایک مجلسی شخصیت ہیں۔ ان دنوں مختلف ''بہانوں'' سے ان کے ہاں تقریبات ہوتی رہتی تھیں جن میں اشفاق صاحب اور بانو آپا بھی مدعو ہوتے تھے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں جب میں نے اشفاق صاحب کو بتایا کہ میں لندن سے شوگر کے مرض کا ''تحفہ'' لے کر آیا ہوں تو انہوں نے جس انداز میں میری حوصلہ افزائی کی وہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ کہنے لگے ''افضال! اس مرض کو اپنے سر پر سوار نہ کر لینا۔ میرا تجربہ اور علم کہتا ہے کہ شوگر کا مریض عام صحت مند آدمی سے کم سے کم دس برس زیادہ جی سکتا ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ شوگر کنٹرول رکھنے کے لئے پرہیز ضروری ہے اور اگر شوگر کا مریض پرہیز کریگا تو دیگر کئی بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ بس پرہیز شرط ہے اور تم سمجھدار آدمی ہو یقیناً پرہیز کرتے ہوگے'' زندگی کتنی تیزی کے ساتھ گزر رہی ہے اس کا اندازہ اب

ہو رہا ہے۔ بہت سی تقریبات میں انہیں کبھی صدر مجلس اور کبھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے دعوت دی اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے کبھی میری درخواست کو نہیں ٹھکرایا بلکہ ''ایک ٹکٹ میں دو مزے'' کے مصداق ہمیشہ بانو آپا ان کے ہمراہ ہوا کرتیں۔ بابا جی نور والے اور پھر واصف علی واصف کا تذکرہ انہی کی زبانی سنا۔ وہ جس محفل میں بھی ہوتے شرکائے محفل کو یقین ہوتا کہ وہ کوئی نہ کوئی نئی بات' دانش کا کوئی تازہ موتی' زندگی اپنے اور دوسروں کیلئے آسان بنانے کا کوئی سادہ سا نسخہ اور کوئی قابل عمل فلسفہ لے کر ہی محفل سے اٹھیں گے۔ ٹی وی پر انہوں نے ''زاویہ'' کا آغاز کیا تو ہماری جو نئی نسل جو میڈونا اور مائیکل جیکسن ہی کو دنیا کے ''بڑے آدمی'' سمجھتی تھی۔ اس حقیقت سے روشناس ہوئی کہ ہمارے بابوں کے سامنے ان بوژنوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اشفاق صاحب کا حلقہ اثر محدود نہیں ہے۔

Haves اور Have nots میں ایسا کونسا طبقہ ہے جو ان کا گرویدہ نہیں ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب انہوں نے تقریبات میں جانا قدرے کم کر دیا تھا۔ ایک روز مجھے سہیل احمد کا فون آیا کہ آج رات انہوں نے اپنا مقبول کھیل ''اک تیرا صنم خانہ'' دیکھنے کیلئے چند ادیبوں شاعروں' دانشوروں اور صحافیوں کو بلایا ہے۔ آپ بھی آئیے۔ انشاء اللہ مایوس نہیں ہونگے۔ تماثیل تھیٹر پہنچا تو اشفاق احمد اور بانو آپا سمیت عطاالحق قاسمی اعزاز احمد آذر اور کئی اہل قلم موجود تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے اشفاق احمد اور بانو آپا کے ساتھ والی نشست ملی۔ کاسٹ میں تقریباً سارے نامور کامیڈین شامل تھے اور سہیل احمد بھی ایک منفرد کردار ادا کر رہا تھا۔ ان فنکاروں کے جملوں پر اشفاق صاحب کھل کر ہنستے تھے اور مجھے بھی اپنی ہنسی میں شامل کرتے تھے۔ انٹرول ہوا تو کہنے لگے ''افضال! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جو جملے یہ فنکار بول رہے ہیں۔ انہیں دنیا کا بڑے سے بڑا مزاح نگار بھی نہیں لکھ سکتا کم سے کم میں تو بالکل نہیں لکھ سکتا۔ بونو آپا نے بھی ان کے اس جملے کی تائید کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہم سب نے پورا کھیل دیکھا۔ فنکاروں کی خوشی کا علم یہ تھا کہ وہ اشفاق احمد اور بانو آپا کے

قدموں پر نثار ہو رہے تھے اور یوں ملاقات ایک یادگار تقریب کا روپ اختیار کر گئی تھی۔ ایسی درجنوں یادیں ہیں جو ذہن کے پردوں پر نقش ہیں اور تادم آخر میرا اثاثہ رہیں گی۔ یہ قانون قدرت ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی جانب لوٹتی ہے چنانچہ اس قانون کی بالادستی ثابت کرنے کیلئے اشفاق صاحب بھی اپنے اصل کی جانب لوٹ گئے مگر انہوں نے علم و عرفان کے جو موتی بکھیرے اور آسانیاں پیدا کرنے کے فلسفے کو جس انداز میں زبان زد عام کیا وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ وہ ایک داستان گو ہی نہیں تھے درویش بھی تھے اور ان کا جنازہ پڑھنے کے بعد سے اب تک میں یہی سوچ رہا ہوں کہ اب دانش اور درویشی کا دامن خالی سا کیوں لگنے لگا ہے

ماہنامہ ''دستک'' لاہور
شمارہ اکتوبر 2004ء

کارواں سرائے ۔ داستاں گو
اشفاق احمد رخصت ہوئے

مستنصر حسین تارڑ

میں یہ کالم کہیں سے بھی شروع کر سکتا ہوں اور پھر بھی یہ ایک مکمل حیات ہوگی ۔ اگر کل سے شروع کرتا ہوں تو ماڈل ٹاؤن کی سڑکیں بلاک ہو چکی ہیں ۔ پولیس کے سپاہی پریشان ہیں کہ یہ آج کیا ہو گیا ہے' کون آ رہا ہے ۔ اگر کوئی آ رہا ہے تو حفاظتی انتظام کیوں نہیں ہیں اور جیسے ساری سڑکیں روم کو جاتی ہیں ایسے آج سارے راستے "داستان سرائے" کو جا رہے ہیں کہ آج وہ جو اس سرائے کا مکین تھا جو داستان گو تھا' وہ وہاں سے اُٹھ گیا ہے...... کوچ کر گیا ہے ۔

اگر یہ کالم میں آج سے پچاس برس پیشتر سے شروع کرتا ہوں تو لکشمی مینشن میں ایک دوپہر جاوید اثر میرے پاس آ کر کہتا ہے "یار مستنصر' والد صاحب کے ایک دوست ہیں خان صاحب' نہایت ہینڈسم اور گورے چٹے...... لکھتے لکھاتے بھی ہیں ۔ تو وہ کچھ عرصہ روم کے ریڈیو اسٹیشن پر اُردو کے پروگرام کر کے واپس آئے ہیں تو اپنے ساتھ ایک عجیب وغریب مشین لائے ہیں ۔ یار اس مشین کے سامنے باتیں کرو تو تمہاری باتیں اس میں بھر جاتی ہیں ۔ بٹن دباؤ تو وہی باتیں سنانے لگتی ہے ۔"

"نہیں یار...... یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔"

"تم آ جاؤ' خان صاحب وہ مشین ہمارے گھر میں چھوڑ گئے ہیں ۔"

جاوید اثر اس مشین کے سامنے بیٹھ کر نہایت بے سرے انداز میں "یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں" گاتا ہے پھر اس کا بٹن دباتا ہے تو مشین اسی کی آواز میں "یہ رات یہ چاندنی" الاپنے لگتی ہے ۔ یہ میری زندگی کا پہلا ٹیپ ریکارڈر تھا اور اسے اشفاق احمد خان روم سے لے کر آئے تھے ۔ خان صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ واقعی نہایت گورے چٹے ہیرو قسم کے شخص ہیں ۔ تھوڑی دیر بعد جاوید کے والد پروفیسر جی ایم اثر اور اشفاق احمد اُٹھ کر سعادت حسن منٹو کے گھر چلے جاتے ہیں ۔

اگر میں یہ کالم چالیس برس پیشتر سے شروع کرتا ہوں تو اشفاق احمد ہماری بیجوں کی دکان کسان اینڈ کمپنی کی ایک آہنی کرسی پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں اور میرے ابا جی سے زراعت کے بارے میں مشورے لے رہے ہیں ۔ "چوہدری صاحب...... امرود میں کیڑا پڑ جاتا ہے' اس کا کیا کروں ۔ سنا ہے جیکبز والوں نے ہالینڈ سے گلاب کے نہایت نایاب پودے منگائے ہیں ۔ ان دنوں گوجرانوالہ کا ریڈ بلڈ مالٹا ناپید ہوتا جا رہا ہے' اس کی نسل کو بچائیں ۔ آپ کا پرچہ "کاشت کار جدید" دو تین ماہ سے نہیں آیا' کیا مسئلہ ہے ۔ وہ پھولوں کے بارے میں آپ جو کتاب لکھ رہے تھے اس کا کیا ہوا ۔" اس کے بعد وہ ہمارے ملازم کو پکارتے ہیں ۔ "کاکا گوالمنڈی چوک میں جو خلیفہ ہے کبابیا' اسے کہنا خان صاحب نے بھیجا ہے دو درجن کباب تو لے کر آؤ ۔"

اشفاق احمد ان دنوں ہماری دکان سے اُٹھ کر موچی دروازے میں کسی ترکھان بابے سے لکڑی کا کام سیکھنے جاتے تھے۔ راستے میں جہاں ریوڑیاں بنتی تھیں وہاں کھڑے ہو کر ان کی تیاری کے تمام مراحل کو نہایت شوق سے دیکھتے تھے۔

1971ء کی جنگ میں جو کچھ ہوا' میں اس دوران ایک خاموش سناٹے میں چپ بیٹھا رہتا' پھر ریڈیو پر اشفاق صاحب کی آواز آئی اور جس انداز میں انہوں نے اس سانحے کو بیان کیا اور ڈھارس بندھائی' اس نے میری اب تک خشک آنکھوں سے سیلاب بہا دیئے۔

میری پہلی کتاب ''نکلے تری تلاش میں'' شائع ہوئی تو میں نے تعارفی تقریب کے لیے ان سے صدارت کی درخواست کی...... تو وہ بہت ہی راضی ہوئے۔ ''کمال ہے بھئی تم بھی ادیب بن گئے ہو۔ بیٹے تم چوہدری رحمت خان تارڑ کے ہو اور سعادت حسن منٹو کے پڑوس میں رہتے رہے ہو' کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا تھا۔''

میری شادی ہوئی تو ایک روز میری ساس صاحبہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیٹا تم بھی یہ کتابیں لکھتے ہو تو تم اشفاق کو جانتے ہو۔''

''کون اشفاق......؟''

''وہی چاچے محمد حسین سلوتری کا بیٹا...... آفتاب کا چھوٹا بھائی۔''

دراصل میری ساس صاحبہ اور اشفاق صاحب مشرقی پنجاب کے ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بزرگوں کے آپس میں بہت گہرے تعلقات تھے اور اسی حوالے سے میری بیگم میمونہ کو وہ اور بانو آپا مجھ سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ اشفاق صاحب کے والد ویٹرنری ڈاکٹر تھے اور اس حوالے سے میری ساس صاحبہ ہمیشہ انہیں چاچے محمد حسین سلوتری کے بیٹے کی حیثیت سے یاد کرتیں۔ چند سکھ خاندانوں کا تذکرہ بھی ہوتا جن سے دونوں خاندانوں کے گہرے تعلقات تھے۔ یوں بھی میری ساس کے سگے نانا جان سکھ مذہب کے پیروکار تھے اور بچپن میں مسلمان ہو گئے تھے۔

کیا میں یہ کالم ان کی ٹیلی ویژن سے وابستگی کے بارے میں شروع کروں۔ جب وہ ''ایک محبت سو افسانے'' لکھ رہے تھے اور محمد نثار حسین کو کہا کرتے تھے کہ نثار اس کردار کے لیے صرف اور صرف مستنصر ذہن میں آتا ہے۔ اس کا چہرہ بڑے کلوز میں رکھنا...... اچھا لگے گا۔'' ''حیرت کدہ'' میں بھی انہوں نے مجھے اسی طور پر نظر میں رکھا۔ میں نے جب کمپیئرنگ شروع کی تو انہی کے گھریلو اور سادہ انداز کو اپنایا۔

یا پھر دو چار ہفتے قبل سے یہ کالم شروع کروں تو وہ بیمار ہیں۔ بانو آپا کا کہنا ہے کو لوگ آ جاتے ہیں تو یہ آرام نہیں کرتے' ان سے باتیں کرنے لگتے ہیں اور تھک جاتے ہیں۔ اشفاق صاحب کہہ رہے ہیں ''مستنصر! یہ ڈاکٹر بھی عجیب نسل کے ہوتے ہیں۔ بندے پر اتنی پابندیاں لگا

دیتے ہیں کہ وہ اچھا بھلا ہو تو بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ مجھے دو چیزوں سے منع کر دیا ہے اور وہی دونوں مجھے پسند ہیں یعنی گفتگو کرنا اور اچھا کھانا۔''

میرا خیال ہے یہ کالم تو کبھی اختتام کو نہ پہنچے گا اس لیے کل کی بات ہی کرتے ہیں جب ماڈل ٹاؤن کی سڑکیں بلاک ہو چکی تھیں اور ''داستان سرائے'' سے داستان گو اٹھ رہا تھا۔ ایسا جنازہ تو کسی بڑے نصیب والے کو ملتا ہے۔ ادیب تھے' میڈیا کے لوگ' ان کے دوست عزیز واقارب تو تھے لیکن ہزاروں ایسے تھے جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہیں لیکن وہ اشفاق احمد کو جانتے تھے اور وہ کیسے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جیسے ان کا سگا بھائی مر گیا ہو' باپ مر گیا ہو...... دوست مر گیا ہو۔

ماڈل ٹاؤن کے جی بلاک کے قبرستان میں انہیں فیض احمد فیض کی قربت میں دفن کیا گیا۔

اس عہد کا سب سے بڑا داستان گو' ٹیلیویژن ڈرامے کا باوا آدم رخصت ہوا۔

شاید تیس برس پیشتر فری میسن ہال میں کسی تقریب کے بعد بانو آپا میرے برابر میں چل رہی تھیں' صدر دروازے پر میں رکا۔ ''آیئے بانو آپا۔''

تو وہ رک گئیں اور پیچھے مڑ کر گفتگو میں مگن اشفاق صاحب کی جانب دیکھا اور کہنے لگیں ''نہیں پہلے خان صاحب گزریں گے' تب میں جاؤں گی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ پہلے گاڑی چلی جائے اور انجن بعد میں آئے۔''

تو پہلے خان صاحب گزر گئے۔ گاڑی ایک سنسان پلیٹ فارم پر انجن کے بغیر کھڑی ہے۔

ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی
(گوشہ ادب)
20 تا 26 ستمبر 2004ء

"But you have stated that sharif Adami cannot be a great writer!"

"Sir I do not consider you a sharif adami in the usual sense of the word," and he gave another Ashfaqian laugh.

Last time I visted his abode, Dastan Sarai, he was not feeling too well. Even then, he would entertain visitors who flocked around him worried about his health. He was in high spirits, but looked pale. "Tarar these doctors are a strange breed. They have for bidden me to indulge in two things which I love most, talking and eating."

A persian couplet comes in to my mind, which says that a city without a Maikhana is a desolate city. The Maikhana of the city of Lahore is no more and the city is desolate, empty without him. The weaver of dreams and sorrows has abandoned us and a lonely swan is in the black robes of sorrow.

Daily "DAWN" (Matropolitin)

September 26,2004

returning to the village nearing sunset, bathed in colours. Truly a moving piece. But, in the end Ashfaq sahib's heroin starts offering Namaz. Why did he have to do it so directly?

To my ill luck, Ashfaq sahib got the wind of it and complained to my wife. "Memonna look at this husband of yours. He objects about offering the Namaz in my short story."

A debate ensued during his lifetime as well that Ashfaq sahib should have given more time to his short stories and novels; instead he concentrated more on the media side. He was working on his autobiography, some parts of which I had occasion to enjoy. A complete novel Khel Tamasha was born out of it, But alas, he could not complete it.

Mumtaz Mufti a very capricious person once admonished me in Islamabad, "Tarar you are also following the footsteps of Ashfaq. You are basically a writer, why are you wasting your time in media in the pursuit of vulgar fame. Look what it has done to Ashfaq.

Mufti sahib and Ashfaq sahib were the closest possible friends, so how could I evaluate his statement. If Ashfaq sahib were just a run of the mill writer, which he was not, his readership would have been limited. He chose media because he wanted to reach the masses and those masses were there in his funeral procession to thank a man who did not hide himself in the cloak of intellectualism but reached out to them and shared their dreams and sorrows.

In some newspaper interview, I casually declared that a virtuous man cannot be a great writer (Ek sharif adami bara addeb nahin ho sakta) and the next moment Ashfaq sahib was on phone, "Oi Tarar, what sort of statement is this? It means that I am not a great write." And he laughed heartily.

"Sir you are my ustad and you are a great writer," I said sheepishly.

channel's tribute to him. I must admit that at that time I was slightly upset; as a young man I wanted to play 'hero' and here I was whitening my jet black hair playing an old man. But Ashfaq sahib and producer Mohammad Nisar Hussain assured me that it will be a turning point in my acting career and it was.

Initially the play was named Ankh Ki Putli. However, during the recording Ashfaq sahib changed his mind and decided to call it Quratulain. He came up with a very strange logic: "All the plays in this series will carry very laborious and difficult titles so that people will remember only the themes and not the name of plays!" I must also pay tribute to the producer Mohammad Nisar Hussain (MNH to his friends) whose casting and production brought out the spirit and sentiments of the plays in such an artistic way that even Ashfaq sahib was amazed. Although latter on, Saira Kazmi, Mohammed Azim and Arif Waqar also proved to be brilliant. But MNH was the person who blazed the way.

My marriage was another factor that brought me still closer to Ashfaq sahib. My mother-in-law had an inkling that I dabbled in some dubious activities, like writing books etc. So one of the days she asked me, "Mustansar, do you know this young man Ashfaq?" Naturally I said no ammiji. How was I know that she was referring to Ashfaq sahib? But then she tressed, "Ashfaq, the son of uncle Mohammad Khan Salotri, he also writes something."

Actually my mother-in-law's father and Ashfaq sahib's father were very close friends and belonged to the same town in East Punjab. Uncle Mohammad Khan was a vet; doctor hence the local village term, Salotri, From then on, Ashfaq sahib and Bano Aapa treated me as a relative of some sort. As a matter of fact, whenever I surpassed my limits, he would lodge a complaint with Memoona my wife. For instance, once Zulifqar Tabish, a common friend and I were discussing his latest short story Dhor Dunger Ki Wapsi and I commented that rarely I have read such a powerful description of cattle

been extracted fully and has nothing new to impart, he will desert him for a better 'Baba'.

Mostly the 'Baba' left behind was influenced by him to such an extent that he would become a little Ashfaq Ahmad for the rest of his life. This was the magnetic charm of his presence.

It is well nigh impossible to sum up and express an association spanning fifty years in a short write up of this nature. Yet, I will try to summarize.

I first heard of the name, Ashfaq Ahmad when I was introduced to a gadget called a tape recorder. Ashfaq sahib had brought it for Professor G.M. Asar, from Rome, and his son Javed was recording his hoarse and vastly out of tune singing voice. When I finally met Ashfaq sahib, he was a picture of manly grace with curly hair, fair complexion and a bewitching smile. After meeting G.M. Asar he would go and meet Saadat Hassan Manto if he was around.

Some years passed and then one winter morning I found him sitting across the table with my father Ch. Rehmat Khan Tarar in our seed-shop near Gowlamandi, discussing his agricultural problems with him. He was a regular visitor and a friend of my father. On certain days he would go to a carpenter inside Mochi Gate to learn his craft, enjoy at least a dozen of Khalifa's heavenly Kebabs and then come to our shop for a chat.

Then one day, without any intention, I found myself thrust into the world of acting. And there, at PTV Lahore, he was a king, comparing, indirectly directing and of course writing the very first memorable plays that have now become classics. I was pitched against Roohi Bano and Qavi Khan in his series Hairat Kadah. I carried myself slightly with honour and he approved of it. Then came his classic Ek Muhabbat Sau Afsane and I was cast as a father in the very first play Quratulain which was telecast last week by PTV during the

In the black robes of sorrow

Diary of A Vagabond

By Mustansar Hussain Tarar

BANO Qudsia and Ashfaq Ahmad were like a pair of royal swans, silently floating on the dark blue lake of creative literature, only making ripples amongst the Urdu and Punjabi readers throughout the world. Last week the pair was separated after the leading swan sang its last song and left its lifetime companion mourning the loss.

Whenever I saw Bano Apa and Ashfaq sahib together and they were always inseparable I called them a Hanson Ka Jora and they enjoyed my comment.

During his funeral, while thousands of admirers were inconsolable, crying and sobbing, strangely enough I felt unmoved. At peace with myself and at times smiling, sadly, just because I did not feel that he had gone, I felt his presence all around me as I had done for the last fifty years. He did not leave a vacuum, which cannot be filled because he had not left. People like him do not leave but hide themselves behind a veil, and anyone who visits their written word can see them alive and smiling behind that veil.

While we were burying his mortal remains in the G. block Model Town graveyard, where Faiz sahib also rests, there was much talk of his being a pir or saint. Pirs and saints are in plenty, but there was only one Ashfaq Ahmad, the writer who was on a much higher pedestal.

However, he was a "Baba Collector". I don't think he ever approved of my crude expression, but then, he never disapproved either. He would go to any lengths to meet a new found 'Baba'. He would give him the utmost respect, sit at his feet and listen to his utterances with utmost reverence and the moment he realized that the Baba is now repeating himself, has

support of the famous artist Aazer Zubi. He was also made head of the West Pakistan office of the Pakistan Writers Guild during Ayub's dictatorship years but it did not last a long time. Both the projects were not his cup of tea and he was next appointed to the Taraqqi-i-Urdu Board where he served for almost a quarter of a century.

Ashfaque proved his mettle again by giving the publications of the Board a major uplift and revamping the dwindling financial situation. He raised a beautiful building for the Board from its own resources and also had published the best history books on the subcontinent written in Persian. They were also translated by many eminent scholars and teachers. He reproduced many of the rare dictionaries compiled by British scholars and also a Haft Zabani Lughat with the single purpose of enriching Urdu and bringing it closer to local languages.

Because of his interaction with the Sufis and the common people, he recognized the need to write also in Punjabi and contributed features and plays to the electronic media. They were quite well received by the people. "Tahli Dey Thhalley" was one of the first ever collection of radio plays in Punjabi. When a master's programme in Punjabi was introduced in Punjab University, Ashfaque prepared the curriculum and taught Punjabi with other eminent professors like Qayyum Nazar, Asghar Saleem and Dr. Faqir Muhammad Faqir.

Ashafque Ahmad was undoubtedly a leading fiction writer but his real mettle was proved in his eloquent speeches made to spellbound audiences. Now as many obituary writers have sadly said, Khamosh ho gaya hay chaman bolta hua.

The DAWN Lahore

19, Sept. 2004

Ashfaque Ahmad passed away on September 7

Ashfaque in those days worked hard to be recognized as a story writer. Prestigious literary magazines like Nuqoosh, Adab-i-Lateef and Savera were in those days tightly controlled by progressive writers and it was very difficult for him of find his way into these magazines. With the support of Intizar Hussain, A. Hameed and other comparatively lesser known writers, he did his best to break the hegemony of the Progressives. In due course, the government of Punjab closed down these magazines temporarily to reform their editorial boards. During this period, Ashfaque and other churned out the best of their pieces including his story "Gadaria".

Ashfaque continued writing good short stories but was also interested in writing dialogue more than narrative write-ups. He enaged himself more in story telling (dastangoi) rather than story writing. Basides his potential as a powerful storyteller, he was also fascinated with the electronic media in which he carried on his role as a reformist and this mattered most to him. From Azad Kashmir radio scripts down to TV Zavia, he was a forceful narrator, which won him tremendous accolades.

Ashfaque Ahmad was a man of many dimensions. He always wanted to prove his worth in many other fields as well. Scripting films, managing publication, and also imbibing the sufi tradition, a school of thought that he shared with two other fiction writers, Mumtaz Mufti and Qudrat Ullah Shahab. Later, he took up the editorship of the weekly Lail-o-Nihar after the takeover of the Progressive Papers Limited (which published the Pakistan Times, Imroze and the weekly Lail-o-Nihar from Lahore) by Ayub Khan's military regime. Earlier, the paper was edited by Faiz Ahmad Faiz and by renowened progressive scholars, such as Syed Sibte Hasan, who was imprisoned by the Khakis.

Ashfaque was considered apt for the job because of his experience with a monthly magazine, Dastango with the

dialect close to Haryanvi, also spoken in the Hoshiarpur district. Ashfaque was warmly received by the crowd, which listened to his short story and the speech which he delivered on topics close to his heart, one of them being corruption in society. A sizeable crowd then accompanied Ashfaque Ahmad to the railway station to see him off to Lahore.

Ashfaque Ahmad's leadership qualities could be traced right back in his earlier years. He once narrated a story about a procession taken out by students, particularly the Sikh and the Muslim students, on the death of Allama Iqbal. Ashaque was then studying in class IX in a school in Ferozepur. It is believed that Ashfaque himself was leading the mourning procession, of course under the guidance of some staff member.

The role suited well with his trait as the storyteller (dastango). He put this role of his to use at the refugee camp of Walton where he was employed to record the where abouts of the incoming refugees from the Indian Punjab. He was not only assigned to record the names of the refugees but also make announcements on the mike. Mumtaz Mufti, then a well-known short story writer, was also working in the camp and was all praise for Ashfaque's role as an announcer.

Later, Mufti came to know about Ashfaque's keen interest in Urdu fiction and confessed having read his stories, such as " Aapa". Ashfaque had also to his credit, "Toba", the short story published in the famous Urdu magazine Adabi Duniya by Maulana Salahuddin in 1942. It was widely appreciated.

Mumtaz Mufti, who was much impressed with Ashfaque's knowledge and potential, asked him to work with him on Azad Kashmir Radio, Tararkhel. It was a mobile unit and required people who could produce programmes at the minute's notice. Ashfaque was considered suitable for the job. This experience of his at the refugees camp provided ample food for the stories written by him later in life.

Ashfaque Ahmad
Man of the masses

By Shafqat Tanvir Mirza

In 1966, Prof. Dr. Shafiq Jullundhri, a former head of the mass communication department of Punjab University and also then the secretary of the 'Bazm-iAdab', arranged a meeting of students with Ashfaque Ahmad, the story writer, at the Islamia College where around 20,000 Faisalabadis almost gheraoed him. More than the story writer, Ashfaque Ahmad was popularly known as Talqeen Shah then, who used to appear in a radio talk show. His popularity among the masses through his famous radio talk was almost unbelievable.

According to Prof. Shafiq, a small news item appeared on the itinerary of the meeting in a local Urdu daily in which Ashfaque was identified as the famous radio compere, Talqeen Shah. The day of the meeting people started pouring in against an invited capacity of around 500. So much so that the venue proved too small and the college staff had to shift the event to the spacious college hall. As people still kept pouring in, the administration panicked and announced on the mike that Talqeen Shah had cancelled his arrival and that the short story writer, Ashfaque Ahmad was coming. They tried to dissuade the uncontrollable crowd by the announcement but by then the audience knew the real person behind Talqeen Shah.

Though the principal considered calling the police to help control the crowd before the distinguished guest's arrival, he was wisely advised by one of the senior staff members to yet change the venue to another location, this time the hockey ground. Before he arrived, the number of the audience had risen to 20,000. Students sat on the grassy ground waiting for the man who used to talk about their problems in their own

Of late Ashfaque Ahmad veered into mysticism under the influence of Qudratullah Shahab, Mumtaz Mufti and Masood Qureshi. He embarked on a new path that made some of his writings enigmatic to ordinary readers or viewers. His popularity, however, never waned.

During the last stage of life, he reverted to TV and staged talk shows where in he would keep his God-gifted capacity to speak alone for hours, telling anecdotes and stories about extraordinary traits found among common people ___ his babas.

Last time I met him a few years ago at a dinner thrown by our common friend Dr. Zia Samad, who was Ashfaque Ahmad's colleague in Dayal Singh College and later in Italy. I found that in real life he looked flabbier than what he appeared on the television. The gray beard had given him a look of elderliness and piety.

He was a modern day storyteller who lived in the age of printing presses and audiovisual electronic devices but still he was able to captivate his readers and listeners with his artistic rendition of stories and anecdotes.

The NEWS Lahore

Sept. 19,2004

Ashfaque Ahmad had the distinction of being first Pakistani editor whom Ayub Khan gave an interview. Though Ashfaqued Ahmad tried to maintain the standard of the magazine but after the government take-over the circulation of all PPL papers nose-dived. Ashfaque Ahmad quit his job and was replaced by his teacher Sufi Ghulam Mustafa Tabassum as the editor of Lail-o-Nahar.

The journal seized publication after some time. It was then that Ashfaque Ahmad thought of starting a radio programme, Talqin Shah. The programme was a great success because Ashfaque Ahmad spoke in his native dialect and discussed day to day problems faced by common people with his companions. The programme contributed in a big way towards the media propaganda during 1965 Indo-Pak war.

It seems there were several agendas in Ashfaque Ahmad's mind at the same time. One of them was film making which also proved to be a commercially futile venture. Then TV came into the lives of Pakistanis and Ashfaque Ahmad wrote teleplays and serials that became vry popular. Soon his name became a guarantee for the success of the play. He adapted his short stories from his book Aik Muhabbat Sau Afsanay into TV dramas, treating TV viewers to his crisp dialogues and beautiful treatment of the subject matter.

One side effect of his TV activities was that he stopped writing for the magazines. He did not produce any novel or collection of short stories during that period. Ashfaque Ahmad's fame as a prolific and popular writer made him a favorite with changing regimes of the country, especially the military governments who would like to take advantage of his writing skills. Ashfaque Ahmad, whose earlier writings were directly inspired by the problems of common people, had great communicative value for the governments who continued banking upon him without realizing how much harm they were causing to his literary abilities in the process.

Even during his student days, Ashfaque Ahmad was writing for Radio Pakistan where he made many friends who included people like Mahmood Nizami, Masood Qureshi and Mumtaz Mufti. After completion of his masters, he joined Dayal Singh College Lahore as a lecturer. Situated in the heart of the city, this college had many writers on its faculty including Abid Ali Abid, Tajwar Najibabadi, Anjum Roomani, Shohrat Bukhari and Sajjad Rizvi.

But Ashfaque Ahmad was a restless soul who always longed for travel and learning. The opportunity to fulfil these desires came his way when he was offered a position in Italy where he was to work for the Urdu section of Radio Rome. In his story Fullbright, Ashfaque Ahmad has described how he managed to collect funds for traveling to Rome and how in this venture he was helped by a beggar. The story showed how Ashfaque Ahmad always looked for special traits among ordinary people whom he called babas. These babas became the subject of his talk shows after the advent of television.

Back from Italy, Ashfaque Ahmad married a formed fellow student, Bano Qudsia (a famous writer in her own right). He also started a monthly magazine Dastaan Go. It was a unique magazine in the sense that it was shorter in size then other magazines. Ashfaque Ahmad used to design and print its title himself by a technique he had learnt from Italy. In editing he was assisted by his wife Bano Qudsia. The magazine remained in circulation for quite some time. But the venture did not succeed because firstly it was a purely prose magazine and secondly Ashfaque Ahmad was a writer not a businessman.

Then came 1958 and Ayub Khan imposed martial law in Pakistan. Ayub was advised by people like Qudratullah Shahab to expropriate Pakistan Times and other papers published by progressive Papers Ltd. After these papers were taken over by the government, Ashfauque Ahmad was appointed the editor of one of them, weekly Lail-o-Nahar. Before him the magazine was edited by Syed Sibte Hasan.

I first saw Ashfaque Ahmad in Government College, Lahore, in early 1950s. I was a first year student there while Ashfaque Ahmad was in his final year of masters in Urdu. He was a handsome person with a fair complexion, brownish mustaches and a thick crop of hair on hi head.

But he was a famous man even then. His juniors, including I, used to watch him with awe and envy. We were impressed with him because of his proximity to our teachers like Sufi Tabassum, Dr. Sadiq, Safdar Mir, G M Asar and others.

Besides these famous teachers, Government College of those days had many students who were budding writers and who in later hears made a name for themselves. But Ashfaque Ahmad, despite his friendly nature was more at home with his Pak Tea House buddies than he was with his college fellows. That was the period when Manto had written a number of masterpieces on the subject of partition as did many other senior writers like Ahmad Nadim Qasmi, Krishan Chandar and Rajindar Shing Bedi. It was in those heady days that a story entitled Gadarya (The Shepherd) created ripples in the literary circles. The story was written by Ashfaque Ahmad and soon his name became known throughout the subcontinent. Somewhat autobiographical it was a story of a Hindu school master who tutored Ashfaque Ahmad. The mas was the model of a devoted teacher. An enlightened man, the old teacher called Dao Ji had as much knowledge of Arabic and Persian and for that matter Islam as many Muslims would not have. That is why when a Muslim mob encircled him and asked him to recite Kalima he shot back "which Kalima?" because he knew all the Kalimas. Gadarya was a moving description of the state of mind of human beings affected by the mutual hatred between different religious factions. This story catapulted Ashfaque Ahmad to the level of one of great short story writers of the subcontinent.

The story of a dastaange

By Dr. Afzal Mirza

In olden days when the written word was not much in vogue, there used to be people who would narrate stories in nightly gatherings wee hours. The audience would sit totally absorbed in their tales of love, harted, debauchery and chivalrous adventures. Had Ashfaque Ahmad lived during those days, he would be surely one of the top storytellers of his time. He would enthrall his audiences in the street of Peshawar, Lahore or Delhi. Or he might have lived and died in Garh Muktasir – a small town of Ferozepur district – unsung and unheard of.

Bron in Garh Muktasir, Ashfaque came to Lahore during the upheaval of partition with many other people of his ilk. After setting down, they started holding gatherings in Lahore's Pak Tea House. They came from all parts of India. A Hamid – a contemporary and a close friend of Ashfaque Ahmad – in his writings drew beautiful picture of those days.

Among them were Ashfaque Ahmad, Ibne Insha, Sahir Ludhianvi, Zaheer Kashmiri, Safdar Mir, Ahmad Rahi, Intizar Husain, Hameed Akhtar and many younger writers who later became famous in Pakistan's literary circles. Initially they exchanged their experiences of partition because all of them had towade through rivers of blood and fire to reach their adopted homes in Lahore. Soon they started putting down their feelings.

Many of them joined radical movement called progressive writers Association. Some others were more interested in keeping an independent stance. Ashfaque Ahmad, though close to progressive writers, did not join the movement and followed Manto, Intizar Husain and other in remaining independent of any associational identity.

Gadariya is a story which may be found imbibing in itself the true spirit of IndoMuslim culture. Its central character, Daoji, may well be seen as born out of an amalgam of our mystic tradition and the Bhakti movement. Thus, this character occupies a distinct position in the array of memorable characters in Urdu fiction.

One may ask how far this interpretation of story tallies with the thinking of Ashfaque as expressed in his later years. The question may appear pertinent. But is a writer under the obligation to remain in his thinking constantly in tune with the thought expressed in his creative moment? That was with him a moment of truth creatively captured in the form of a poem or a piece of fiction. After being transformed into a poem or a story it attains an independent status. The writer, too, is under no obligation to remain tied to what has been said there.

The DAWN Lahore

Sept. 19,2004

to have discovered in the course of his quest for wisdom. Gen Ziaul Haq developed a flair for this wisdom and in consequence an admiration for Ashfaque's intellectual abilities.

With the exit of Ziaul Haq, something unexpected happened in the media. The People's Party entered the corridors of power with its own crowd of intellectuals, which flooded the media.

Disgusted with this situation, Ashfaque now thought of his first love. He announced his return to short story writing. In the literary circles, we all welcomed it as the return of the prodigal son of Urdu short-story.

But the monopoly of the PPP intellectuals in the media was short-lived. With a change of regime their fate in the media was sealed. PTV and the Radio Pakistan could no longer afford to ignore the media talent that Ashfaque was. He once again found him self busy in the media. However, he kept his promise to a certain extent. He did find time to write stories though in a sporadic way. But he was no more the Ashfaque Ahmad of the '50s, who had written Gadariya.

If Ashfaque devoted to his story writing only a short period spending his long writing years elsewhere, it is not something unusual. What counts more in literature is the worth of the things written rather than the quality of the written material and the long years devoted to writing. We have instances of writers, who wrote only for a brief period and then said goodbye to writing, spending the rest of their years in doing something else. They had the spark of achieving in a brief period what so many other failed to achieve in spite of devoting long years to writing. Ashfaque had that kind of spark. He wrote stories for a brief period as compared to the long years he spent in writing for the media. But during that brief period, he speedily wrote a few fine stories and succeeded in producing a masterpiece like Gadariya, where his art of story writing found its culmination and ensured his place in the history of Urdu fiction.

A versatile Storyteller

By Intizar Hussain

ASHFAQUE Ahmad was an ambitious man not content to be known as a writer alone. And his ambition did not remain unfulfilled. He undoubtedly was more than a writer. But as a writer, too, he had a versatility, which helped him shine in fields other than literature. I was however, intrigued by the glowing tributes paid to him on different TV channels. They were all praise for his achievements in the field of the electronic media. It came only as a afterthought to them that the man was also story writer, so some compliments should be paid to him on that account, too. But these appeared faltering as they were not sufficiently acquainted with Ashfaque, the stoy writer. That shows how a writer's excessive involvement in the media eclipses his real work.

Ashfaque had started as a short story writer. He rose to prominence just after the partition and earned praise for his promising short stories. His first collection, *Aik muhabbat sau afsanay*, appeared in 1951, (A few years later in 1957) his second collection made its appearance under the title, *Ujlay Phool*. And that seemed to him enough. His versatile talent did not allow him to remain tied to the short story for long. His radio programme, Talqeen Shah proved to be a super-hit. For so many years he remained busy, happy with the popularity and the fame it had brought in its wake.

With the advent of TV in Pakistan, he discovered for himself a new field to show his talent that brought for him success and a new wave of popularity. Soon, he found his voice reaching the corridors of power. Ashfaque had the unique ability to couch wisdom in catching phrases; wisdom he had gathered from the study of mystics and those Babas he claimed

follow. Adopting social issues for his plays, he performed the role of a reformer as well. Never shy of offering advice to others, especially to the younger lot, he was a guide to a host of writers during his lifetime.

So far as the other function that evening is concerned, it attracted only limited number of people Karamat Bukhari and a few other regulars of the Adab Serai were there but many more were missing. I was particulary surprised to find the editor of the Shohar-i-Namdar, the 'always present' Shaista Hasan, missing that evening.

After a fateha for Ashfaque Ahmad and review of some new publication, the usual round of poetic recitals started. Karamat Bukhari came up with a ghazal with a difficult rhyming scheme.

The DAWN Lahore

Sept. 18, 2004

Tributes for Ashfaque Ahmad

By Ashfaque Naqvi

It was a thinly attended meeting of the Adab Serai this time mostly because the local chapter of the Pakistan Academy of Letters (PAL) had arranged a condolence reference for Ashfaque Ahmad the same afternoon. Althogh the given time of the two function showed a gap of almost two hours, people are averse to rushing from one venue to the other, especially when punctuality is something unknown in the country. The PAL had collaborated with the management of the Quaid-i-Azam Library and arranged the reference in its lecture hall while the Adab Serai Had to meet quite a distance away at the Model Town residence of Shahnaz Muzammil.

The condolence reference was largely attended and those invited to speak on the occasion were also there, except for Intizar husain who had a leave for Islamabad and Shehzad Ahmad for reasons unknown. The rest, Farhanda Lodhi, Bushra Ijaz, Dr. Khwaja Zakariya, Dr. Anis Nagi, Azhar Javed and Asghar Nadeem Syed were very much there. So was the veteran writer-journalist, Hameed Akhtar, who was asked to occupy the presidential chair. At the same time, Swela Anees, the daughter-in-law of the late Ashfaque Ahmad was invited to be the guest of honor. Incidentally, Swela happens to be the daughter of another literary figure, Siddiqa Begum, who edits the Adab-i-Latif.

Tributes paid to the departed personality were of the usual kind – that he had a unique style, that the impressed both with the pen and by word of mouth, that he was the best story writer of his time, that his radio and TV plays were highly appreciated and so on.

However, special mention was paid to the fact that Ashfaque Ahmad was one of those seniors who provided a direction to Pakistani writers and determined a path for them to

playwright wizard. He said that Ashfaq would be remembered forever.

Bushra Ijaz believed that Ashfaq Ahmad was equally popular among literary circles and commoners.

Dr. Agha Yamin said that humanity was the sect of late Ashfaq Ahmad.

Farkhand Lodhi said that stories of Ashfaq Ahmad always feel like real ones. She said that Ashfaq Ahmad was a great philosopher.

Kh. Zakria said that soft-spoken Ashfaq Ahmad directly captured hearts of his listeners. He said that Ashfaq Ahmad always preached living of life according to the religion and had the ring of a true believer in him.

The NATION Lahore

Sept 14,2004

Ashfaq; a Diversified Philosopher, true believer

By Our Staff Reporter

LAHORE – Speakers at a condolence reference paid glowing tributes to great playwright and intellectual Ashfaq Ahmad, for his distinctive achievements in literature and knowledge imparted to fellow men of letters and commoner alike.

They brought to light the hidden aspects of the diversified and much splendered personality of late Ashfaq Ahmad.

The condolence reference presided by Hammed Akhtar, was held at Quaid-i-Azam Library on Monday.

Swela Anis, daughter-in-law of Ashfaq Ahmad, was especially invited for the occasion. Qazi Javaid anchored the entire function.

Hameed Akhtar said that Ashfaq Ahmad was a born storyteller who had the qualities to hold listeners spellbound. He said that Ashfaq Ahmad effectively conveyed his philosophy through his plays, short stories, travelogues and dialogues with public.

Asghar Nadeem Syed said that he enjoyed the privilage to be a pupil of great Ashfaq Ahmad. He conceded that it was really difficult to speak on a diversified personality like that of Ashfaque Ahmad. He said that the late writer always believed in self-help. He revealed that Indian singer Hans Raj Hans, whonever saw the great playwright in person, was a great admirer of Ashfaq Ahmad.

Dr. Anis Nagi said that Ashfaq Ahmad has unmatched talent of writing, which was spoiled by social life of the late

Ashfaque Ahmad

By Umer Mumtaz

Renowned writer, intellectual and broadcaster Ashfaque Ahmad was born on August 22, 1925, in the Ferozepure district of India and authored some 20 books. He was a great social reformer of his age and torchbearer in highlighting social issues.

As a short-story writer and playwright, Ashfaque Ahmad was a naturalist who loved romances and nature. His short stories reveal that there is much more to life than misery and woe; there is beauty and loveliness, which can be best, appreciated when viewed against the background of natural scenery. His short story, Gadaria (Shepherd), brought him fame as great short-story writer. He blended romanticisms with realism in his early works. He wrote, produced and acted in a popular weekly radio feature, Talqeen Shah, for more than quarter of a century an became an icon in Pakistan's broadcasting history.

Ashfaque Ahmad's contribution to television drama ranges from Eik Muhabbat So Afsane, one of the most popular series of Pakistan Television in the early 70s, to Tota Kahani in the 80s. He turned to religion in his later writings.

We miss a great spiritual reformer, short-story writer and playwright.

The NEWS Lahore

Sept 13,2004

The latter two riles may not receive all round commendation but his contribution to the electronic media, particularly to television as a playwright, will be described as a distinguished chapter in the history of the medium in Pakistan

The DAWN Lahore

Sept 12,2004

personalities, legend and folklore, and that captivated a segment of viewers.

There can be no disagreement that he had the gift of eloquence, full command over his subject, a vast and expressive range of vocabulary and speaking with conviction. The faith in the viewpoint he projected was unshakable. He had developed theories about the negative influence of the West on the East, specifically on Muslim culture through a flamboyant lifestyle.

He strongly felt that there would be no redemption and no revival of the lost glory of Islam unless the people practiced their original faith, imbibed a simple lifestyle and revived abandoned values. He talked with innocence- based folksy wisdom and often asked questions that could not be answered even thought the examples he posed had scant relevance and meaning to present-day compulsions.

There can also disagreement about his views on life and his approach towards resolving issues. One may even have doubts about his brand of conservatism, but there can be no two opinions regarding his status as a playwright for the electronic media, particularly television.

While his contribution as a role model for writers has never been discussed, let alone evaluated, one is certain that he inspired many young writers and influenced them to turn to television as their medium. The writings of some relatively younger playwrights of Lahore carry clear imprints of Ashfaque's influence.

He was not only one of the first writers, but the very first major writer to assimilate the possibilities of the new medium of television and adjust his talent for using the medium initially as a vehicle to entertain people, to enlighten them as per his own sights and finally to try to bring them round to his way of thinking.

short stories and Hairart Kada, another series that dealt with the unpredictability of life and the vagaries of fate and fortune, injecting a measure of the supernatural in some episodes and a touch of wonderment to its overall content.

Two producers, Nisar Hussain Mir who produced Punjabi serials and Mohammad Nisar Hussain, substantially enhanced Ashfaques stature as playwright in Aik Mohabbat , Hairat Kada and then teleplays. Their contribution towards emphasizing the dramatic impact of the plays was significant and added a dimension of technological craft to Ashfaque's intellectual range. Neither of them is with us anymore.

In the meantime, a metamorphosis seems to have taken place in of religiosity and Sufism that were present in his earliest short stories sprouted in Hairat Kada but without impairing his strength as an absorbing and exciting storyteller. The streak became more pronounced in his next two series, Aur Dramay and Tota Kahani. But it left many viewers into a world of romance, curiosity, disbelief and enlightenment with images of innocence and simplicity, had sifted to the pulpit.

The monologue content of his later plays lacked dramatic content and interaction between characters, merely expressing a point of view without leaving room for debate. They hardly fitted the definition of plays attributed to Ashfaque Ahmad as a writer and intellectual, identifying him as a crusader for the revival of lost causes and bygone glories.

Apparently, he also realized this and when some of his plays were produced anew by the Indus TV network, he did not select any work from Aur Dramay and Tota Kahani, and opted for the more popular plays from Aik Mohabbat. He may have had Sufi's soul but he also had his feet filmy on the ground.

Many felt that he had become a full-time preacher, a trait that became boldly pronounced in his last work for PTV, a talk show that had him disseminating wisdom backed by religion and religious history , references to Muslim

Last of the Greatest

By Zafar Samdani

While Ashfaq Ahmad started his literary career as a of high talent and soft fragrance, the electronic media made him a household name as early as the start of the 1960s with Talqeen Shah, a bi-weekly radio programme in which the writer himself featured as the central character who took up day- to-day issues in a light, critical manner, setting the stage for his dominance over the electronic media for years to come.

Soon after, Television arrived in Pakistan and Ashfaque became on of the first writers of the country to adapt himself to the new medium with Punjabi serial titled Ucche Burj Lahore Diayn that won audiences with their simple communicative strength and down-to-earth, realistic depiction of local life.

It would not be wrong to say that his serials and Kamal Ahmad Rizivi's Alif Noon contributed significantly towards establishing television as a medium in Pakistan. They made the small screen an important social appointment in the Lahore lifestyle, television being limited to Lahore and a radius of about 30 miles at that time.

In a manner of speaking, the electronic media undermined Ashfaque Ahmad's literary career because the short-story writer receded into oblivion once he became associated with television. While literature, lost a writer of tremendous promise and moving romantic flavour, the electronic media gined a prestigious and creative writer who quickly comprehended the demands and possibilities of the medium and exploited them to the hilt with brilliant and exciting plays.

Pubjabi serials played their part, too, in training him in the technique of writing required for the mini screen. And within not time, he had mastered it and came up with the series Aik Mohabbat sau Afsanay, based on his first collection of

symbolic in a kind of higher logic that bound the loose ends on a formal framework.

'Tlisme Hosh Afza', a latter work by Ashfaq Ahmad, pointed to the number of contradictions that have started to dominate and control our lives and some of these contradiction were so glaring that they created a bizarre situation in society where things have started to appear more unreal than before.

'Tlisme Hosh Afza', may have been a take-off on one of the classics which was based on pure fantasy. Much that takes place in the romance is beyond the understanding of the reader but it is bound by a higher logic. In this book of short stories it seems that the world of fiction has moved away from realism into fantasy, where the interaction between the characters and action is not rational – it is inexplicable but at the end there never is any higher logic to save the nexus from falling to pieces.

Ashfaque Ahmad had already established himself as a writer of treatment—it was television that gave him the fame and popularity that he attended more to teleplays because of its greater outreach in a society – where the literacy rate is rather low. But he was lost as a writer. His fiction was tending to become more and more obscurantist in nature and he seemed to be relying on divine intervention to lay bare the secretes of this world. He almost left writing, seeking for minor miracles in people who appear common and ordinary – the image of a man seeking salvation that last television talk show had helped in curating.

The NEWS Lahore

Sept 12,2004

take matters in his own hand in forcing an outcome rather than waiting for the end to come about by the potency of its own circumstance.

And he became the dominating figure, directing the affairs of both men and women with the certainty of a god. The free growth of experience was checked on the scale of righteous behaviour and often found wanting. The ultimate recourse was moralising and lecturing on how things ought to be rather than an account of how things are. It was an inversion of the 'Gadarya', who did not ruminate on the outcome of experience but rather forced an outcome. Ashfaq Ahmad emerged as a great moraliser, a lesser writer.

All this change was necessarily seen against the backdrop of a regime keen on spreading a message that was quite obscurantist in nature. Ashfaq Ahmad fell into the fatal trap, which should be avoided at all cost by the writers. He was seen to be towing the line of those in power. His credibility was greatly dented as he went on to enjoy the status of an official ideologue.

Since the faith in science has receded into the shades of the moral question- of its application in technology as well as the tumble the socialistic utopia has taken – a literary expression has been in search of a new 'ism'. Writers in Latin America had devised a new way of expressing reality or unreality of their surroundings. Popularly known as magical realism, it lacked that solidity that characterised the viewpoint of the writers of the last 200 years. The objective reality having lost the bedrock, on which it stood, controlled and regulated the affairs of the world as everything seemed to be reduced to a pulp from where it was difficult to raise any solid foundation. It seemed closer to be the form of our traditional literary genre of the dastaan where the movement in the plot was not attributable strictly to logic.

Strange happenings often had to be understood in the multi-layered meaning contained in the mythological and

have been branded thus by the critics for his recreation of society was both ruthless and unforgiving as he was able to lay his fingers on the causes that bedeviled society with certainty.

Ashfaq Ahmad's 'Gadarya' was not exactly in the mould of the medieval dastaans but rather followed the form of the biblical tales. Its setting was rural and its wisdom was drawn from a simple way of living, a wandering life of a shepherd, rich in weaved pattern of simple practical living not devoid of vision. It was in a manner a manifesto of the new state Pakistan that was to draw upon the rich reservoirs of ancient biblical wisdom.

His next creative effort 'Aik Muhabbat Sau Afsanay' was stories about the very day existence of men and women as they live in the urban and rural areas of the country. The writings were brilliant as they captured the dreams and heart burns of ordinary people. Here, unlike 'Gadarya', there was no vision, only the experiences were laced with romance. The hope that no longer rested in a grand vision but in the everyday affairs of the ordinary common people that made up the country.

This same lacing of romance with common experiences mad Ashfaq Ahmad such a successful writer on radio and television. His radio talk show 'Talqeen Shah' was a mixture of humour with the steadfastness that grows out of being faithful to an ideal. The ideal in this case was the country against which all designs of the enemy were to be foiled. His first teleplay, Tahli Thalle' again harboured the ethos of 'Gadarya' though it was based on the episodes of individuals.

Then in the middle years he lost that innocence, that faith that grew out of the experience of the ordinary man. He was no longer content to be a 'Gadarya', Happy in wandering, tending to his flock while ruminating with a certain detachment on the affairs of the world. It was a new Ashfaq Ahmad who was becoming impatient with the sameness of things, the romance of which was wearing thin, and who had decided to

Gadarya and other story

By Sarwat Ali

If Deputy Nazir Ahmad and Rattan Nath Sarshaar are taken to be the pioneers of Urdu fiction and afsana nigaars sympathetic to the Progressive Writers Association considered the second generation of fiction writers, then Ashfaq Ahmad easily qualifies to be one of the outstanding short story writers of the third generation.

As a leading writer to have emerged since the creation of this country, he was quite versatile in the number of forms that he chose for his creative expression. In the beginning, like most of his contemporaries, he was drawn into the formalistic measures of realism, with some of his early stories establishing him as a writer of great merit in that tradition.

Our classics were hardly written in the realistic mode. In fact none was, and it was only in the 19th century that realism crept into our literature through colonial influence. Gradually as the colonial influence increased, the dastaans and mythological tales changed into the format of the short story and the novel. It became an article of faith with the authentication of the Progressive Writers Movement. Some of the most outstanding work emerged in that golden period of prose in Urdu which can be attributed to the mixture of the local reality with a vision imbibed from the more industrialised societies.

It was the rise of a scientific outlook that promoted a way of assessing reality – and expressing it realistically too. The early response to this new faith was so overwhelming that a close study of objective reality was considered enough for literary expression. The trend popularly known as Naturalism was in a way reductionist. But it stayed center stage and some of the best works of fiction in the 19th century were written under the influence. Emile Zola, probably the finest writer to

of folk wisdom whose advice was more effective than that of the learned people of the country. He used to say that these learned people had damaged the country. He strongly advocated the fact that true wisdom could be sought from people working as cobblers, street vendors and dhobis."

--Dr. Saleem Akhter

The NEWS Lahore.

Sept 12,2004

--Intezar Hussein

"Ashfaq Ahmad has played a comprehensive innings of life and excelled in every field that he selected whether it be writing or contributing to the field of electronic media. His works are highly popular among the masses who had been the focus of his work. Ashfaq Ahmad proved that if real life problems of the masses are discussed at length and their remedies suggested, there is no way that such work will go unnoticed. Apart from being a thorough professional, he was a great person whose compassions were not only confined to his generation but for the young as well. He belonged to the club of the likes of Ibn-e-Insha, Qudratullah Shahab, Ahmad Bashir and Jamil-ud-Din Aali whose main concern was to win more and more friends. His popularity among the masses was obvious from the number of mourners at his funeral."

--Munnoo Bhai

"Ashfaq Ahmad's death has left a huge void in literature as well as electronic media and will be difficult fill. He had a multi-dimensional personality, a manifestation of which was evident in every field he chose to enter into. It was a distinction for him that his short story 'Gadarya' was declared a classic in his life time – an acknowledgement enjoyed by very few people in the field of literature. As far as I have understood him, he was a born story-teller, always trying to pass on meaningful messages to the audience. Very few people know that Ashfaq Ahmad had a deep interest in science fiction, parapsychology and occult sciences. He used to discuss these disciplines with me for hours without losing interest. Though critics laud his literary works – Aik Muhabbat So Afsaanay, Man Chalay Ka Soda and Tota Kahani – I believe the television serial Hairat Kadah was his best work and still haunts me. The characters in this serial were created under a strong influence of occult sciences on Ashfaq Ahmad's writing. Among many other, the character of Baba created by Ashfaq Ahmad is hard to forget. For him, Baba was a symbol

Contemporary thoughts

By Shahzada Irfan Ahmad

"Ashfaq Ahmad was not only a contemporary of mine but a close friend and relative from my mother's side as well. He wrote the preface for some of my early works including my collection of Punjabi poems Safar Di Raat. I think his death has been an irreparable loss to the literary world and will leave a void very hard to fill. As far as his literary works are concerned, I place him among the best of the short story writers of all times. However, with the passage of time he diverted his energies towards activities that were financially better paying. These included his hosting of a show on radio and writing for television, which were highly popular among the masses, but in my opinion comparatively less valuable than what he was doing earlier. The day he died, his wife Qudsia Bano called me up and I went to see him. It appeared as if he was getting better. I came back home only to be told a few minutes later that he had expired. That was one of the longest nights of my life."

---Muneer Niazi

Intezar Hussain

"He was a person with an unending desire to achieve whatever he could in his life. Though highly rated as a legendary storywriter, I found him to be a person who could not confine himself within the prescribed limits and tried his luck with different forms of literature. He started from writing and then joined radio and after that television. When he joined radio, we thought he was a radio talent and had been wasting energies elsewhere. And similar were his feelings when he appeared on television. In short, he left his mark in every field that he tried his hand at in his lifetime. As a human being, I found him to be a loving person, a true gentleman and an unmatchable contemporary who was very polite. Ashfaq never lost his temper, even if others pushed him to the wall."

book Jahane Javed first to Ashfaq Ahmad but his wish could not be fulfilled.

Mustanser Hussain Tarrar said that Ashfaq Ahmad was an unmatched writer, adding that, to him he is not gone rather Ashfaq Ahmad is present with him all the time in the form of his writings which to him are living.

The NATION Lahore

Sept 10,2004

Qul of Ashfaq Ahmad held

By HASSAN JAVED

LAHORE – Amidst tears and grief, Qul of Ashfaq Ahmad, a legendary playwright and intellectual, was held at 5pm at Football Ground, Model Town here on Thursday. Scorse of people including many notables offered Quran Khuwani and Dua that may Allah Almighty rest the departed soul in eternal peace.

Notables including Justice (R) Dr. Javed Iqbal, Asghar Nadeem Syed, AG Josh, Amjad Islam Amjad, Syed Farooq Madoodi, Usman Pirzada, Faizan Pirzada, Riaz-ur-Rehman Sagar, Hafiz Ullah Niazi, Mustansar Hussain, Intizar Hussain Tarrar, Bushra Rehman, Fatima Ghazal, Justice Nisar, Justic Malik Sajjad Sipra, Tariq Aziz, Billal Sofi, Bast Khan, Babbu Baral, Noor-ul-Hassan, Sheikh Manzoor Elahi, Dr. Amjad Pervaiz, Dr. Jawad, Dr. Maskeen Hijazi, cricketer Fazal Mehmood, Jehangir Badr, Afzal Rehan, Javed Tariq and other were peresent on the occasion. Pakistan Academy of Letters in collaboration with Quaid-e-Azam Library will arrange a condolence Reference at Quaid-e-Azam Libaray.

Mr Anees, the eldest son of late Ashfaq Ahmad, said that his father, in his last days, was suffering from unbearable pain but he never let his feeling reveal on other. He said that Ashfaq Ahmad could not swallow any thing due to his pain but when somebody offered him any thing he did not refuse as it could hurt others feelings. As a father, he said he was an institution and I learnt practically from him.

Justice (R) Dr. Javed Iqbal said that he was s Sufi and now no one like him will be born in the centuries to come. He said that he stood on a higher pedestal of humanity as he loved the creation of God and remained a humble person throughout his life. He regretted that he wanted to present his upcoming

Ashfaque Ahmad

(Editorial)

The death of Ashfaque Ahmad deprives the country and the Urdu-speaking world of distinguished short story writer and broadcaster. As a writer, he showed that one could be satirical without being overly malicious; as a broadcaster, he had a rustic intuition that enabled him talk to the people of the countryside in their own idiom. Although he was not particularly enamored of progressive trend in modern Urdu writing, he kept an open mind, delved deeply and voraciously into the literature of all languages and largely kept himself away from controversy. His story, Gadaria, must rank as one of the finest pieces of its genre in recent times. It showed how the spiritual strain among the various religious communities in the subcontinent had created a unifying bond between the. The 1965 conflict unleashed a wave of emotionalism on both sides of the border, and Ashfaque Ahmad could not remain unmoved by the upsurge; this inevitably brought him close to the establishment, as it did many other writers. In Lahore, he and his wife, Bano Qudsia, had become almost an institution and occupied a special place of esteem among writers both old and young. Television provided them with a new channel of creativity, and they had revived the "Baithak" tradition, talking to the youth in small gatherings and instructing them in the mores of a civilized Muslim society. Ashfaque Ahmad was one of the dwindling ranks of senior writers who, whichever side of the political or literary divide they chose, have contributed to literature and culture.

The DAWN Lahore

Sept. 9,2004

Ashfaq Ahmad

(Editorial)

Literature seldom engages editorial columns of newspapers these days. But when a writer like Ashfaque Ahmad dies, some of the space from politics must be cut out to make room for those whose writings remain fresh for a much longer time. To say that he was a renowned national writer, a rare playwright who created the character of Talqeen Shah, and an intellectual with a suave disposition, would only be repeating the obvious.

A subtle sense of humour, both in his writings and plays on radio and television, and in his talk show, endured him to his audience. His belief in Sufism brought a soft-spoken person that even endeared him to his detractor. For he hardly ever replied bitterly to any criticism levelled by his critics.

Ashfaq Ahmad wrote 20 books, comprising mainly novels, short stories and plays. His short story Gadarya (The Shepherd) received much acclaim.

Born in Muskar in Ferozepur he migrated to Pakistan at the time of partition and made Lahore his home. He did his masters in Urdu from Government College. He taught at Dayal Singh College, and later worked at Radio Rome in Italy. During his stay there, he also taught Urdu at a university.

He has left his wife Bano Qudsia, herself a renowned writer and three sons, besides countless admirers to mourn him.

The NEWS Sept 9,2004

Governor, CM condole Ashfaque's Death

LAHORE, Sept 7: Punjab Governor Khalid Maqbool has expressed his deep sense of grief and sorrow over the death of eminent intellectual, writer and broadcaster Ashfaque Ahmad Khan.

In a condolence message to Ashfaque Ahmad's wife, Bano Qudsia, and other family members, the governor stated that in his death the country has lost an eminent literary and intellectual figure who enjoyed a unique position among his contemporaries due to his universal message of affection for humanity.

He prayed that may Allah rest the departed soul in eternal peace and grant courage to the members of the bereaved family to bear this irreparable loss with fortitude.

PERVAIZ ELAHI: Chif Minister Pervaiz Elahi, in a statement issued here on Tuesday, paid rich tributes to the late Ashfaque Ahmad and said an intellectual of his caliber was a rare literary asset for the country.

SHUJAAT HUSAIN: Pakistan Muslim League President Chaudhry Shujaat Husain has expressed sorrow over the death of Ashfaque Ahmad.

In a letter to Bano Qudsia, he observed that the late Ashfaque Ahmad was a simple and affectionate person who, throughout his life, worked for the betterment of humanity.— APP/PPI

The DAWN Lahore

Sept 9,2004

CM visits Ashfaque's family

By Our Staff Reporter

LAHORE, Sept 8: Chief Minister Pervaiz Elahi visited on Wednesday the residence of playwright and intellectual Ashfaque Ahmad to offer condolence.

He expressed his condolences with Ashfaque Ahmad's wife Bano Qudsia and sons Anis Ahmad and Asir Ahmad terming the death of the writer a national loss.

The chief minister said the late Ashfaque Ahmad was a trend setter who rendered commendable services for the promotion of knowledge and literature.

He said the late Ashfaque Ahmad had an impressive personality and provided invaluable guidance and cooperation in the establishment of the Institute of Punjabi Language and Culture.

The chief minister said the late Ashfaque Ahmad always gave a bold and realistic advice to the government on matters referred to him for the purpose.

He also offered fateha for the departed soul.

QUL: Qul of playwright and intellectual Ashfaque Ahmad will be held at his residence at 121 C-Block Model Town at 5pm on Thursday.

He died here on Tuesday after protracted illness.

The DAWN Lahore

Sept. 9,2004

Talqeen Shah falls silent

By HASSAN JAVED

LAHORE- Renowned writer, playwright and intellectual Ashfaq Ahmad commonly known as Talqeen Shah breathed his last on Tuesday morning after a protracted illness. He was 80. The celebrated literary figure was suffering from cancer and was under treatment at a private hospital for quite some time. Ashfaq Ahmad was very popular among the masses as Talqeen Shah, an immortal character, which put on different masks of evil in the society and won great accolades from his audience especially on Radio Pakistan.

His decades-long contributions for radio and TV are beyond any measures and would be remembered in literary circles. Ashfaq Ahmad shot to fame as a literary figure in his early age and then joined electronic media right from the time it was launched in Pakistan.

Ashfaq Ahmad's condition deteriorated on Tuesday morning. He was being taken to the hospital around 8 am but died on his way before he could be given medical aid.

He is survived by a widow and three sone- Anees, Asheer and Aneek, who left for America few hours before his death.

The news of Ashfaq Ahmad's death spread like jungle fire in the city.

His admirers, family friends, literary, social, religious and political figures gathered at his residence to offer condolence.

The NATION Lahore

Sept. 8,2004

masses around him. He had a deep insight and he inked all these things, which became a part of permanent literature. His writing became immortal and through he is no more with us but he would be remembered for long time.

The NEWS Lahore

Sept 8, 2004

Z.A. Nizami the Chancellor of Sir Syed University of Engineering and Technology said that Ashfaq Ahmad had dwelt upon political acumen, economic inequalities and social disorder better than any socialist and economist.

Tahir Masood, Chairman Faculty of Mass Communication, said that said that Ashfaq Ahmad became famous with his short story "Gadariya". Later his popularity further increased with his PTV series "Aik Mohabbat So Afanay". He became controversial personality during the Zia era. He was initially a romantic storywriter. He developed interest in mysticism and started giving lectures on PTV about mysticism. He was great expert in conversation. Lahore had provduced four men of literature, Intizar Hussain, Munir Niazi, Ahmad Nadeem Qasimi and Ashfaq Ahmad who raised the status of Urdu literature in the subcontinent. Ashfaq Ahmad lived a like of hopes and aspirations and left the footprints for other to follow. Ashfaq Ahmad never disappointed. He had great hopes with the country leadership Qauid-eAzam Mohammad Ali Jinnah and Allama Iqbal were his ideals. Ashfaq Ahmad was greatly influenced by his contemporaries and always admitted that his wife Bano Qudsia was his guide, teacher and espouses.

Sarwer Javed an imminent critique, poet and story writer said that Ashfaq Ahmad was a versatile genius. He had grip over many subjects. His domain was not limited to one area but he had diversified in many fields like research, mysticism, literature, heritage, human psychology, and drama writing.

Rashid Noor a senior poet and renowned journalist of Karachi said that Ashfaq Ahmad has made his place in the literary world as an institution and he was legend of his time. Not only he wrote for the present but also set a direction for the academicians' and the educationists. He wrote for the common man in common language. The coming generations would bear the fruit of his contributions. He gave a new exposure to the

his age and was regarded and respected for his intellectuality and his death is great national loss. The president of the Old Ravians Union and Inspector general of Punjab Police Mr. Saadat Ullah Khan and members of the union have also grieved over this sudden demise of the great writer, scholar, playwright, columnist and intellectual.

Punjab Chief Minister, Ch. Pervaiz Elahi described the death of renowned intellectual, writer and broadcaster, Ashfaq Ahmad Khan as a national loss and said that late Ashfaq Ahmad was a precious intellectual and literary asset, which any society can be proud of.

Our Karachi correspondent adds

Sajjad Mir, the Resident Editor Nawa-i-Waqt Karachi has said that Ashfaq Ahmad was indigenous wisdom. He searched the answers of his soul from the soil of Pakistan. He was a storyteller of magnitude who talked of wisdom in his own dialect. He never accepted western impression, he concluded.

Jamiluddin Aali said that there is no field in Urdu literature, which Ashfaq Ahmad did not touch. He was creative writer, loving person and simple personality. I have got many shocks during my this long 84 years of life but he death of Ashfaq Ahmad is unbearable for me. Throughout my association with him, he gave me spirit, which I always enjoyed.

Aslam Farrukhi, a critic and a researcher said that many people no Ashfaq Ahmad has a storyteller but he was a creator, a researcher, and investigators of human life. Jamal Panipati, sait that I can say with great confidence that he had no parallel in fiction writing. Firdous Haider, expressing his views said that Ashfaq works are immortal and never to perish. Every body sought guidance from him, which he always encouraged. Naqash Kazmi said that at many a time we got the benefit of his intellect.

stature and dignity. Personality like him is born once in a century.

Prof. Dr. Rafique Ahmad, former Vice Chancellor Punjab University, said that Ashfaq Ahmad served as a beacon of light not only for the common people but the intellectiuals and scholars who should follow his foot steps. Dr. Khalid Aftab, vice chancellor GCU, said that Prof. Ashfaq was a great teacher, learned scholar, having rare intellect with which he impressed his generation and the generation to come.

The president of the Old Ravians Union and Inspector General of Punjab Police Mr. Saadat Ullah Khan grieved over this sudden demise of the great writer, scholar, playwright, columnist and intellectual. Programme Manager Radio Lahore Jamil Malik said that Ashfaq Ahmad was an articulate communicator who could convice anyone with his powers of pursuation.

Hameed Akhtar said that Ashfaq Ahmad has a very pleasant personality and his "Gaderya" created waves in literature. He said that he was a lovable person who won the love of people by virtue of his character. Riaz Mehmood, a broadcaster, said that he was a philanthropist of such high caliber who brought up his servants like his children and now they work at higher designations and have great respect in the society. Nazeer Husaini, who played the role of Hadayat Ullah, a symbol of virtue in talqeen Shah, said that Ashfaq Ahmad was spiritual figure who could see through one's personality.

Governor Punjab Khalid Maqbool also offered Namaz-e-Jinaza and expressed grief over the sad demise of the great spiritual personality. He said that the demise of Ashfaq Ahmad would prove a blow to lirature and creative work. He said that Ashfaq Ahmad had left a vacuum which would not be filled by someone else.

Prof. Haji Muhammad Sharif said that great scholar like Ashfaq Ahmad are great national asset. He was great scholar of

Indigenous wisdom

By Hassan Javed

Ashfaq Ahmed was a legend in his time. His personality was versatile, his writings diversified and his thoughts were philosophical with that human touch because of which every one thought that what Ashfaq Ahmad had said was a reflection of life. The entire literary circle was shocked on the demise of the great writer and critic. Ashfaq Ahmad played a key role in the development of drama, Teleplays, which made PTV a unique channel. His dramas like "Aik Mohabbat So Afsany", and "Gadarya" were appreciated throughout the sub-continent. Ashfaq Ahmad was not only a man of literature but was a reformist, his programme on Radio Pakistan Telqeen Shah, had great reforming impact on the lives of the people.

Speaking on his demise Amjad Islam Amjad said that only a few people represent literary scene of Pakistan and Ashfaque Ahmad was one of them and his demise proved a strong blow to Pakistan's literature. He said that another aspect of Ashfaq Ahmad's personality was that he preached Islam in totality which also carries an aspect of metaphysics that directly deals with one's soul. He said that Ashfaque Ahmad's personality is a role model for him as he learnt a great deal from him. He said that his writings highlighted the life of a middle class person.

Asghar Nadeem Syed said that he was a man of letters as scientific knowledge, regional literature, foreign literature, spiritualism and art originated from his personality. He said that he has left a rich heritage of knowledge and widom.

Munno Bhai said that Ashfaque Ahmad was the pioneer of the electronic media in Pakistan. Ashfaque put in his all energies to produce quality literature in Urdu fiction. Ajmal Niazi said that he was an erudite personality and man of great

In the Zia period, Mr. Naqvi said, he wrote plays for television with a religious bias. "In the later period of his life, he was largely inclined towards Sufism and became a mystic."

Recounting his meeting with Ashfaque Ahmad a few days ago, he said: "He talked mostly about Sufism. He believed that anyone even a bureaucrat, could be a sufi. Anyone could give you a direction".

CONDOLENCE: President Gen Pervaz Musharraf has expressed his profound grief over the death of Mr. Ashfaque Ahmad. In a condolence message, the President recounted service rendered by the late writer for Pakistan and to literature, APP adds. He prayed to Almighty Allah to rest the departed soul in eternal peace.

The DAWN Lahore

Sept. 8,2004

learnt Italian. He also learnt French in Paris and went to New York to obtain a diploma in radio broadcasting.

Returning to Pakistan, he took out his own monthly literary magazine – Dastaango – and joined Radio Pakistan as a script writer. He was made editor of the popular Urdu weekly, Lail-o-Nahar, in place of Sufi Ghulam Mustafa Tabasum by the government of Field Marshal Gen Ayub Khan which took over the progressive Papers Limited (PPL) in the early 1962. He was later made Director General of the Markazi Urdu Board, which was later renamed as the Urdu Science Board, a post he held for 29 years.

In 1962, Ashfaque Ahmad started his popular radio programme – Talqeen Shah which made him immensely popular in the people in town and village. The programme is still being broadcast by Radio Pakistan.

His popular TV plays include Aik Muhabbat Sau Afsanay, Uchhay Burj Lahore Dey, Karvan Sarai, Tota Kahani, Lekin, Qila Kahani, Hairat Kadah and Mun Chalay Ka Sauda. He wrote about 25 books, including a travelogue.

He was a recipient of the President's Pride of Performance and Sitara-i-Imtiaz for meritorious services in the field of literature and broadcasting.

According to writer and critic Ashfaque Naqvi, Ashfaque Ahmad was regarded by many as the best Urdu short-story writer after Saadat Hasan Manto, Ismat Chughtai and Krishan Chandar following the publication of his Gaddarya. It was difficult to say whether he was a better playwright or a story writer, Mr. Naqvi told Dawn.

"He got public recognition after the started his radio programme Talqeen Shah which featured a man with double mask. This radio feature brought out hypocrisy in our society. His TV plays – Aik Muhabbat sau Afsanay – won him a large number admirers", Mr. Naqvi Said.

Noted writer
Ashfaque Ahmad passes away

By Our Staff Reporter

LAHORE, Sept 7: Noted short story writer and playwright Ashfaque Ahmad Khan died here on Tuesday morning after a protracted illness. He was 79.

He was laid to rest at the model Town graveyard later in the evening. A large number of people from all walks of life – educationists, writers, senior and junior radio and television artists, bureaucrats, military officers, and other –attended his funeral.

Ashfaque Ahmad is survived by his wife Bano Qudsia, also a short story writer novelist and playwright, and thre --- Aniq Ahmad, Anees Ahmad and Aseer Ahmad.

His eldest son, Aniq, who is settled in the United States and were here for a few days, had gone back only a few hours before his father passed away.

Doctors had diagnosed malignant cancer in his pancreas early this year and he was bed-ridden for quite a few weeks due to his illness.

Born on Aug 22, 1925, in village Garh Muksar, Ashfaque Ahmad obtained his early education in his native district, Ferozepure, East Punjab. Shortly before independence in 1947, he came to Lahore and did his M.A in Urdu from the Government College. Bano Qudsia was his classmate at the GC.

Ashfaque Ahmad, who had begun writing short stories before independence, started teaching at the Dyal Singh College after completing his MA. After couple of years, he went to Rome to join Radio Rome as an Urdu newscaster. During his stay there, he also taught Urdu at a university and

Mariam Arshad
خالد بک ڈپو
۴۰-اردو بازار لاہور
فون: 7223881-7229740